مطبوعہ

مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن

دوم　　سنہ ۱۹۴۲ء　　قیمت للعہ

فہرست مضامین

حصہ اوّل ہندوستان

مہاتما موہن داس کرم چند گاندھی	صفحہ	۷
رئیس الاحرار مولانا محمد علیؒ	صفحہ	۴۱
دیش بندھو چترنجن داس	صفحہ	۶۴
قائداعظم محمد علی جناح	صفحہ	۸۲

حصّہ دوم "چین و ایران"

مارشل چیانگ کائی شک صفحہ ۱۲۹

اعلیٰ حضرت رضا شاہ پہلوی صفحہ ۱۶۲

حصّہ سوم عراق و عرب

امیر فیصل بن حسین الہاشمی صفحہ ۲۲۲

سلطان عبدالعزیز ابن عبدالرحمٰن آل فیصل آل سعود صفحہ ۲۸۵

حصّہ چہارم مصر و مراکش

سعد پاشا زغلول صفحہ ۳۴۳

غازی محمد بن عبدالکریم الخطابی صفحہ ۳۷۷

عہدِ حاضر کے بڑے لوگ

حصّہ اوّل

ہندوستان

مہاتما موہن داس کرم چند گاندھی

اس صدی کی سیاسی تاریخ میں دو نام بہت نمایاں نظر آتے ہیں۔ ایک لینن دوسرا گاندھی!

لینن روسی انقلاب کا امام تھا اور گاندھی ہندوستان میں تحریک آزادی کا مصنف مانا جاتا ہے۔ لیکن ان دونوں میں صرف اسی حد تک مشابہت ہے کہ یہ دونوں ایک ہی زمانہ کی پیداوار ہیں۔ پست اقوام میں بیداری پیدا کرنا ان کا مشن ہے اور دورِ جدید سیاسی مذاہب کے یہ بانی ہوئے ہیں۔ ورنہ اس کے علاوہ لینن کے سوشلزم اور گاندھی ازم میں اور کسی قسم کی مماثلت نہیں۔

سوشلزم یکسر لامذہبی اور دہریت سے عبارت ہے اور گاندھی ازم کی بنیاد ہزاروں برس پہلے کی ویدک فلاسفی پر رکھی گئی ہے۔

مقاومت مجہول، گاندھی ازم کا مرکزی عقیدہ ہے۔ بلکہ اس مذہب کی ساری عمارت اسی ایک عقیدے کے بل پر کھنچی جا رہی ہے ابھی یہ عقیدہ محض تجربہ کی حد میں ہے انفرادی طور پر تو کہیں کہیں یہ کچھ کامیاب ثابت ہوا لیکن اجتماعی حیثیت سے باوجود متعدد کوششوں کے اب تک قطعاً ناکام رہا ہے۔ سیاسی بیداری البتہ اس عقیدے کے پرچار کے بعد ہندوستان میں ضرور

بڑھ گئی اور ایک جماعت ایسی پیدا ہو گئی ہے جس نے اس عقیدے کی
عملی کمزوری کے باوجود اس کو بطور سیاسی ہتھیار کے استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔

مقاومت مجہول کے مصنف مہاتما موہن داس کرم چند گاندھی ۵ اکتوبر
۱۸۶۹ء کو کاٹھیا واڑ کے ایک ساحلی شہر پور بندر میں پیدا ہوئے۔ وہاں
کے ایک بنیا خاندان سے ان کا تعلق ہے جو کاٹھیا واڑ کی دیسی ریاستوں میں
اپنی سیاسی خدمات کے باعث کافی معزز سمجھا جاتا تھا۔
اوائل عمر ہی سے گاندھی جی کو رامائن اور بھگوت گیتا کے مطالعہ کا شوق
پیدا ہو گیا اور یہ شوق ان کی والدہ اور والد نے انھیں دلایا جو بڑے کٹر
قسم کے مذہبی آدمی تھے۔ تیرہ برس کی عمر میں ان کی شادی ہوئی اور بیس
برس کی عمر میں انھوں نے انگلستان سے بیرسٹری کی سند حاصل کی اور بمبئی ہائیکورٹ
اور کاٹھیا وار کی ریاستوں میں وکالت شروع کر دی لیکن وکالت ان کی چلی
نہیں اور نہ اس پیشے میں وہ کامیاب ہو سکے۔
۱۸۹۲ء میں افریقہ کی ایک مسلم فرم عبداللہ کمپنی نے گاندھی جی کو ملازم
رکھ کر ہندوستان سے جنوبی افریقہ بلا لیا۔ جنوبی افریقہ کے شہر پرٹوریا "
کی عدالت میں عبداللہ کمپنی اور اس کمپنی کے شریک سیٹھ طیب جی میں مقدمہ
بازی ہو رہی تھی اس مقدمہ بازی میں گاندھی جی جونیر وکیل کی حیثیت میں
عبداللہ کمپنی کی طرف سے ایک برس تک پیروی کرتے رہے۔ ایک برس
بعد دونوں شرکا میں راضی نامہ ہو گیا اور اسی کے ساتھ بظاہر جنوبی آفریقہ
میں گاندھی جی کا کام بھی ختم ہو گیا لیکن اسی دوران میں جنوبی آفریقہ کی حکومت
طرف سے ایک قانون نافذ ہوا جس میں جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کا حق

رائے دہی سے محروم کر دیا گیا تھا۔ اس قانون کے نفاذ سے جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں میں جو مدت سے جنوبی افریقہ میں رنگ و نسل کے امتیاز کا شکار ہو رہے تھے ایک آگ سی لگ گئی اور انھوں نے اس کالے قانون کے خلاف مؤثر اور منظم احتجاج کی ٹھان لی۔ سیٹھ عبداللہ اور سیٹھ حاجی محمد کی کوششوں سے متعدد احتجاجی جلسے ہوئے اور "نا ٹال انڈین کانگرس" کے نام سے اس "کالے قانون" کا مقابلہ کرنے کے لئے ہندوستانیوں کی ایک جماعت بنائی گئی جس میں مسلمانوں کی اکثریت تھی اور جماعت کے سکریٹری گاندھی جی منتخب ہوئے۔ عملی سیاست میں گاندھی جی کا یہ ابتدائی قدم تھا جس کے بعد ہندوستان واپس آنے کا خیال کچھ دنوں کے لئے ملتوی کر کے گاندھی جی جنوبی افریقہ ہی میں رہ پڑے۔

سنہ ۱۸۹۳ء سے سنہ ۱۹۱۴ء تک گاندھی جی جنوبی افریقہ میں رہے اور اسی بیس برس کے عرصہ میں وہ نیا سیاسی مذہب عالم وجود میں آیا جسے گاندھی ازم کہا جاتا ہے۔

سنہ ۱۸۹۹ء میں حکومت برطانیہ اور افریقہ کے ایک قبیلہ کے درمیان جنگ شروع ہوئی۔ اس جنگ میں گاندھی جی نے برطانیہ کا ساتھ دیا گیارہ سو ہندوستانیوں کا ایک طبی دستہ بنایا اور زخمیوں کی طبی امداد کا نہایت سرگرمی سے اہتمام کیا اس جنگ میں برطانیہ کا ساتھ دینے کے متعلق گاندھی جی کی دلیل یہ تھی کہ جنوبی افریقہ کے ہندوستانی برطانی رعایا ہیں اور چاہتے ہیں کہ انھیں برطانی رعایا کے پورے پورے حقوق حاصل ہوں اس لئے یہ ان کا فرض ہے کہ اس جنگ میں برطانیہ کا ساتھ دے کر اپنے آپ کو ان حقوق کا اہل ثابت کریں"!

اس واقعہ کے بعد جنوبی افریقہ کے یوروپیوں اور ہندوستانیوں کی نظر گاندھی جی پر پڑنی شروع ہوئی اور انھیں اپنے جدید سیاسی عقیدے کا پرچار کرنے میں آسانی ہوگئی۔ چنانچہ بوئر جنگ کے خاتمہ کے بعد ہی گاندھی جی نے جنوبی افریقہ میں ایک "آشرم" قائم کیا تاکہ اپنے جدید عقیدے کے ماتحت وہاں ایک ایسی جماعت بنائیں جو آگے چل کر اس عقیدے کو عام کرنے میں ان کی مددگار ثابت ہو۔ ریاضت اور نفس کشی کے اُن راہبانہ اصولوں پر جو ہندو فلسفے کی بنیاد سمجھے جاتے ہیں اس آشرمی زندگی کی داغ بیل ڈالی گئی اور اپنے پیروں کو مقاومت مجہول یا ستیہ گرہ کے لئے تیار کرنا شروع کر دیا۔ ستیہ گرہ کا مفہوم گاندھی جی نے یہ بتایا۔

"ظلم و زیادتی بے اصولی اور بے انصافی کا جسمانی قوت کے بجائے روحانی قوت سے مقابلہ کرنے کا نام ستیہ گرہ ہے۔ اس قسم کے مقابلے کے لئے زبردست قوت برداشت کی ضرورت ہے اور وہی لوگ ایسا مقابلہ کر سکتے ہیں جو نہایت مستقل مزاج ہوں اپنے مقصد کے لئے بڑی سے بڑی قربانی پیش کر سکتے ہوں اور اپنے جذبات کو مشتعل ہونے سے روک سکتے ہوں۔"

اس عقیدے کو جانچنے کا موقع بھی بہت جلد مل گیا ۱۹۰۶ء میں جنوبی افریقہ کی حکومت نے ایک قانون منظور کیا جس کی رو سے جنوبی افریقہ کے ہر ہندوستانی کو اپنا نام درج رجسٹر کرانا ضروری تھا، گاندھی جی نے اس قانون کی مخالفت میں ستیہ گرہ شروع کر دی۔ حکومت نے گاندھی جی کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا۔ گاندھی جی کے بعد مسز گاندھی بھی دو ہزار عورتوں کے ساتھ ستیہ گرہ کرنے نکلیں اور گرفتار ہوگئیں جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں

میں اس واقعہ سے جوش پھیل گیا تحریک خود بخود بڑھ گئی جیل خانے بھر گئے حکومت اپنا قانون واپس لینے پر مجبور ہو گئی۔ گاندھی جی کے جیل سے نکلنے سے پہلے ہی ایک مشرقی لیڈر کی حیثیت سے ان کی شہرت مشرق سے مغرب تک پہنچ گئی۔ ستیہ گرہ کا یہ پہلا تجربہ تھا جو پوری طرح کامیاب رہا۔

سنہ ۱۹۱۴ء میں گاندھی جی ہندوستان واپس ہوئے۔ جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ گاندھی جی کو اب تک برطانوی حکومت پر اعتماد تھا انھوں نے اعلان کیا :-

"ہندوستان کے ہر تندرست باشندے کو اس نازک وقت میں سلطنت برطانیہ کی امداد کرنی چاہیئے کیونکہ صرف اسی خدمت کے بعد ہندوستان برطانوی سلطنت میں اعزاز کے ساتھ برابر کا شریک ہو سکتا ہے۔"

لیکن برطانیہ کے متعلق گاندھی جی کا یہ عقیدہ زیادہ دنوں قائم نہ رہ سکا سنہ ۱۹۱۵ء اور سنہ ۱۹۱۹ء کے درمیان اس میں برابر تبدیلی ہوتی گئی تاآنکہ سنہ ۱۹۱۹ء میں انھوں نے حکومت سے "عدم اشتراک عمل" کا اعلان کر دیا۔

سنہ ۱۹۱۹ء سے سنہ ۱۹۲۲ء تک تحریک ستیہ گرہ کا شباب رہا۔ سنہ ۱۹۱۹ء میں گاندھی جی نے رولٹ ایکٹ کے خلاف ملک میں بیداری پیدا کی جس کے بعد ہی امرتسر میں جلیانوالے باغ کا حادثہ پیش آیا جس میں جنرل ڈائر نے نہتے ہندوستانیوں پر مشین گنیں چلا کر سیکڑوں ہندوستانیوں کو شہید کر ڈالا۔ اس واقعے نے ہندوستان کے طول و عرض میں آگ سی لگا دی اور ستیہ گرہ کی تحریک میں جو اس وقت کچھ بجھی بجھی سی تھی جان پڑ گئی اس واقعہ کے انتقام کے طور پر سنہ ۱۹۲۰ء کے خاص اجلاس میں جو ناگپور میں منعقد

ہوا تھا گاندھی جی نے اپنی مشہور عدم اشتراک عمل والی تجویز پیش کر دی جو بالاتفاق منظور ہو گئی ۔

اس تجویز کی رو سے خطابات کی واپسی، بدیسی کپڑے کا بائیکاٹ اور سرکاری اسکولوں کالجوں، عدالتوں اور کونسلوں کا مقاطعہ کیا گیا ۱۹۲۱ء میں پرنس آف ویلز کی آمد کے موقع پر بمبئی میں عام ہڑتال کا اعلان ہوا لیکن اس موقعہ پر شدید فساد ہو گیا۔ گاندھی جی اس فساد سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے امن قائم کرنے کے لیے برت رکھا یہ گاندھی جی کا دوسرا برت تھا اس سے پہلے وہ اسی قسم کے واقعہ پر ۱۹۱۹ء میں تین دن کا برت رکھ چکے تھے اُس وقت کے وائسرائے لارڈ ریڈنگ نے اسی فساد کو وجہ قرار دیکر کانگریس پر سختیاں شروع کر دیں۔ گاندھی جی نے ان سختیوں کے خلاف احتجاج کیا اور حکومت ہند کو دھمکی دی کہ اگر حکومت اپنی سخت گیر پالیسی سے باز نہ آئی تو وہ باردولی میں سیول نافرمانی شروع کر دیں گے۔ لیکن ابھی باردولی سیول نافرمانی کی تیاریاں مکمل نہیں ہوئی تھیں کہ فروری ۱۹۲۲ء میں چوری چورا کا واقعہ پیش آ گیا جس میں ہندوستانیوں کے مشتعل مجمع نے پولیس چوکی کو جلا دیا اور بائیس پولس کانسٹبلوں کو ہلاک کر ڈالا اس حادثہ سے گاندھی جی اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے سول نافرمانی کا اعلان واپس لے لیا اور ہر قسم کی کانگریس کی سرگرمیوں کو بند کر دیا۔

۱۰ مارچ ۱۹۲۲ء کو گاندھی جی اپنے احمد آباد کے آشرم سے اس جرم میں گرفتار کر لیے گئے کہ انھوں نے اپنے اخبار "ینگ انڈیا" میں چار قابل اعتراض مضامین شائع کیے تھے، اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے انھیں اسی جرم کی پاداش میں چھ سال قید سادہ کی سزا سنا دی۔ لیکن سزا کے دوسرے ہی برس گاندھی جی

"اپنڈی سائٹس" میں مبتلا ہو گئے اس لئے انھیں جیل سے ہسپتال منتقل کر دیا
گیا اور جب اچھے ہو گئے تو حکومت نے غیر مشروط طور پر انھیں رہا کر دیا جیل
سے باہر آکر گاندھی جی نے دیکھا کہ کانگریس میں پھوٹ پڑی ہوئی ہے ہندو
مسلم سوال ملک میں تفرقہ ڈال رہا ہے اور سارے ملک میں رجعت پسندانہ
فضا طاری ہو گئی ہے۔

دیش بندھو داس اور موتی لال آنجہانی نے کانگریس کی عدم اشتراک
عمل والی تجویز سے اختلاف کرتے ہوئے سوراج پارٹی قائم کر لی تھی جس
کی وجہ سے کانگریس میں کمزوری پیدا ہو گئی تھی گاندھی جی نے اس پارٹی کو
اس کے مسلک سے اختلاف کے باوجود کانگریس میں شامل کر کے کانگریس
کو تباہ ہونے سے بچایا لیکن ہندو مسلم اختلافات کا انھیں کوئی دائمی حل نہ
سوجھا اس لئے ۴ ستمبر ۱۹۲۴ء کو انھوں نے اس کے لئے دلی میں اکیس
دن کا برت رکھا۔ ۲۶ دسمبر ۱۹۲۴ء کو اسی مطلب کے لئے دلی میں ایک
آل پارٹیز کانفرنس بھی طلب کی گئی لیکن یہ ساری کوششیں رائیگاں گئیں
اور ہندو مسلم گتھی نہ سلجھنی تھی نہ سلجھی۔

۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۷ء تک کا زمانہ پکیٹنگ اور بائیکاٹ کی تحریکوں
کے لئے شباب کا زمانہ تھا، شراب اور بدیسی کپڑے پر جگہ جگہ کانگریسی رضا کار
پکیٹنگ کرتے ہوئے نظر آتے تھے۔ اس پکیٹنگ کا بدیسی کاروبار پر بہت
برا اثر پڑا لیکن ہندوستان کی ملوں کے کپڑوں اور ہاتھ سے بنے ہوئے
کپڑے کے لئے بڑا بازار ہاتھ آگیا۔

اسی دوران میں سیاسی حلقوں میں کانگریس کے سیاسی منزل مقصود

کی بحث چھڑ گئی۔ ابتداءً گاندھی جی حکومت برطانیہ کے زیر سایہ حکومت کے کامل اختیارات پر قناعت کرنے کو تیار تھے لیکن کانگریس کے کچھ ممبر ایسے تھے جو اس پر قانع نہ ہوئے اور ۱۹۲۷ء میں مدراس والے کانگریس کے اجلاس میں اور اس کے بعد ۱۹۲۸ء میں کلکتہ کے کانگریسی اجلاس میں آزادی کامل کی قرارداد منظور ہوگئی۔

۱۹۲۹ء میں مسٹر میکڈانلڈ کی مزدور حکومت برسر اقتدار آئی اور اس وقت کے وائسرائے لارڈ ارون کے مشورے سے اس نے ڈومنین اسٹیٹس کو سیاسی منزل قرار دے کر ہندوستانی اصلاحات کے مسئلہ کو طے کرنے کے لئے ایک گول میز کانفرنس کا اعلان کر دیا لارڈ ارون نے گفتگو کے لئے کانگریسی لیڈروں کی ایک کانفرنس اپنے ہاں طلب کی جس میں گاندھی جی بھی شریک تھے لیکن وائسرائے کی گفتگو سے انھیں اطمینان نہ ہوا اور اسی سال لاہور والے کانگریس کے سالانہ اجلاس میں انھوں نے گول میز کانفرنس میں مقاطعہ کی تجویز پیش کر دی۔ جو بالاتفاق منظور ہوگئی۔

اس تجویز کے بعد حکومت اور کانگریس کے درمیان اختلاف کی خلیج بڑھ گئی گاندھی جی نے لارڈ ارون کو ایک خط بھیجا جس میں ملک کے بعض شعبوں میں فوراً ہی اصلاحات نافذ کرنے کا مطالبہ کیا اور دھمکی دی کہ اگر یہ مطالبات پورے نہ ہوئے تو پھر سیول نافرمانی شروع کر دیں گے جو مدت اس خط میں گاندھی جی نے مقرر کی تھی وہ ختم ہوگئی اور گاندھی جی نے ۱۲ مارچ ۱۹۳۰ء کو نمک بنا کر سیول نافرمانی کرنے کی غرض سے اپنے آشرم سے ڈانڈی کیطرف کوچ کر دیا اس کوچ میں گاندھی جی کے ساتھ (۷۹) رضاکار تھے اور یہ سب انہیں کے آشرم کے تربیت یافتہ تھے۔ ۵ اپریل کو گاندھی جی ڈانڈی پہنچے۔

۶ اپریل سے سیول نافرمانی شروع کر دی اور ۴ مئی ۱۹۳۰ء کو حکومت ہند کے حکم سے گرفتار کر کے یرودا جیل میں بند کر دیئے گئے۔ لیکن سرتیج بہادر سپرو اور مسٹر جے کار کی کوششوں سے گاندھی جی رہا ہو گئے لارڈ اِروِن سے دوبارہ گفتگو شروع ہوئی اور دونوں میں مصالحت ہو گئی اس مصالحت کا نام گاندھی اِروِن سمجھوتہ ہے ❖

۱۹۳۰ء میں دوسری گول میز کانفرنس ہوئی اس کانفرنس میں اصلاحات کے سلسلہ میں ہندوستان کی اکثریت اور اقلیتوں کا سوال اٹھا مسٹر ریمزے میکڈانلڈ نے ہندوستانی نمائندوں کو یہ موقع دیا کہ وہ اس مسئلہ کا آپس ہی میں مشورہ کر کے تصفیہ کر لیں، لیکن باوجود متواتر کوششوں کے جب یہ مسئلہ آپس میں طے نہ ہو سکا تو مسٹر میکڈانلڈ نے تیسری گول میز کانفرنس میں بہ حیثیت ثالث اپنا فیصلہ صادر کر دیا۔ اس فیصلہ میں جہاں مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے حقوق کا ذکر تھا وہاں ہندوستان کے اچھوتوں کو بھی مجالس قانون ساز میں ہندوؤں سے علیحدہ نمائندگی دی گئی تھی۔ اچھوتوں کو ہندوؤں سے علیحدہ کرنے پر گاندھی جی کو اعتراض ہوا اور اس اختلاف کو مٹانے کے لئے انھوں نے ۱۹۳۱ء میں مرن برت رکھا۔ بالآخر بعض کانگریسیوں کے دباؤ سے اچھوت نمائندے ڈاکٹر امبید کر اور گاندھی کے درمیان ایک عہد نامہ تیار ہوا . . . . اور اچھوت ہندوستانی سیاست میں اپنی علیحدہ نمائندگی سے دست بردار ہو گئے یہ عہد نامہ "پونا پیکٹ" کہلاتا ہے ❖

اس واقعے کے کچھ دنوں بعد گاندھی جی نے کانگریس سے علیحدگی کا اعلان

کر دیا اور اپنی ساری توجہ اچھوت سدھار اور دیہات سدھار جیسی تحریکوں پر مرکوز کر دی ؛

کانگریس سے گاندھی جی کی علیحدگی کا اعلان محض برائے بیت تھا ورنہ اس اعلان علیحدگی کے بعد بھی وہ اسی طرح کانگریس کے واحد نمائندہ اور لیڈر سمجھے جاتے رہے اور کانگریس کا ہر کام بدستور انہی کے مشورے سے ہوتا رہا۔

۱۹۳۷ء میں پراونشل آٹانومی کا اعلان ہوا اور صوبجاتی مجالس قانون ساز کے انتخاب شروع ہوئے پانچ صوبوں میں کانگریس کو اکثریت حاصل ہوگئی۔ لیکن کانگریس نے ابتداءً وزارت کی ترتیب پر آمادگی ظاہر نہیں کی اس لئے کہ اسے گورنر جنرل اور گورنروں کے اختیارات خصوصی پر اعتراض تھا لیکن کچھ دنوں بعد حکومت برطانیہ کی "نیک نیتی" نے کانگریس کے دل میں گھر کر لیا اور کانگریس نے پہلے پانچ صوبوں میں اور بعد کو دو اور صوبوں میں اپنی وزارت بنا لی۔

کانگریس کی صوبائی وزارتوں کی نگرانی کے لئے کانگریس ہائی کمانڈ کے نام سے ایک پارلیمنٹری کمیٹی بنائی گئی اور اس کمیٹی کے اوپر گاندھی جی کی ذات ہے جسے ملک میں اب ایک ڈکٹیٹر کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے ۱۹۳۸ء میں فیڈریشن کا سوال اٹھا کانگریس نے اس کے مقابلہ کی تیاریاں شروع کر دیں ریاستوں میں اصلاحات کے لئے ایجنٹس سے یہ تیاریاں شروع ہوئیں تاکہ فیڈرل اسمبلی میں کانگریس کو اکثریت حاصل رہے ؛

ریاستوں میں عدم مداخلت کے متعلق کانگریس کی ایک قرارداد پہلے سے موجود تھی اس پر نظرثانی کی گئی اور ریاستوں میں کانگریسیوں کی انفرادی

مداخلت کو جائز قرار دیا گیا۔

ٹرانکور، میسور، حیدرآباد، جے پور اور راجکوٹ میں یکے بادیگرے ایجیٹیشن شروع کر دیا گیا۔ ٹرانکور اور میسور میں کانگریسی ایجیٹیشن کو ناکامی ہوئی جے پور میں بھی یہ کامیاب نہ ہو سکا۔ حیدرآباد میں کانگریس ایجیٹیشن روک دیا گیا۔ اس کے بجائے آریوں کا فرقہ وار ایجیٹیشن جاری رہا۔

راجکوٹ کا مسئلہ گاندھی جی کے رفیق خاص سردار ولبھ بھائی پٹیل نے اٹھایا تھا جب ان میں اور ٹھاکر صاحب میں کشمکش بڑھی تو گاندھی جی نے بہ نفس نفیس راجکوٹ جا کر اس میں مداخلت کی اور "مرن برت" کا اعلان کر دیا گاندھی جی کو شکایت یہ تھی کہ ٹھاکر صاحب نے اصلاحات دینے کا وعدہ کیا اور اپنے وعدے سے پھر گئے چنانچہ ٹھاکر صاحب کو وعدہ پر قائم رکھنے کے لئے ایک طرف انھوں نے "مرن برت" رکھا اور دوسری طرف وائسرائے سے مداخلت کی درخواست کی۔ وائسرائے نے گاندھی جی کی درخواست پر راجکو کے معاملے میں مداخلت کی اور گاندھی جی اور ٹھاکر صاحب کا قضیہ فیڈرل کورٹ میں پیش کر دیا۔ گاندھی جی نے برت کھول لیا۔ فیڈرل چیف جسٹس سر مارس گائرنے فیصلہ دیدیا کچھ گاندھی جی کی طرف کچھ ٹھاکر صاحب کے حق میں جب اس پر عمل کا وقت آیا۔ بعض ایسی ایسی نئی نئی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا کہ وہ ان کو حل نہ کر سکے اور مجبوراً اپنی شکست کا اعلان کر کے سر مارس گائر کے فیصلے سے دست برداری کر لی اور اصلاحات کا کام ٹھاکر صاحب کے سپرد کر دیا۔

۱۹۳۹ء میں جب کانگریس کے لئے نئے صدر کے انتخابات کا وقت آیا تو گاندھی جی نے اپنی طرف سے ستیا رامیا کو صدارت کے لئے پیش کیا۔ سوباش چندر بوس جو پچھلے سال کے صدر تھے اس انتخاب سے مطمئن نہ ہوئے

اور انھوں نے اپنی امیدواری کا اعلان کر دیا، اس اعلان پر کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے بعض ممبروں نے سبھاش چندر بوس کی ذات پر حملہ کیا اور سبھاش چندر بوس نے جواباً ساری ورکنگ پر الزامات لگائے انتخاب ہوا، ستیارامیا ہار گئے سبھاش بوس جیت گئے۔ ستیارامیا کی شکست کو گاندھی جی نے اپنی شکست قرار دی کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے تیرہ ممبروں نے استعفیٰ دیدیا اور کانگریس میں ایک قسم کی پھوٹ کے آثار پیدا ہو گئے۔ تری پوری کانگریس کے اجلاس میں پنڈت پنت وزیراعظم یو پی نے ایک قرارداد پیش کی جس میں سبھاش بوس کو جدید ورکنگ کمیٹی کی ترتیب میں گاندھی جی کے مشورے کا پابند بنادیا۔ لیکن کمیٹی کی ترتیب میں گاندھی جی اور سبھاش بوس میں اتفاق نہ ہو سکا اور سبھاش بوس کو کانگریس کی صدارت سے استعفیٰ دینا پڑا اس سال کے صدر کانگریس کے انتخاب سے لیکر مسٹر سبھاش بوس کے استعفیٰ تک جو واقعات گذرے ہیں ان کی نظیر کانگریس کے قیام سے اب تک نہیں ملتی۔ اگرچہ سبھاش بوس کے استعفیٰ سے گاندھی جی کو وقتی حیثیت سے ضرور کامیابی حاصل ہوگئی لیکن اس واقعہ سے کانگریس میں ایک رخنہ بھی پڑ گیا۔ جس کے بعد ملک کی سیاست میں کشمکش اور پیچیدگیاں اور زیادہ بڑھ گئیں

سبھاش بوس نے کانگریس کی صدارت سے مستعفی ہوکر فارورڈ بلاک کے نام سے اپنی ایک علیحدہ جماعت بنالی اور کانگریس " ہائی کمانڈ " کے احکام پر سختی سے نکتہ چینی شروع کر دی لیکن کانگریس اس نکتہ چینی کو برداشت نہ کر سکی اور سبھاش بوس کو سزاءً تین برس کے لئے کانگرس سے خارج کر دیا۔ کانگرس کے اس غلط اقدام نے سبھاش بوس کے فارورڈ بلاک کو بڑی تقویت پہنچائی اور اسے ملک میں ایک سیاسی جماعت کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ ابھی کانگریس کے اس غلط

اقدام کا ملک میں ردعمل شروع ہی ہوا تھا کہ جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کر دیا اور انگلستان اور فرانس پولینڈ کی حمایت میں جنگ میں کود پڑے۔ کانگریس کے لئے یہ بڑی آزمائش کا وقت تھا اگر وہ جنگ میں برطانیہ کا ساتھ دیتی ہے تو ملک میں اسکی مقبولیت پر اثر پڑتا ہے اور ساتھ نہیں دیتی تو صوبوں سے اسکا حاکمانہ اقتدار رخصت ہوجاتا ہے وائسرائے نے بھی گاندھی جی کی اس الجھن کو دور کرنے کی کوشش کی لیکن کانگریس ورکنگ کمیٹی نے وائسرائے کے بیان کو بجنسہٖ تسلیم نہیں کیا اور یہ طے کیا کہ برطانیہ پہلے یہ اعلان کرے کہ اس جنگ کے خاتمہ پر ہندوستان کو کیا ملے گا۔ کانگریس کے اس فیصلہ پر برطانیہ اور خود ہندوستان میں بڑی سخت نکتہ چینیاں ہوئیں۔ وائسرائے نے کانگریسی رہنماؤں کو ایک موقع اور دیا اور گاندھی جی کے ساتھ جواہر لال اور ولبھ بھائی پٹیل کو بھی ملاقات کا موقع دیا۔

لیکن اس ملاقات کا بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا اس لئے کہ یورپ میں جنگ چھڑتے ہی ملک کی سیاسی فضا بدل چکی تھی حکومت برطانیہ کے آگے امن واماں سے ساتھ ملک پر حکومت کرنے کا مسئلہ باقی نہیں رہا تھا بلکہ یہ سوال تھا کہ بیرونی حملو سے ملک کی سرحدوں کی حفاظت کس طرح کی جائے۔

کانگریس حکومت کے اس نقطہ نظر سے ہمدردی نہ کر سکی۔ حکومت نے کانگریس سے پیٹھ موڑ کر ملک کی "مارشل" اقوام کی دلداری شروع کر دی۔ کانگریس نے بگڑ کر صوبوں کی وزارتوں سے استعفیٰ دیدیا۔ حکومت نے نہایت خاموشی کے ساتھ دستور جدید کی دفعہ ۹۳ کے ماتحت سوائے آسام کے سارے کانگریسی صوبوں کے نظم ونسق پر قبضہ کر لیا۔

چنانچہ دسمبر ۱۹۴۱ء تک صورت حال یہ ہے کہ کانگریس ایک نئے اقدام کا خاکہ سوچ رہی ہے اور حکومت پوری توجہ سے کانگریس کی ہر ہر نقل وحرکت کا مطالعہ

کر رہی ہے۔

اوپر ہم نے گاندھی جی کی سیاسی زندگی کا سرسری خاکہ پیش کیا ہے۔ لیکن یہ خاکہ مکمل نہیں ہو سکتا جب تک ہم ان کے مذہبی معتقدات کا تذکرہ نہ کریں کیونکہ فی الحقیقت گاندھی جی بجائے سیاسی رہنما ہونے کے ایک جدید مذہب کے پیشوا ہیں اور اب تک انھوں نے سیاسی حیثیت سے جتنی غلطیاں کی ہیں وہ محض ان کے مذہبی تقدس اور بزرگی ہی کی بنا پر نظرانداز کی جاتی رہی ہیں اور سیاسی حیثیت سے جس قدر کامیابیاں انھیں حاصل ہو سکیں وہ بھی ان کے مذہبی معتقدات کے باعث ہوئی ہیں۔

ہم بتا چکے ہیں کہ گاندھی جی پر اوائل عمر ہی سے رامائن اور بھگوت گیتا کی تعلیمات کا اثر تھا، چنانچہ جنوبی افریقہ میں جو آشرم گاندھی جی نے راہبانہ اصولوں پر قائم کیا تھا وہ اسی اثر کی کارفرمائی کا نتیجہ تھا اور ہندوستان میں بھی سنہ ۱۹۱۵ء میں جنوبی افریقہ سے واپس ہوئے تو سب سے پہلے انہی اصولوں پر "سابرمتی" میں ایک آشرم قائم کیا تاکہ ملک میں ان کی تعلیمات کی تبلیغ کے سلسلے میں یہ آشرم بطور مرکز کے کام دے سکے۔

"سابرمتی آشرم" میں داخل ہونے والوں کو جو عہد کرنے ہوتے ہیں اور جس قسم کی پابندیاں اپنے نفس پر قبول کرنی ہوتی ہیں یہاں ان میں سے بعض کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) سچ بولنے کی قسم کھائے خواہ سچ بولنے میں کچھ ہی نقصان کیوں نہ ہو

(۲) "اہنسا" کا عہد کرے۔ اس عہد کے لیے کسی کو صرف آزار نہ پہنچانا کافی نہیں ہے بلکہ اہنسا کے پیرو کو چاہیے کہ اپنے اوپر ظلم کرنے والے کو بھی تکلیف نہ دے۔ ظالم کا مطیع نہ ہو بلکہ ظلم کے برداشت کی قوت اپنے میں پیدا کرے خواہ

اس کوشش میں اس کی جان بھی چلی جائے
(۳) مجرد رہنے کا عہد کرے جب تک تجرد کی قسم نہ کھائی جائیگی اس وقت تک اوپر کے دونوں عہدوں پر عمل کرنا ناممکن ہے۔
(۴) بھوک اور ذائقہ پر قابو رکھے جب تک اپنی غذا اور ذائقہ پر قابو حاصل نہ کیا جائے اس وقت تک کوئی شخص تجرد کی زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ غذا محض جسمانی پرورش کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ اس لئے رفتہ رفتہ یا فی الفور جس طرح سہولت ہو غذا کی مقدار اس قدر کم اور اس قدر سادہ مقرر کی جائے جو جسم کی پرورش تو کرسکے لیکن انسان میں کوئی جذبہ حیوانی پیدا نہ کرنے پائے۔
(۵) سرقہ نہ کرنے کا عہد کرے اس عہد کے لئے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ دوسرے کی ملک پر قبضہ نہ کرے بلکہ یہ بھی سرقہ ہے کہ اگر ہم کسی ایسی چیز کا استعمال کریں جس کی فی الواقعی ہمیں ضرورت نہ ہو۔ ہماری روزانہ کی ضروریات کے لئے قدرت خود ہمیں روزی دیدیتی ہے یہی ہمارے لئے کافی ہے اس سے زیادہ کی ہمیں مطلق ضرورت نہیں۔
(۶) اثاثہ نہ رکھنے کا عہد کرے اس عہد کے لئے اپنے قبضہ میں صرف زیادہ اثاثہ نہ رکھنا کافی نہیں ہے۔ بلکہ ضرورت اس بات کی ہے جسم کو جس چیز کی ضرورت نہ ہو وہ چیز ہرگز اپنے پاس نہ رکھے مثلاً اگر کوئی شخص اپنی زندگی کے لئے میز کرسیوں یا پلنگ کو ضروری نہیں سمجھتا تو یہ چیزیں وہ اپنے پاس نہ رکھے۔ اس عہد کرنے والے کو اپنی روزانہ زندگی پر احتساب کرکے اسے سادہ سے سادا بنانا چاہیئے۔
(۷) سودیشی استعمال کا عہد کرے۔ اس عہد کے معنی یہ ہیں کہ زندگی کے ہر شعبہ میں سودیشی چیزیں استعمال کرے۔

(۸) نڈر اور بے خوف رہے۔ ڈر اور خوف جس کے دل میں گھر کر جائے وہ سچائی اور اہنسا پر عمل نہیں کر سکتا۔ اس لئے اسے چاہیئے کہ بادشاہ سوسائٹی ذات پات، خاندان، چور، ڈاکو، خونخوار جانور جیسے شیر ہاتھی وغیرہ حتیٰ کہ موت تک سے نہ ڈرے۔

یہ چند موٹے موٹے اصول ہیں جن سے گاندھی ازم عبارت ہے۔ اسوقت ان میں سے صرف ایک اصول "اہنسا" کا ملک میں پرچار کیا جا رہا ہے مقاومت مجہول یا ستیہ گرہ اسی اصول کی جارحانہ شکل ہے اگرچہ اس وقت ملک میں ستیہ گرہ کا جو انداز ہے اس میں وہ روح نہیں ہے جو گاندھی جی نے "اہنسا" کے عقیدے میں ہونی ضروری قرار دی ہے۔ تاہم یہ واقعہ ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ستیہ گرہ کی تحریک نے ہندوستان کی پست اقوام میں سیاسی بیداری اور یکجہتی پیدا کرنے میں بڑا کام کیا اور کر رہا ہے۔

ستیہ گرہ، دراصل اپنے سے زیادہ طاقت ور کو "زچ" کر دینے کا نام ہے ظاہر ہے کہ ایک کمزور اور نہتا شخص اپنے طاقتور اور مسلح حریف سے دو بدو مقابلہ نہیں کر سکتا لیکن اپنی قوت برداشت کے ذریعہ اس کے حملوں کی بے اثری کا اسے احساس ضرور لا سکتا ہے۔ اپنی مسلسل جسمانی قربانیوں سے اسے پشیمان ضرور کر سکتا ہے۔ تشدد کے مقابلہ میں مستقل مزاجی کے ساتھ اپنی ہٹ پر جا رہ کر اسے اس قدر زچ کر سکتا ہے کہ طاقتور حریف کے لئے بالآخر اس ہٹ کے آگے سر خم کر دینے کے سوا چارہ نہیں رہتا۔

اپنے سے قوی تر کے مقابلہ کا یہ بالکل نرالا طریقہ تھا جس کے اثرات کا اس سے پہلے دنیا کو عملاً کوئی تجربہ نہ ہوا تھا اور جب تجربہ کے بعد جنوبی افریقہ اور ہندوستان

کی پست قوموں کے ہاتھ میں یہ ایک نہایت کارآمد اور موثر ہتھیار ثابت ہو تو دنیا نے گاندھی جی کی اس نئی "حکمت عملی" کی کھلے دل سے داد دی اور انھیں ایک جدید سیاسی مذہب کا بانی تسلیم کرلیا۔

گاندھی جی کو خود بھی اپنے اس سیاسی مذہب پر کامل اعتماد ہے اور وہ پورے وثوق کے ساتھ یہ ایمان رکھتے ہیں کہ دنیا بھر کی کمزور اقوام کے لئے یہی ایک راہ نجات ہے چنانچہ جرمنی کے یہودیوں اور یورپ کی چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کو نازی اور فاشست خطرے سے بچنے کے لئے آپ نے ہمیشہ ستیہ گرہ کرنے کی رائے دی ہے۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ گاندھی جی کے اس دعوے میں کلام کی بڑی گنجائش موجود ہے ان کی تحریک ستیہ گرہ ایک خاص ماحول میں تو ضرور کامیاب ہوسکتی ہے لیکن ہر ماحول میں اس کی کامیابی کا امکان مشتبہ ہے اس لئے کہ ستیہ گرہ خالص اخلاقی تحریک ہے اور اس کی کامیابی کا مدار بالمقابل کے احساس اخلاقی پر ہے اگر مقابل میں یہ احساس بہت ضعیف ہے یا سرے سے پایا ہی نہیں جاتا تو ظاہر ہے کہ ستیہ گرہ کی تحریک اسے متاثر نہیں کرسکتی۔

دوسرے ماحول سے بے پرواہ ہو کر ستیہ گرہ کی عالمگیر کامیابی فرض کرلینے سے یہ تسلیم کرنا بھی لازم آتا ہے کہ دنیا کی ہر قوم کا اخلاقی زاویہ نظر بالکل ایک سا ہے حالانکہ یہ امر واقع کے بالکل خلاف اور بداہتاً غیر ثابت ہے۔

علاوہ اس کے اس عقیدے کے عالمگیر قبول کے سلسلہ میں گاندھی جی کے لئے یہ ثابت کرنا بھی مشکل ہے کہ "اہنسا" یا ستیہ گرہ کا عقیدہ شرافت نفس کے علاوہ انسان میں اس جذبہ عالیہ کے نشوونما کا باعث بھی ہوسکتا ہے جو کسی قوم کی بقا

اور سلامتی کی ضمانت کرتا ہے ۔

جذبہ عالیہ سے مراد وہ روح تہور (مارشل اسپرٹ) ہے جو زندہ قوموں میں جذبہ وطنی، غیرت قومی اور حمیت دینی کے امتحان کے وقت حرکت میں آجایا کرتی ہے ۔ اس لئے کہ ستیہ گرہ اسی مارشل اسپرٹ کے خلاف ایک منظم احتجاج ہے ۔

ایک سچا ستیہ گرہی ایک شریف النفس سنیاسی ہو سکتا ہے ایک مشقت پسند اور مرتاض قسم کا سادھو ہو سکتا ہے ایک ڈھیٹ اور ہٹیل قسم کا انسان بھی بن سکتا ہے لیکن اس عقیدے پر پوری طرح ایمان لے آنے کے بعد وہ غیرت قومی سے کبھی مدہوش نہیں ہو سکتا، جذبہ وطنی سے کبھی بے قابو نہیں ہو سکتا، حمیت دینی سے کبھی بے اختیار نہیں ہو سکتا مختصر یہ کہ اس عقیدے کے ساتھ سچی شجاعت و شہامت کا تصور اس کے قلب کو نہیں گرما سکتا اور تہور اور مردانگی کا جذبہ اس کی روح کو نہیں تڑپا سکتا اس لئے کہ بیخودی اور بے اختیاری کے درجہ پر پہنچ کر وہ چاہے جو کچھ ہو جائے ۔ گاندھی جی کے عقیدے کے مطابق ستیہ گرہ باقی نہیں رہتا ظاہر ہے کہ گاندھی جی کا یہ عقیدہ ان قوموں کو متاثر نہیں کر سکتا جو مادی وسائل کی کمزوری کے باعث چاہے اس وقت کتنی ہی پست نظر آئیں لیکن مارشل اسپرٹ جن کی میراث ہے اور جو اسی روح کو اپنی بقا اور سلامتی کی ضامن سمجھتی ہیں ۔

ستیہ گرہ کے پرچار کے لئے، خوش قسمتی سے گاندھی جی کو میدان بڑا اچھا ہاتھ آگیا ۔ پہلے جنوبی افریقہ بعد کو ہندوستان! دونوں جگہ ایک ہی قوم سے واسطہ رہا تقریباً یکساں ماحول ملا اور سب سے بڑی بات یہ کہ ایک ہی سامراج سے مقابلہ کرنا

پڑا جس کے باعث ستیہ گرہ کا ہر نیا تجربہ کامیابی کی منزل کی طرف ایک تازہ قدم ثابت ہوتا گیا لیکن ستیہ گرہ کی تحریک میں چونکہ مذہبی عقائد و جذبات کو زیادہ دخل ہو گیا اس لئے اس تحریک کی حیثیت بھی بجائے سیاسی کے مذہبی ہوتی گئی اور اس کی وجہ بھی معقول ہے۔

گاندھی جی کی تعلیمات یکسر ہند و فلسفہ پر مبنی ہیں، اپنی عملی زندگی میں وہ اول سے آخر تک ہشیث اور کٹر قسم کے مذہبی آدمی ہیں اور قدیم ہند و طریقہ عبادت اور ریاضت کو ان کے ہر پبلک اور پرائیویٹ عمل میں برابر کا دخل ہے۔

اس اعتبار سے ظاہر ہے، گاندھی جی کے اقوال اور اعمال سے سب سے زیادہ انہی کی ہم عقیدہ اور ہم مذہب قوم ہی کو لگاؤ اور دلچسپی ہو سکتی ہے چنانچہ آج گاندھی جی کی شخصیت ان کی قوم کے نزدیک ایک مذہبی مہاتما بلکہ ایک اوتار کی سی ہے ان کی تحریک ستیہ گرہ ہندوؤں کی مخصوص قومی اور مذہبی تحریک ہے، انہی کے مفاد کے لئے یہ حرکت میں آتی رہی ہے اور انہی کو قومی حیثیت سے یہ فائدہ پہنچاتی رہی ہے۔

ہندوستان کی دوسری قومیں جنہیں ہند و فلسفہ یا ہند و طریقہ عبادت و ریاضت یا تمدن و معاشرت سے کوئی دلچسپی نہیں انہیں اس تحریک سے بھی بہ ظاہر کوئی واسطہ نہیں ہے لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ گاندھی جی کی ذات اور ان کی تحریکوں نے ہند و قوم کے زاویہ نظر پلٹ دیئے، اس میں زندگی کی نئی امنگیں اور حوصلے پیدا کر دئے اور سیاسی حیثیت سے اس میں اس قدر بیداری پیدا کر دی کہ آج ہندوستان کا حکمراں طبقہ اس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کر سکتا چنانچہ اس احسان کا اعتراف ان کی قوم کو کرنا تھا اس نے کیا اور اسی انداز پر کیا جس انداز پر وہ اپنے قدیم مذہبی پیشواؤں اور اوتاروں کا کرتی چلی آئی ہے۔ گاندھی جی

کی شبیہ اس وقت ہر گھر ہر مدرسہ اور تقریباً ہر مندر کی زینت ہے اور وہ دن دور نہیں معلوم ہوتا جب اوراوتاروں کے ساتھ ان کی بھی ہر جگہ پرستش ہوا کرے گی ــــ اور ہندو نقطہ نظر سے گاندھی جی فی الحقیقت اس مرتبہ کے مستحق بھی ہیں۔

گاندھی جی کی تحریک ستیہ گرہ کا یہ ایک رخ تھا جو پچھلے اوراق میں پیش کیا گیا۔ اس تحریک کا ایک رخ اور ہے اور وہ کافی تاریک ہے۔ تاریک اس اعتبار سے کہ ایک طرف اس تحریک کے نفسیاتی اثرات اور نوعیت کی تبدیلی کے باعث اکثریت والی قوم کا زاویہ نظر بدل گیا اور دوسری طرف ہندوستان کی اقلیتوں پر اس کا ردعمل یہ ہوا کہ انھیں اپنا سیاسی وجود خطرے میں نظر آنے لگا۔ چنانچہ اس احساس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان کی اقلیتیں نہ صرف من حیث الجماعت اس تحریک سے بے تعلق ہیں بلکہ انھیں یہ محسوس ہو رہا ہے کہ ان کی انفرادیت کی بقا رہی اس تحریک کے اثرات کو کمزور کر دینے پر منحصر ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ نتیجہ گاندھی جی کے اس پروگرام کے سراسر خلاف ہے جو انھوں نے ۱۹۱۹ء میں "تحریک آزادی" کے نام سے ملک کے آگے پیش کیا تھا اور اس کے حصول کا وسیلہ ستیہ گرہ کو برقرار دیا تھا۔ اس لیے کہ تحریک آزادی کی بنیاد ہی ہندوستان کی ساری اقلیتوں کے اتحاد پر رکھی گئی تھی اور مرکزی خیال یہ تھا کہ ہندوستان کی مختلف قوموں میں اتحاد کے بغیر تحریک آزادی کی کامیابی ناممکن ہے۔

یہ خیال آج بھی اسی طرح صحیح ہو سکتا ہے جس طرح ۱۹۱۹ء میں سمجھا جاتا تھا لیکن فرق صرف اس قدر ہے کہ آج اس کو مرکزی حیثیت حاصل نہیں۔ اس تحریک کے نفسیاتی اثرات نے اس قوم میں کچھ ایسا عجب و پندار پیدا کر دیا ہے کہ اب وہ

اس کی ساری تحریکیں اقلیتوں سے قطعی بے نیاز ہیں۔

"قومیت متحدہ" یعنی مقصد مشترک پر ہندوستان کی مختلف قوموں کو متحد کرنے کا خیال ہندوستان کی سیاست میں ایک انقلابی اقدام تھا جس کے بعد تحریک آزادی کی کامیابی بلاشبہ چند دنوں کی بات رہ جاتی لیکن بدقسمتی سے قومیت متحدہ کے تخیل کی حیثیت محض خیالی ہی عملاً اسے کامیابی کی منزل دیکھنی نصیب ہوئی اور نہ ہو سکتی تھی۔

"متحدہ قومیت" کا نظریہ دراصل مشترک تمدن اور کلچر اور روایات قدیم کے اشتراک سے عبارت ہے۔ بلکہ فی الحقیقت (اپنی اجزا کی موزون ترکیب کا دوسرا نام "قومیت متحدہ" ہے اور ہندوستان میں یہ صورت ہے کہ یہاں کی مختلف چھوٹی بڑی قومیں صدیوں سے ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو آباد ہیں لیکن ان کا تمدن ان کا کلچر اور ان کی قدیم روایات میں آج تک کوئی مناسبت قائم نہیں ہوئی بلکہ بعض حیثیتوں میں وہ ایک دوسرے سے قطعاً مختلف اور متضاد ہیں۔ اس بیگانگی کا نتیجہ یہ ہے کہ "قومیت متحدہ" کا وہ نظریہ جس پر اکثریت والی قوم کے تمدن اور کلچر کا پورا پورا اثر ہے۔ اپنے اندر ہندوستان کی دوسری قوموں کے لئے جاذبیت اور کشش نہیں رکھتا یہی وجہ ہے کہ مقصد مشترک کی خاطر بھی ہندوستان کی مختلف قوموں میں اتحاد نہ ہو سکا۔

یہ قاعدہ ہے کہ جس ملک میں بڑی چھوٹی کئی قومیں آباد ہوتی ہیں وہاں مفاد مشترک کی خاطر" دے اور لے" کے اصول پر متحدہ قومیت کا ایک ایسا نظریہ مرتب ہو جاتا ہے جو اس ملک کی سب قوموں کو مطمئن کر سکے لیکن ہندوستان میں بدقسمتی سے اس اصول سے اب تک کام نہیں لیا جا سکا اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہندوستان کی وہ قوم جسکو اتفاق سے اکثریت حاصل ہے سرے سے ہندوستان کی دوسری قوموں

کو اپنے سے علیحدہ سیاسی اور کلچرل وجود ہی تسلیم کرنیکو تیار نہیں۔ اسکو اکثریت کا تمرد یے
پن سمجھیے یا سیاسی چالبازی لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ اسی تمرد نے بننے کے باعث
قومیت متحدہ کا موجودہ نظریہ جو فی الحقیقت اکثریت والی قوم کا اپنا مخصوص تخیل ہے
ہندوستانی اقلیتوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔
دنیا میں اعتماد ہی سے اعتماد پیدا ہوا کرتا ہے اگر ہندوستان کی وہ قوم
جسے ملک میں سیاسی حیثیت سے اکثریت حاصل ہے اپنی ہمسایہ اور ہم وطن
اقلیتوں پر اعتماد کرنے کے لئے تیار نہیں ہے تو سوال یہ ہے کہ ملک کی وہ قومیں
جو سیاسی حیثیت سے اقلیت میں ہیں اپنی ہمسایہ اکثریت پر اعتماد کیوں کریں
مفاد مشترک کی خاطر ملک کی چھوٹی بڑی قوموں میں بے شک اتحاد ہو سکتا ہے لیکن
پہلے مفاد مشترک کی نوعیت تو متعین ہونی چاہیئے جو ایسے اتحاد کی بنیاد قرار
پاسکے فریقین میں ہمیشہ اشتراک عمل سے پہلے معاہدہ ہوتا ہے بعد میں نہیں لیکن

لہ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں ہم آچاریہ کرپلانی جنرل سکریٹری آل انڈیا
کانگریس کے اس بیان کا اقتباس درج کرتے ہیں جو انھوں نے سبھاش بوس کے استعفے کے
بعد شائع کیا تھا۔ آچاریہ کرپلانی اپنے اس بیان میں کہتے ہیں۔

کانگریس صرف سیاسی جماعت نہیں۔ سیاست کی طرح وہ معاشرت
کو بھی نئی بنیادوں پر قائم کرنا چاہتی ہے جو لوگ اس کے معاشرتی
اصول نہ مانیں ان کو کانگریس میں نہ داخل ہونا چاہیئے۔ کانگریسی
اسکیموں کا قلم کسی اور فلسفہ میں نہیں لگایا جا سکتا یہ فلسفہ زندگی دنیا
کے کسی اور فلسفہ زندگی کے ماتحت نہیں بنایا جا سکتا ہر کانگریسی کو گاندھی
جی کا فلسفہ ماننا اور تسلیم کرنا ضروری ہے۔

قومیت متحدہ کے موجودہ نظریہ کے مُدوّن اور مبلغ اس پر مصر ہیں کہ بلاشرط اشتراک عمل پہلے اور معاہدہ بعد!

ہندوستان کی بڑی اور چھوٹی قوموں کے زاویہ نگاہ میں یہی اصولی اختلاف ہے جس کے بعد تحریک آزادی جس کی بنیاد قومیت متحدہ کے موجودہ نظریہ پر رکھی گئی تھی حکمراں طبقہ کے خلاف ایک مخصوص سیاسی جماعت کی کشمکش اقتدار بن کر رہ گئی۔ ہم نے پچھلے اوراق میں یہ بتایا تھا کہ تحریک ستیہ گرہ اب ہندوؤں کی ایک مذہبی اور مخصوص قومی تحریک ہے، اس تحریک کی نوعیت میں اس تبدیلی کا اثر ہندو ذہنیت پر یہ ہے کہ وہ ہندوستان کی دوسری قوموں سے بالکل علیحدہ اپنے لئے ایک نئی قومیت کی تعمیر میں معروف ہے جس میں رواداری کی وہ روح باقی نہیں ہے جو صدیوں سے پہلو بہ پہلو بسنے والی قوموں کے لئے ہونی چاہیئے تھی جہاں تک اصول کا سوال ہے ہندوستان کے ہر فرقے اور جماعت کو اپنی تنظیم اور اپنی انفرادیت کی آزاد تعمیر کا حق حاصل ہے لیکن اپنی مخصوص فرقہ وارانہ ذہنیت کے باوجود اگر ہندو اکثریت اپنی تحریک کو قوم پرستانہ اور اقلیتوں کی تنظیم کی ہر سعی اور کوشش کو فرقہ پرستانہ قرار دے تو یہ گویا ہندوستان کی اقلیتوں کو کھلا ہوا چیلنج ہے جس کے بعد اقلیتوں کی طرف سے کسی رواداری کی توقع بے معنی سی بات ہو جاتی ہے۔

ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ ہندو اکثریت کی اس تبدیلیٔ ذہنیت کی وجہ وہ نفسیاتی اثرات ہیں جو ستیہ گرہ کی تحریک سے برطانیہ جیسی جمہوریت پرست حکومت کے مقابلے میں پیدا ہوتے گئے یہ بحث اس جگہ مناسب نہیں ہے کہ برطانیہ کے طرز حکومت نے گاندھی جی کی تحریک آزادی کو ابتداء سے اس وقت تک کس قدر تقویت پہنچائی لیکن یہ حقیقت ہے کہ اسی تقویت کے باعث ہندو ذہنیت میں یہ انقلاب ہوا اور پے درپے کامیابیوں کے نشہ میں رواداری کا احساس ہی ان سے رخصت ہو گیا۔

مدہوشی کے اس دور میں ممکن ہے اکثریت والی قوم اپنی موجودہ حکمت عملی کے اثرات ابعد کا صحیح اندازہ نہ لگا سکے۔ لیکن ہندو قوم کی اس اشتعال انگیز ذہنیت کا ملک کی اقلیتوں پر جو ردعمل ہوا ہے اس سے آنکھیں بند نہیں کی جا سکتیں۔ سوال حال کی کامیابیوں کا نہیں مستقبل کے امن اور سلامتی کا ہے اس وقت تحریک ستیہ گرہ کو چاہے کتنی ہی کامیابی کیوں نہ حاصل ہو اگر اس کے اثرات ہندو ذہنیت کو اسی طرح بگاڑتے رہے تو ظاہر ہے کہ اس تحریک کا مستقبل روشن ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔

ہم نے پچھلے صفحات میں یہ بتایا ہے کہ جب سے تحریک ستیہ گرہ کی نوعیت بدلی اور بلا لحاظ قوم و ملت ہندوستانیوں کی سیاسی تحریک رہنے کے بجائے اس کو ہندوؤں کی خالص مذہبی اور قومی تحریک کی حیثیت حاصل ہوئی اس وقت سے ہندو ذہنیت میں انقلاب ہوا ہے۔

یہ رائے ان فرقہ وارانہ فسادات کی نوعیت پر مبنی ہے جو پچھلے دس برس کے عرصہ میں ہندوستان کے مختلف علاقوں میں واقع ہوتے رہے ہیں اتنے بڑے ملک میں جہاں مختلف عقیدے اور مذہب کے پیرو اور مختلف تمدن اور کلچر کی وارث قومیں آباد ہوں وہاں بعض خاص حالات میں فسادات کا واقع ہونا یقیناً تعجبات سے نہ ہوتا۔ اگر ان فسادات میں فرقہ وار برتری اور سیاسی اقتدار کے حصول کا جذبہ کارفرما نظر نہ آتا۔

فرقہ وار فسادات جن قوموں میں ہوئے اور آئے دن ہوتے رہتے ہیں ان کا وجود ایک دوسرے کے لئے نیا نہیں ہے صدیوں کی یکجائی کے باعث یہ آپس کے اختلافی مسائل سے اچھی طرح مانوس ہیں البتہ اس تحریک کے بعد ان میں وہ رواداری کی روح باقی نہیں رہی جس سے کام لے کر وہ عملی زندگی میں صدیوں سے ایک دوسرے کو انگیز کر جانے کے ..... عادی تھے چنانچہ اکثریت

والی قوم کا یہی وہ عدم رواداری انہ انداز ہے جسے ہندو ذہنیت میں انقلاب سے تعبیر کیا جاتا ہے اور ہندو ذہنیت میں اسی انقلاب کے باعث ملک کی اقلیتوں کو اپنی انفرادیت کا احساس ہوا جس نے اپنے وجود کی حفاظت کی خاطر بالآخر انھیں اس تحریک کے مقابل صف آرا کر دیا۔

اس وقت یہ تحریک براہ راست برطانوی ہند اور دیسی ریاستوں کی سیاست سے دست و گریباں ہے، کامیابی نمایاں طریقہ پر اگرچہ ابھی تک اسے کہیں حاصل نہیں ہوئی ہے لیکن انقلابی ذہنیت چونکہ نتائج سے بے پروا پوری شدت سے مصروف عمل ہے اس لئے ملک امن و سکون سے محروم ایک ایسے دور انقلاب و انتشار سے گذر رہا ہے کہ اس عالم میں ملک کے مستقبل کے متعلق کوئی صحیح اور صاف رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ لیکن قرینہ یہ ہے کہ اس دوطرفہ لڑائی میں اس تحریک کو کامیابی حاصل نہ ہو سکے گی اس لئے کہ ایک طرف اس کا مدمقابل برطانوی... سامراج ہے اور دوسری طرف ہندوستان کا قدیم طرز حکومت۔ بظاہر یہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف معلوم ہوتے ہیں لیکن فی الحقیقت یہ ایک دوسرے کے مددگار و معاون ہیں جہاں تک برطانوی سامراج سے مقابلہ کا تعلق ہے یہ تحریک پوری سرگرمی سے مصروف عمل آتی رہتی ہے لیکن ہندوستانی ریاستوں کے مقابلے میں وہ دم خم قائم نہیں رہتا۔ وجہ ظاہر ہے ہندوستانی ذہنیت میں بدیسی حکومت سے مقابلہ قوم پرستی کا اصلی شعار ہے لیکن ریاستی طرز حکومت کے مقابلے میں اس کا وہی وزن نہیں ہے۔ ریاستیں طرز حکومت کے اعتبار سے چاہے کتنی ہی ناقص ہوں۔ "بدیسی حکومت" کی تعریف میں بہرحال داخل نہیں ہو سکتیں اور ان سے مقابلہ کی صورت میں "فرقہ پرستی" کا الزام اس جامعیت سے

معلوم ہوتا ہے کہ مٹائے نہیں مٹ سکتا۔

چنانچہ اسی حقیقت کے پیش نظر گاندھی جی نے ابتدا ہی میں ریاستوں کی اندرونی سیاست میں عدم مداخلت کا اعلان کیا تھا اور ان کی جماعت کانگریس نے بھی اس اصول کو تسلیم کر لیا تھا کچھ دنوں تو بیشک اس پر عمل ہوتا رہا لیکن پردنشل اٹانمی' یعنی صوبائی حکومتوں کے قیام کے بعد سے ریاستوں میں مداخلت کی بحث پھر چھڑی' اس لئے کہ نہ فیڈریشن کا مسئلہ اس کے بغیر حل ہو سکتا تھا اور نہ برطانوی سامراج سے اچھی طرح مقابلہ کیا جا سکتا تھا۔

کانگریس نے اپنا اصول تو نہ بدلا۔ البتہ ریاستوں میں کانگریس کے افراد کو ستیہ گرہ کرنے کی اجازت دیدی۔ مختلف ریاستوں میں یکے بادیگرے اس تحریک کا تجربہ ہوا اور بلا کسی استثنا رکے ہر جگہ اس کو ناکامی ہوئی سب سے آخری مورچہ اس تحریک کا راجکوٹ تھا جو گاندھی جی کے مددگار خاص نے لگایا تھا اس مورچہ پر گاندھی جی نے بہ نفس نفیس ستیہ گرہ کی اور اہنسا کے اصول کی پیروی کرتے ہوئے برت رکھا اور اعلان کر دیا کہ جب تک راجکوٹ کا مسئلہ یکسونہ ہوگا وہ برت نہ توڑیں گے۔ برت چونکہ گاندھی جی کا نہایت کامیاب ہتھیار رہا کرتا ہے اس لئے خیال یہ تھا کہ راجکوٹ کا معاملہ ریاستی مسئلہ کو سلجھانے میں بطور نظیر کے کام دے گا۔ لیکن گاندھی جی کا برت جواب تک کئی معرکے سر کر چکا تھا راجکوٹ جیسی بے حقیقت ریاست کو متاثر نہ کر سکا۔

گاندھی جی کی خواہش پر برطانوی ہند نے مداخلت کی معاملہ قانونی انداز پر فیصل ہوا لیکن ستم ظریفی دیکھئے کہ گاندھی جی اس ریاست سے قانونی فیصلہ کی پابندی بھی نہ کرا سکے بلکہ خود اپنی طرف سے اس فیصلہ کو کالعدم قرار دیتے ہوئے اپنی شکست کا اعتراف کر لیا۔

گاندھی جی کی یہ اخلاقی جرأت بلاشبہ قابل صد تحسین ہے کہ جس تحریک کو انھوں نے کمزور قوموں کا واحد ہتھیار قرار دیا تھا اس کی شکست کو علانیہ تسلیم کر لیا اور نہ صرف راجکوٹ کے معاملے میں بلکہ اعلان کر دیا کہ ہندوستان کی ساری ریاستوں میں تحریک ستیہ گرہ غیر معین مدت تک کیلئے بند کر دی جائے۔ اس قدر اہم تحریک کا یہ حشر قابل افسوس ضرور ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ گاندھی جی کا فیصلہ انتہائی دور اندیشی اور عاقبت بینی پر مبنی ہے جس نے کانگریس اور ہندوؤں کے وقار کو صرف ایک قدم پیچھے ہٹ کر تباہ ہونے سے بچا لیا وہ مسئلہ ہی دراصل بہت پیچیدہ ہے جسے کانگرس اس وقت حل کرنا چاہتی ہے ایک صورت تو اس کی یہ ہے کہ برطانوی سامراج سے کامیاب مقابلہ کے لئے دیسی ریاستوں کو کمزور کرنا ضروری ہے اور دوسری صورت یہ ہے کہ جب تک برطانوی سامراج کمزور نہ ہوگا دیسی ریاستوں سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا اور کانگریس اب تک یہ تصفیہ نہیں کر سکی ہے کہ اس دورخی صورت کا مقابلہ کس انداز سے کیا جائے۔

راجکوٹ کی شکست کے بعد گاندھی جی نے مسلسل کئی بیانوں میں "اہنسا" کے عقیدے پر روشنی ڈالی ہے اور ان اسباب کا جائزہ لیا ہے جن کے باعث راجکوٹ ستیہ گرہ بالکل ناکام رہا ان میں سب سے اہم سبب یہ بتایا ہے کہ جس اصول پر راجکوٹ میں ستیہ گرہ شروع ہوا تھا وہ "اہنسا" کے عقیدے کے مطابق نہیں تھا یعنی اس میں "جبر" کا پہلو تھا اور جب ستیہ گرہ میں جبر کا پہلو پیدا ہو جائے تو اس کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔

ستیہ گرہ کے اس فلسفے پر یہاں گفتگو کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی سمجھنے کی بات اس میں صرف اس قدر ہے کہ گاندھی جی جو ہندوستان بھر میں "اہنسا" کے "واحد عالم باعمل" اور تحریک ستیہ گرہ کے موجد ہیں برسوں کے ریاض کے

بعد بھی اپنے عمل کو اس عقیدے کی صحیح روسے مطابق نہ کر سکے تو ہندو عوام سے کیا توقع ہو سکتی ہے کہ وہ اس فلسفے کو صحیح طور پر سمجھ سکیں گے اور اس پر عمل بھی کر سکیں گے ؟

عوام کے آگے ایسا اونچا معیاری عقیدہ پیش کرنا جو سراسر ان کے احاطہ سمجھ سے باہر ہو ستم ظریفی ہے اور پھر ان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ راہ راست پر بھی قائم رہیں گے انتہائی سادہ لوحی ہے جس عقیدے کو عوام کے دماغ ہضم نہ کر سکیں اس کا واحد نتیجہ گمراہی ہے اور اس وقت ہندو عوام اس تحریک کی بدولت درحقیقت اسی منزل میں ہیں ۔

ہندوستانی ریاستوں میں ستیہ گرہ کی تحریک کو غیر معین مدت تک کے لئے بند کرتے ہوئے گاندھی جی نے کانگریس کو یہ " مشورہ " دیا ہے کہ وہ اپنے کم سے کم مطالبات ریاستی حکومتوں کے آگے پیش کریں اور یہ مطالبات محض گفت شنید سے حاصل کریں۔ قطع نظر اس امر کے کہ گاندھی جی کا " مشورہ " سیاسی حیثیت سے کس قدر مناسب اور مبنی بر مصلحت ہے یہ " مشورہ " بذات خود تحریک ستیہ گرہ کی ناکامی کا دوسرا کھلا ہوا ثبوت ہے جس میں ہندو عوام کو گمراہی سے بچانے کی کوشش کی گئی ہے بہ الفاظ دیگر انھیں یہ نصیحت کی گئی ہے کہ کسی " زعم باطل " میں مبتلا ہو کر ایسے ناممکن مطالبات ریاستوں کے آگے پیش نہ کر بیٹھو جن کے تم اہل نہ ثابت ہو یا جن کے لئے تم قربانیاں نہ دے سکو ۔

اس نصیحت میں یقیناً ہندو عوام کے لئے عبرت اور بصیرت کا ایک دفتر موجود ہے لیکن ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ یہ نصیحت بعد از وقت کی گئی ہے یعنی اس وقت جب ہندو ذہنیت میں فرقہ وار برتری کے جراثیم اچھی طرح

پرورش پاچکے۔ عدم رواداری اور اشتعال انگیزی ان کے خمیر میں داخل ہو چکی ہے۔ جداگانہ قومیت کی تعمیر کے خبط میں ان کے دماغوں نے اپنا توازن کھو دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گاندھی جی کی اس نصیحت کے بعد بھی بعض انتہا پسند ہندو دماغوں نے کروٹ لی اور انھیں محسوس ہونے لگا کہ اب گاندھی جی کے بجائے ایک انقلاب پسند اور جوشیلے لیڈر کی ضرورت ہے۔ دل کی بات کو زبان پر آتے ہوئے دیر نہ لگی اگرچہ تری پوری کانگریس کے اجلاس میں اس کے دبانے کی بہت کوشش کی گئی اور اس میں گاندھی جی کے حامیوں کو ایک حد تک کامیابی بھی ہوئی لیکن بات بڑھ چکی تھی زیادہ دنوں دب نہ سکی نتیجہ یہ ہوا کہ کانگریس میں پھوٹ پڑی اور ایسی پڑی کہ اس نے کانگریس کی قوت کو توڑ دیا۔

گاندھی جی کے اس بیس برس کے دور قیادت میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ انتہا پسندوں کو گاندھی جی کی سیاست سے اختلاف ہوا لیکن ان کی قیادت کبھی زیر بحث نہیں آئی اور وہ بلا اختلاف ہندوستان کے سیاسی رہنما تسلیم کئے جاتے رہے۔ بیس برس بعد آج یہ پہلا اتفاق ہے کہ ملک کے انتہا پسند طبقے نے علانیہ گاندھی جی کی قیادت کا جوا اپنے کندھے سے اتار پھینکا اور یہ سب کچھ اس تحریک کی ناکامی کے باعث ہوا جس کے یہ خود مصنف تھے اور جس نے قطع نظر اپنی ناکامیوں کے ملک میں سیاسی بیداری پیدا کرنے میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی تھی

انتہا پسندوں کے جواب میں گاندھی جی کے حامیوں نے کانگریس کے دستور اساسی میں یہ ترمیم پیش کی ہے کہ آئندہ سے کانگریس کے اندر سیاسی گروہ بندی یا پارٹی بازی کی اجازت نہ دی جائے یہ گویا انتہا پسندوں کو جنھوں نے اپنے لئے کانگریس کے "بائیں بازو" کا نام تجویز کیا ہے اور اس پارٹی کو جو "فارورڈ بلاک" کے نام سے گاندھی جی کو سیاست سے مقابلہ کے لئے کام کر

کے اندر قائم ہوئی تھی کھلا ہوا چیلنج تھا کہ یا تو پارٹی بندی سے دست بردار ہو کر کانگریس کی اکثریت کے فیصلہ کے آگے سر تسلیم خم کر دیں ورنہ کانگریس سے نکل جائیں یہ تجویز بہت سخت اور کافی خطرناک تھی اگر کانگریس کے کھلے اجلاس نے اس کو منظور کر لیا ہوتا تو یقیناً کانگریس کے ٹکڑے اڑ جاتے اور اس کی نمائندہ حیثیت جو اس وقت بھی مشتبہ تھی ختم ہو کر رہ جاتی۔ اس لئے کہ انتہا پسند طبقہ کے تیور بتاتے تھے کہ وہ اس چیلنج کو قبول کر لیگا اور کانگریس سے باہر آ کر خود کانگریس کے مقابل صف آرا ہو جائے گا۔ کانگریس کے لئے اقلیتوں کا مقابلہ آسان ہے لیکن اپنے ہی سدھائے ہوئے آدمی سے مقابلہ مشکل ہے۔ یہی خیال تھا جس کے ماتحت گاندھی جی نے موتی لال نہرو اور سی آر داس آنجہانی کے مقابلہ میں ہار تسلیم کر لی تھی اور کانگریس کے دستور اساسی میں وہ دفعہ بڑھا دی تھی جس کو اس وقت بدلنے کی تجویز ہے اور جس کی رو سے سوراج پارٹی کو کانگریس کے اندر ایک مستقل پارٹی کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔

گاندھی جی کی موجودہ سیاست پر بائیں بازو کی طرف سے جو اعتراضات ہوئے ہیں ان میں سب سے بڑا اور اصولی اعتراض یہ ہے کہ گاندھی جی کی حیثیت اس وقت بالکل ایک ڈکٹیٹر اعظم کی سی ہے جن کی نگرانی میں کانگریسی لیڈروں کی ایک چھوٹی سی جماعت، جمہور کی آواز اور خود کانگریس کے مختلف الخیال ممبروں سے مشورہ کئے بغیر ملک پر حکومت کر رہی ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ کانگریس کا نظام اب جمہوری نہیں رہا ہے۔ بلکہ آہستہ آہستہ فاشی ازم کی طرف جھکتا جا رہا ہے۔ اعتراض معقول اور وزنی ہے۔

گاندھی جی کی حیثیت اس وقت فی الحقیقت ایک مختار مطلق کی سی ہے اور ان کے گرد ایسے ہم رنگ حواریوں اور پرستاروں کا مجمع ہے جو انھیں اپنے حلقے سے باہر کی دنیا نہیں دیکھنے دیتا اور نہ اپنی رائے سے مختلف رائے سننے کا روادار ہوتا ہے اسی مطلق العنانی کے باعث کانگریس میں یہ پھوٹ پڑی۔ اور وہ افراد جو کانگریس کو جمہوری اصول کے تابع دیکھنا چاہتے ہیں اس مستبدانہ اصول کے خلاف علانیہ بے زاری کا اظہار کرنے لگے۔

یہ بلاشبہ صحیح ہے کہ ہر سیاسی جماعت میں کام کرنے والے ہم خیال حضرات کی ایک مخصوص پارٹی ہوا کرتی ہے۔ لیکن جو جماعت جمہوری اصولوں کے ماتحت عالم وجود میں آتی ہے اس میں مختلف الخیال افراد کے آرا اور مشوروں کی تحقیر نہیں کی جاتی اور نہ انھیں اپنے یقین اور ایمان کے خلاف اکثریت کی ہمنوائی کرنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے کانگریس اپنی جمہوری اصولوں کے ماتحت قائم ہوئی اور مدتوں ان کی پیروی کرتی رہی لیکن جب سے کانگریس کی نمائندہ حیثیت زیر بحث آئی اسی وقت سے اس کے نظام سیاست میں بھی تبدیلی ہوئی اور آج وہ جمہوریہ سے زیادہ ایک فاسسٹ جماعت ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ کانگریس پر ایک ایسی پارٹی کا قبضہ ہے جو اپنے سے مختلف الخیال افراد کو کانگریس میں بار دینا پسند نہیں کرتی یہی وجہ ہے کہ آج خود کانگریس کے اندر ایک ایسی جماعت قائم ہوگئی ہے جو گاندھی جی کی پالیسی پر احتساب کرنا اپنا سیاسی حق سمجھتی ہے۔

کانگریس کی اس پھوٹ کو گاندھی جی اپنی ذاتی شکست سے تعبیر

کرتے ہیں اور یہ حقیقت بھی ہے تقریباً بیس برس سے گاندھی جی کانگریس کی تنہا رہنمائی کر رہے ہیں ان کی تحریکیں کانگریس کی روح اور ان کی مخصوص حکمت عملی کانگریس کی اپنی حکمت عملی سمجھی جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ اس وقت کانگریس اور گاندھی جی بالکل ایک دوسرے میں ضم ہو کر رہ گئے ہیں نہ کانگریس سے گاندھی جی کو علیحدہ کیا جا سکتا ہے اور نہ گاندھی جی سے کانگریس جدا ہو سکتی ہے اس اعتبار سے ظاہر ہے کہ گاندھی جی کی شکست کانگریس کی شکست ہے اور کانگریس کی شکست گاندھی جی کی ذاتی شکست ہے۔

لیکن گاندھی جی کی اس ذاتی شکست کے یہ معنی نہیں کہ ان کی شخصیت میں اب وہ اثر نہیں رہا جو آج سے بیس برس پہلے تھا ان کی ذات آج بھی کانگریس کے ہر طبقہ کے لئے ویسی ہی با اثر اور محترم ہے جیسی آج سے پہلے تھی اس لئے کہ گاندھی جی ہندوؤں کے صرف سیاسی رہنما ہی نہیں ہیں جو ان کی سیاسی لغزشیں انھیں ملک کی نظروں میں گرا دیں وہ مذہبی پیشوا اور ایک نئے ہندو کلچر کے بانی بھی ہیں بلکہ ان کی یہی حیثیت زیادہ مسلم ہے[۵] اور اسی وجہ سے ان کی ذات ہر قسم کے اعتراضات اور نکتہ چینی سے بالاتر سمجھی جاتی ہے۔ گاندھی جی کا فلسفہ زندگی قدیم ویدک تعلیمات سے ماخوذ اور ہندو

---

[۵] ہم نے اس سے پہلے کانگریس کے جنرل سکریٹری مسٹر آچاریہ کرپلانی کے بیان کا بہت مختصر سا اقتباس کسی دوسرے صفحہ پر پیش کیا ہے۔ یہاں ہم اپنے دعوے کے ثبوت میں ان کے بیان کا ایک اور دلچسپ ٹکڑا نقل کرتے ہیں۔

کرپلانی جی فرماتے ہیں:-

"اب کانگریس صرف ایک ایسی سیاسی جماعت نہیں جو ملک کو پردیسی

عوام کی دماغی سطح سے بہت اونچا ہے اور ان کی سیرت ہند و نقطہ نظر سے
اس قدر بلند اخلاقی صفات سے مزین ہے کہ عوام کے لئے اس کی تقلید
ناممکن ہے۔

اس اعتبار سے گاندھی جی کی سیاست سے ملک کی مختلف جماعتوں بلکہ
خود کانگریس کے ایک طبقہ کو اختلاف ہے اور برابر ہوتا رہے گا اور آثار قرائن
سے پتہ چلتا ہے کہ آئندہ ان کی سیاست کا مقابلہ بھی کیا جائے گا اور یہ بھی
درست ہے کہ ان کی سیاسی تحریکوں کا ردعمل ایک مدت تک مستقبل کے ہندوستان
کو بے چین اور اپنے سیاسی مرتبہ کی طرف سے غیر مطمئن رکھے گا اور یہ بھی ہوگا
کہ اکثریت اور اقلیتوں کی کشمکش سے ملک میں ایک مدت تک خانہ جنگی قائم رہیگی

اقتدار سے آزاد کرنا چاہتی ہے بلکہ یہ ہماری معاشرت کی موجودہ
حیثیت کو بھی بالکل بدل ڈالنا چاہتی ہے اور اس کی بنیاد بالکل
نئے فلسفہ پر رکھنا چاہتی ہے جب تک گاندھی جی کا اثر کانگریس
پر غالب نہیں تھا اس وقت تک کانگریس کے لیڈروں نے
یہ طے کیا تھا کہ کانگریس کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ معاشرتی اصلاح
کے کاموں میں دخل دے وہ اسے بالکل سیاسی جماعت رکھنا
چاہتے تھے۔ لیکن گاندھی جی نے آکر اس اصول کو توڑ دیا انھوں
نے پرانے ڈاکٹروں کی تشخیص کو غلط قرار دیکر یہ بتلایا کہ ہماری
سیاسی غلامی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے ہم اپنی اخلاقی روحانی
اور معاشرتی زندگی سے جدا کر سکیں اس لئے ہماری سیاسی جدوجہد
کو معاشرتی، اخلاقی روحانی جدوجہد کے ساتھ وابستہ کرنیکی ضرورت ہے۔

اور ملک میں فرقہ وارمنافرت کی خلیج بڑھ جائے گی لیکن مستقبل کے ان سب اندیشوں اور احتمالات کے باوجود گاندھی جی کی شخصیت اسی طرح محترم اور ان کی ذات واجب التعظیم رہے گی اس لئے کہ انھوں نے ہند عوام کو ایک نئے نظریۂ زندگی سے روشناس کر دیا ان میں بیداری کی نئی روح پھونک دی ان کے حوصلوں اور ارادوں کو بلند کر دیا یہ تجربہ ہند و قوم کے لئے بالکل نیا ہے اور ہر نئے تجربہ میں ابتداً کمزوریاں بھی پائی جاتی ہیں لیکن تواتر عمل سے جب ان میں بصیرت بڑھے گی ان کی دماغی سطح اونچی ہوگی۔ اپنے ماحول سے اپنی عملی زندگی کو مطابق کرنے کا ان میں سلیقہ آجائے گا تو یہ کمزوریاں بھی دور ہو جائیں گی اور ان میں اپنے فعل اور عمل کی ذمہ داریوں کا احساس بھی پیدا ہو جائے گا۔ گاندھی جی کی تحریک بیداری کی قدرتی طور پر یہی ارتقائی منزل ہوسکتی ہے اور اسی منزل پر پہنچکر گاندھی جی کا نام اور ان کی شخصیت ہندو تاریخ میں زندہ جاوید کی حیثیت اختیار کرے گی۔

رئیس الاحرار مولانا محمد علی

سر سے پیر تک آزادی کامل کا مجسمہ بے حد دلیر اور نکتہ سنج مدبر۔ نہایت بے باک اور آتش بار مقرر، اسلام کا سرفروش سپاہی اور ملک کا بے ریا اور مخلص خادم!

یہ محمد علی ہیں جو صحیح معنوں میں ہندوستان میں سیاسی بیداری کے بانی سمجھے جاتے ہیں اور جن کا نام ہندوستان کی سیاسی کشمکش کی تاریخ میں ہمیشہ ادب و احترام اور محبت و عقیدت کے ساتھ لیا جاتا رہے گا۔

۱۸۷۸ء کے آخر میں رامپور میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد عبد العلی خاں ایک معزز عہدہ پر مامور تھے لیکن نو عمری ہی میں والد کا سایہ ان کے سر سے اٹھ گیا اور بی اماں مرحومہ کو ان کی اور ان کے دونوں بڑے بھائیوں کی تربیت اور تعلیم کا بار خود اٹھانا پڑا۔

ابتدائی تعلیم محمد علی نے بریلی ہائی اسکول میں پائی، اس کے بعد علی گڑھ میں داخل کر دئے گئے۔ ۱۸۹۶ء میں انھوں نے علی گڑھ سے بی اے کیا اور سول سروس کے لئے لندن روانہ ہو گئے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کو محمد علی سے کچھ اور کام لینا منظور تھا، یہ باوجود اپنی غیر معمولی ذہانت اور استثنائی قابلیت

کے سول سروس کے امتحان میں ناکام رہے ۔ اسی سال بی اماں مرحومہ نے
ان کی شادی کر دی، شادی کے دوسرے برس یہ پھر انگلستان گئے اور اکسفورڈ
سے انگریزی ادب میں آنرز کی ڈگری حاصل کی۔ تعلیم میں یہ اعزاز حاصل کرنے
کے بعد محمد علی جب ہندوستان واپس ہوئے تو رامپور میں انھیں افسر تعلیمات
کا عہدہ مل گیا، لیکن رامپور کی سازشی فضا محمد علی کو موافق نہ آئی اور انھوں
نے کچھ عرصے کے بعد اپنے عہدہ سے استعفیٰ دیدیا۔ رامپور سے علیحدہ ہوتے ہی
ریاست بڑودہ نے ان کو طلب کرلیا اور وہاں یہ محکمہ افیون کے سپرنٹنڈنٹ اور
کچھ دنوں بعد ضلع نوساری کے کمشنر ہو گئے ۔

محمد علی کو انگریزی ادب کا بڑا اچھا ذوق تھا اور یہ زمانہ طالب علمی ہی سے
انگریزی کے نہایت اچھے مضمون نگار مانے جاتے تھے ۔ عمر، علم اور تجربے کے
ساتھ ساتھ ان کی مضمون نگاری میں بھی پختگی اور کہنہ مشقی آتی گئی اور یہ شوق
ان کا اتنا بڑھا کہ دوران ملازمت میں بھی برابر جاری رہا اور وہ ادب سے
بڑھ کر سیاسیات میں اپنے جوہر دکھانے لگے بڑودہ کی ملازمت کے زمانہ
میں محمد علی ٹائمس آف انڈیا میں سیاسی مضامین لکھا کرتے تھے اور اخبار بین
طبقہ میں یہ مضامین بڑی قدر اور توجہ سے پڑھے جاتے تھے بڑودہ کاؤنسل
نے محمد علی کے اس شوق پر احتساب کرنا چاہا اوران سے خواہش کی کہ وہ کم
سے کم سیاسی رنگ کے مضامین نہ لکھا کریں لیکن محمد علی کاؤنسل کا یہ حکم ماننے
کے لئے تیار نہ ہوئے اور استعفیٰ دے کر اپنے عہدے سے علیحدہ ہوگئے
بڑودہ سے علیحدگی کے بعد نواب صاحب جاورہ نے محمد علی کو اپنے
ہاں کی وزارت پیش کی، اور بیگم صاحب بھوپال نے آپ کو چیف سکریٹری کا
عہدہ پیش کیا، لیکن محمد علی نے دونوں میں سے کوئی عہدہ قبول نہیں کیا

اور کلکتہ سے انگریزی کا ایک ہفتہ وار اخبار "کامریڈ" نکال لیا۔ یہ واقعہ ۱۹۱۱ء
کا ہے اور ہندوستان کی عملی سیاست میں یہی محمد علی کی بسم اللہ ہے۔ کامریڈ ہی
کے ذریعہ محمد علی کے اصلی جوہر کھلے اور وہ ایک ہی برس میں اس قدر مقبول ہوا
کہ ملک کے سربرآوردہ یورپین اور ہندوستانی اس کے خریداروں میں نظر آنے لگے
اس میں محمد علی کو انگریزی زبان پر اس درجہ قدرت حاصل تھی اور ان کا اسلوب
بیان اس قدر شستہ اور نادر ہوا کرتا تھا کہ بڑے بڑے انگریز مدبران کے
قلم کا لوہا ماننے لگے تھے اور یہی ان کے کامریڈ کی کامیابی کا راز تھا۔

کامریڈ کی ادارت کے ساتھ ساتھ محمد علی ملک کی عملی سیاست میں بھی
حصہ لینے لگے ۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان شروع ہوئی اور ترکوں کی مالی
امداد کے لئے ملک میں ہلال احمر کے نام سے انجمنیں قائم کی گئیں تو محمد علی
اور ان کے بڑے بھائی شوکت علی نے اس مقصد کے لئے ہندوستان کے
طول و عرض کا دورہ کیا اور اپنی آتش بیانی سے ہندوستان کے مسلمانوں
میں ترکوں کی امداد کا زبردست جوش اور ولولہ پیدا کر کے لاکھوں
روپے سے اور ڈاکٹر انصاری کی صدارت میں ایک طبی وفد ترکی بھیج
کر جنگ بلقان میں ترکوں کی امداد کی۔ اسی سلسلہ میں محمد علی نے کامریڈ میں
ترکوں کی ایک اپیل بھی چھاپی تھی، اس اپیل کا شائع ہونا تھا کہ حکومت
نے کامریڈ کی وہ ساری کاپیاں جن میں یہ اپیل چھپی تھی ضبط کر لیں اور
کامریڈ سے دو ہزار روپے کی ضمانت طلب کر لی۔ لیکن اس طلبی
ضمانت کا محمد علی پر کوئی اثر نہیں تھا۔ ضمانت انھوں نے داخل کر دی
مگر کامریڈ کی پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔

۱۹۱۳ء کے وسط میں کان پور میں سڑک کی خاطر جامع مسجد کا ایک حصہ شہید کر ڈالنے پر ہنگامہ ہو گیا، پہلے مسلمانوں نے رسمی طور پر احتجاج کئے لیکن یو پی کی حکومت میں جب شنوائی نہیں ہوئی تو مسلمان ایک انبوہ کی شکل میں خود ہی مسجد کے شہید شدہ حصوں کو تعمیر کرنے جمع ہوئے حکومت نے مجمع کو منتشر کرنے کے لئے گولیاں چلا دیں جس سے کئی سو مسلمان شہید ہو گئے اس ہنگامے نے سارے ہندوستان میں آگ لگا دی اور مسلمانوں میں بے پناہ جوش پیدا ہو گیا۔

محمد علی نے فوراً اس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے لیا پہلے انھوں نے گورنر یو پی سے اس معاملے کو رجوع کیا لیکن جب اس تک رسائی نہ ہوئی تو مسٹر ریمزے میکڈانلڈ کو لندن تار دیا کہ وہ پارلیمنٹ میں اس کے لئے کوشش کریں لیکن جب وہاں سے بھی ان کے تار کا جواب نہ ملا تو اکتوبر ۱۹۱۳ء کو سر وزیر حسن کے ساتھ خود لندن گئے اور سر جیمز لاٹوش سابق رکن مجلس وزیر ہند کی مدد سے اس قضیہ کو وزیر ہند تک پہنچایا وزیر ہند نے وائسرائے کو ہدایت کی کہ مسجد کے شہید شدہ حصے دوبارہ بنوا دئے جائیں محمد علی اپنے پہلے ہی مشن میں پوری طرح کامیاب رہے اور آخر دسمبر ۱۹۱۳ء کو ہندوستان واپس آئے جہاں مسلمانوں نے ان کا نہایت پر جوش خیر مقدم کیا یہ محمد علی کا پہلا پبلک استقبال تھا۔

اس دوران میں حکومت ہند کا پایہ تخت کلکتے سے دہلی منتقل ہو گیا اور محمد علی بھی کامریڈ کا دفتر دہلی لے آئے یہاں آن کر حکیم اجمل خاں کے مشورے سے کامریڈ کے ساتھ ایک اردو اخبار ہمدرد بھی جاری کر دیا لیکن ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم شروع ہوئی تو لندن ٹائمز کے ایک اشتعال انگیز مضمون کے جواب

میں محمد علی نے "چوائس آف دی ٹرکس" کے نام سے کامریڈ کے ۲۲ کالموں میں ایک معرکہ آرا مضمون لکھا اسی مضمون کو وجہ بنا کر حکومت نے کامریڈ کی ضمانت ضبط کر لی محمد علی نے اس حکم کی اپیل کی مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا اور کامریڈ بے وقت موت کے آغوش میں چلا گیا۔

ضبطیٔ ضمانت کے ساتھ محمد علی کی صحت خراب ہو گئی تھی چنانچہ ڈاکٹروں کے مشورے سے آپ آرام لینے رامپور آ گئے یہاں نواب صاحب رامپور کے حکم سے آپ ۴۸ گھنٹے نظر بند رہے۔ اجمیر جانے کے لئے واپس دہلی آئے تو دوسرے ہی دن ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ دہلی کے حکم سے مہرولی میں نظر بند کر دیئے گئے۔ نظر بندی کے احکام میں جرم کی کوئی صراحت نہیں تھی مہرولی میں محمد علی کے ساتھ ان کے بڑے بھائی شوکت علی بھی نظر بند کر دیئے گئے لیکن مہرولی میں چونکہ محمد علی سے ملاقات کے لئے دلی کے مسلمانوں کا ہجوم لگا رہتا تھا اس لئے ان دونوں بھائیوں کو حکومت نے لینیڈ ون بھیج دیا اور کچھ ہی دنوں بعد انھیں لینیڈ ون سے چھنڈواڑہ جانا پڑا جہاں ایک غیر معین مدت کے لئے وہ نظر بند رہے۔

سنہ ۱۹۱۷ء میں محمد علی مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے لیکن حکومت نے چونکہ ان کو رہا کرنے سے انکار کر دیا اس لئے بی اماں مرحومہ کو لیگ کی صدارت کرنی پڑی اسی سال کانگریس کے سالانہ اجلاس میں تلک آنجہانی نے علی برادران کی رہائی کے لئے ایک قرارداد منظور کرائی مگر وہ بھی بے اثر ہوئی ملک میں جگہ جگہ محمد علی اور شوکت علی کی رہائی کے لئے مظاہرے ہوئے مگران کا بھی بظاہر کوئی اثر نہ پڑا البتہ اس قدر ضرور ہوا کہ سنہ ۱۹۱۷ء کے آخیر میں حکومت کا ایک سی آئی ڈی افسر چھنڈواڑہ پہنچا اور اس نے ان دونوں

بھائیوں کو بتایا کہ اگر وہ ایک عہد نامہ پر دستخط کر دیں گے تو انھیں رہا کر دیا جائے گا۔ وہ عہد نامہ یہ تھا کہ دوران جنگ میں وہ دونوں بھائی ایسی بات نہ کریں گے۔ جس سے ملک معظم کے دشمنوں کو تقویت پہنچے محمد علی اور شوکت علی نے اس پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا اور ان کی رہائی کا معاملہ پھر کھٹائی میں پڑ گیا۔

۱۹۱۸ء میں علی بھائیوں کی تحقیقات کے لئے ایک شاہی کمیشن مقرر ہوا۔ اس کمیشن نے ان دونوں کے بیان لئے لیکن رہائی کی سفارش اس نے بھی نہیں کی۔

اسی سال چھنڈواڑے کی مسجد میں محمد علی نے مسلمانوں کے آگے ایک زبردست تقریر کر ڈالی حکومت نے اسی تقریر کو وجہ بنا کر انھیں چھنڈواڑ میں گرفتار کر لیا اور ان پر مقدمہ چلائے بغیر انھیں بیتول جیل بھیجدیا گویا نظر بندی کے زمانہ میں جو کچھ تھوڑی بہت آزادی حاصل تھی وہ بھی چھین لی گئی اور بالکل قیدیوں کی طرح زندگی شروع ہو گئی ۱۹۱۹ء کا پورا سال محمد علی اور شوکت علی کا بیتول جیل میں گذرا لیکن دسمبر ۱۹۱۹ء میں یہ دونوں بھائی جو نظربندی اور اسیری میں پورے پانچ برس گذار چکے تھے دفعتاً اور بلا کسی شرط کے رہا کر دئے گئے۔ اس سال کانگریس، خلافت کانفرنس اور مسلم لیگ کے مشترکہ اجلاس امرتسر میں ہو رہے تھے جہاں جلیانوالہ باغ کا حادثہ پیش آیا تھا محمد علی اور ان کے ساتھ شوکت علی بیتول جیل سے رہا ہوتے ہی سیدھے امرتسر پہنچے اور ذرا بھی آرام لئے بغیر قوم اور ملک کی خدمت کے لئے کمربستہ ہو گئے امرتسر میں تو ان دونوں بھائیوں کا جیسا استقبال ہوا وہ تو ہوا لیکن دہلی میں جس شان اور انداز سے ان کا خیر مقدم کیا گیا اس کی نظیر شاید

شاہان مغلیہ کے عہد میں بھی نہیں مل سکتی ۔

سن ۱۹۲۰ء میں خلافت کا ایک وفد حکومت برطانیہ کو ترکی کے ساتھ اپنے وعدے یاد دلانے محمد علی کی قیادت میں لندن بھیجا گیا لیکن اس وفد کو اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی اسی ناکامی کو وجہ بنا کر محمد علی نے گاندھی جی کے ساتھ حکومت برطانیہ سے "مقاطعہ" والی تحریک میں تعاون کیا اور پورے جوش اور سرگرمی سے حکومت کے خلاف صف آرا ہو گئے ۔

گاندھی جی اور محمد علی کے تعاون کا یہ زمانہ اپنے نتائج ما بعد کے اعتبار بے انتہا ہنگامہ خیز ہے اس لئے کہ تحریک آزادی کی بنیاد فی الحقیقت اسی تعاون کے بعد پڑتی ہے اور سارے ملک میں ایسی زبردست سیاسی بیداری پیدا ہو جاتی ہے کہ حکومت کے لئے اس کا مقابلہ مشکل ہو جاتا ہے مقاطعہ والی تحریک میں خطابات کی واپسی، عدالتوں اور کاونسلوں کے بائیکاٹ کے ساتھ ساتھ اسکولوں اور کالجوں کا مقاطعہ بھی شامل تھا۔

محمد علی اپنے چند رفیقوں ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں کے ساتھ علی گڑھ آئے اور علی گڑھ کے ارباب حل و عقد کے سامنے انھوں نے یہ تجویز پیش کی کہ وہ حکومت کا دامن چھوڑ کر قوم کی پناہ میں آ جائیں۔ لیکن محمد علی کی یہ تجویز علی گڑھ کورٹ نے منظور نہیں کی ۔ محمد علی نے کورٹ کے اس فیصلہ کے بعد براہ راست طالب علموں کو مخاطب کیا اور انھیں اس پر آمادہ کیا کہ اسلام اور وطن کی خدمت کے لئے وہ تعلیم کو خیر باد کہہ کر قومی جنگ میں شریک ہو جائیں ۔ طلبہ پر محمد علی کی تقریر کا کافی اثر ہوا اور سیکڑوں طالب علموں نے جلسہ ہی میں اعلان کر دیا کہ وہ کالج چھوڑ دیں گے ۔ طلبہ کے اس فیصلہ سے

علی گڑھ کالج کی پر سکون زندگی میں ایک طوفان سا آگیا اور منتظمین کالج کو طوفان فرد ہونے تک کچھ دنوں کے لیے کالج بند کرنا پڑا۔

علی گڑھ کالج کے اس ہنگامہ کے بعد محمد علی نے قومی لائنوں پر ایک اور کالج قائم کیا جس کا نام "جامعہ ملیہ اسلامیہ" رکھا گیا اور اس معاملے میں محمد علی کے سب رفیقوں نے ان کا ساتھ دیا۔

محمد علی نے علی گڑھ کالج کے طالب علموں میں منتظمین کے خلاف بغاوت پھیلا کر جس انداز سے اس اسلامی ادارے کو نقصان پہنچایا تھا اس پر بعض لوگوں کو سخت اعتراض ہوا اور اسی بنا پر یہ بحث چھڑ گئی کہ سیاست میں تعلیم ختم کرنے سے پہلے طالب علموں کو حصہ لینا چاہیے یا نہیں یہ ایک لمبی اور تکلیف دہ بحث تھی جو مدتوں چھڑی رہی اور طرفین سے اس پر بہت کچھ کہا گیا لیکن اطمینان بخش انداز پر اس بحث کا فیصلہ نہ ہو سکا۔

معترضین کو محمد علی سے دراصل شکایت یہ تھی کہ اگر محمد علی قومی لائنوں پر کوئی کالج قائم کرنا چاہتے تھے تو علی گڑھ یونیورسٹی کو نقصان پہنچائے بغیر بھی ایسا کر سکتے تھے علی گڑھ کو حکومت سے چاہے کتنی ہی امداد کیوں نہ ملتی ہو وہ بہرحال ایک مسلم ادارہ تعلیم ہے جس کے تباہ کر ڈالنے کا خیال ہرگز مستحسن نہیں قرار دیا جا سکتا اور اس سلسلہ میں ہندو یونیورسٹی بنارس کی مثال پیش کی جاتی تھی جہاں کے ارباب حل و عقد نے گاندھی جی کے بائیکاٹ والی تحریک کا اپنی یونیورسٹی پر مطلق اثر نہ ہونے دیا اور نہ ہندوؤں کے قوم پرست لیڈروں نے ہندو یونیورسٹی کے منتظمین کے اس فیصلہ کے خلاف وہ انداز اختیار کیا جو محمد علی نے علی گڑھ میں جائز رکھا تھا۔ بہرحال صحیح یا غلط محمد علی نے علی گڈھ کے بائیکاٹ کی تحریک ضرور چلائی اور اس

کے جواب میں "جامعہ ملیہ اسلامیہ" بھی قائم کر ڈالا جو اس وقت دہلی میں خاصی کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے اور چونکہ علی گڑھ یونیورسٹی پر بھی اب محمد علی کی تحریک کا کوئی اثر نہیں رہا ہے اس لئے ان کے اس اقدام پر اس وقت احتساب بے سود ہے' بے چینی اور ہنگاموں کے زمانے میں ایسی بہت سی تحریکیں خواہ مخواہ پیدا ہو جاتی ہیں جن کی صحت نہایت مشتبہ ہوتی اصل چیز قائد تحریک کی نیت ہے اور ہم بلا خوف تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس معاملہ میں محمد علی کی نیت بالکل نیک تھی۔

گاندھی جی اور محمد علی کا اتحاد در اصل ہندو مسلم اتحاد تھا ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۲ء تک ہندو مسلم اتحاد کے جو روح پرور نظارے ہندوستان میں دکھائی دیئے وہ اسی اتحاد کی برکت تھی' لیکن یہ اتحاد کچھ زیادہ پائدار ثابت نہیں ہوا اور بہت جلد آپس کی غلط فہمیوں نے ہندوستان کی اس کیفیت اور وجد آور فضا کو مکدر کر دیا۔

۱۹۲۱ء میں محمد علی نے کراچی خلافت کانفرنس کی صدارت کی اس اجلاس میں ایک تجویز منظور ہوئی کہ اسلام کے دشمنوں کی اعانت اور خدمت مذہبا حرام ہے یہ تجویز کیا تھی ایک فتویٰ تھا جس پر علماء دین کے بھی دستخط تھے اور سیاسی لیڈروں کے بھی۔ اس تجویز کا پاس ہونا تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں عام بے چینی پیدا ہو گئی اور حکومت کی نوکریاں ناجائز قرار دی جانے لگیں۔

اسی تجویز کو وجہ قرار دے کر حکومت نے محمد علی کو گرفتار کر لیا' ان کے ساتھ شوکت علی' مولانا عبدالباری' ڈاکٹر کچلو' پیر مجاہد اور سوامی شنکر اچاریہ بھی پکڑے گئے۔ کراچی میں ان پر مقدمہ چلا اور محمد علی کو حکومت کے خلاف بغاوت

پھیلانے کے جرم میں دو سال کی سزا سنا دی گئی۔

دو سال کی سزا بھگت کر اگست ۱۹۲۳ء میں محمد علی جیل سے باہر آئے اور اسی سال ان کی قومی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کانگریس کی صدارت کے لئے ان کا نام پیش کیا گیا۔

۱۹۲۴ء محمد علی کی صدارت کا سال ہے۔ لیکن نہایت پر آشوب اور ہنگامہ خیز، حکومت سے ترک تعاون والی تحریک کا ردعمل شروع ہو چکا تھا ہندو مسلمان میں غلط فہمیاں پیدا ہوئیں اور برس بھر پہلے ان دونوں قوموں میں جو اتحاد تھا وہ رخصت ہوا۔ شردھانند جیل سے معافی مانگ کر رہا ہوئے اور شدھی کی فرقہ وار تحریک شروع کر دی، پنڈت مالویہ نے پنجاب اور یوپی کے ہندوؤں کو سنگھٹن کی تلقین شروع کر دی اس کے جواب میں مسلمان کی طرف سے تبلیغ اور تنظیم کی تحریکیں شروع ہوئیں اور اچھے خاصے دو مقابل کے اکھاڑے قائم ہو گئے۔ ان اکھاڑوں کا نتیجہ بھی بہت جلد نکل آیا، جگہ جگہ ہندو مسلم فساد ہوئے اور اتحاد و اتفاق کا خیال بھی حرام سمجھا جانے لگا۔

ان فرقہ وار ہنگاموں کے دوران میں مسلم قوم پرور لیڈروں کی پوزیشن جن میں محمد علی بھی شامل تھے عجیب تھی، یہ قوم پرور لیڈر تو اپنے رجعت پسند مسلمان بھائیوں سے دست و گریبان تھے اور ان کے خلاف انھوں نے پوری قوت سے جنگ شروع کر دی تھی لیکن ہندوؤں کے قوم پرست لیڈر اپنے تاریک خیال مہا سبھائی ہندوؤں کے خلاف ایک لفظ بھی منھ سے نکالنے کو تیار نہیں تھے بلکہ ایسے شواہد موجود ہیں کہ کانگریس کے یہ نام نہاد ہندو لیڈر مہا سبھائیوں کی مفسدہ پردازیوں اور فرقہ وارانہ تحریکوں میں ان کی اخلاقی امداد بھی کرتے رہے تھے۔

اسی مشاہدے نے جو تواتر کی حد تک پہنچ چکا تھا، مسلم قوم پرور لیڈروں کو بددل کرنا شروع کیا اور وہ ایک ایک کر کے کانگریس سے علیحدہ ہونے لگے۔

۱۹۲۵ء کے وسط میں ایک خالص اسلامی مسئلہ زیر بحث آگیا حجاز پر ابن سعود کا قبضہ مکمل ہو چکا تھا اور اس قبضہ کے دوران میں نجدیوں کی... بے اعتدالیوں کے جو افسانے ہندوستانیوں کے کان تک پہنچے تھے انھوں نے ہندوستان کے سنی مسلمانوں کو بے چین کر رکھا تھا، اسی کے ساتھ حجاز کے مستقبل کا سوال تھا، ابن سعود نے اعلان کیا تھا کہ اس کا تصفیہ "موتمر اسلامی" کے ہاتھ میں ہوگا۔ چنانچہ ہندوستانیوں کو بےچینی سے موتمر اسلامی کا انتظار تھا۔

۱۹۲۶ء میں مکہ میں موتمر اسلامی کا اعلان ہوا محمد علی خلافت کے وفد کے ساتھ اس موتمر میں شامل ہونے مکہ گئے یہاں انھوں نے قدیم عمارتوں اور مقابر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا جنھیں ابن سعود کے آدمیوں نے منہدم کر دیا تھا اور ابن سعود کے اس جابرانہ نظم ونسق کا بھی مطالعہ کیا جو اس نے حجاز میں جاری کر رکھا تھا۔ محمد علی حجاز مقدس میں ایک جمہوری نظام حکومت کی اسکیم لیکر موتمر میں گئے تھے مگر وہاں جاکر انھیں محسوس ہوا کہ یہ موتمر برائے نام ہے اور محض اس لیے طلب کی گئی ہے کہ ابن سعود کی شان میں فتح حجاز کے متعلق سپاسنامہ پیش کرے محمد علی اس انداز سے بہت بددل ہوئے لیکن موتمر میں ان کی ایک نہ چلی وہ ناکام ہندوستان واپس آئے اور یہاں آنکر انھوں نے ابن سعود کی پوری شدت کے ساتھ مخالفت شروع کر دی۔

اس موقع پر یہ اور بتادینا ضروری ہے کہ ابتدا میں محمد علی، شریف حسین کی بداعمالیوں کے باعث اس کے مخالف تھے اور ابن سعود نے چونکہ مقامات مقدسہ پر حکومت جمہوری کے قیام کا اعلان کیا تھا۔ اس لیے اس کے طرفدار

ہوگئے تھے لیکن ان بناد موتمر کی ناکامی اور ابن سعود کے مستبدانہ طرز حکومت کا مشاہدہ کرنے کے بعد محمد علی اسی شدت سے اس کے مخالف ہو گئے جس شدت سے کبھی اس کی حمایت کی تھی۔ اس ردعمل کا اثر یہ ہوا کہ خود مسلمانوں میں ایک طبقہ محمد علی کی اس روش پر معترض ہوا اور اس اعتراض کے ساتھ خلافت کمیٹی کے غبن کا مسئلہ بھی اٹھایا گیا اور یہ آپس کا اختلاف اتنا بڑھا کہ اس کے آگے مسلمانوں کے لئے ہندوستان کے دوسرے مسائل میں دلچسپی باقی نہیں رہی اسی دوران میں یعنی مئی ۱۹۲۶ء میں خلافت کا اسپشل اجلاس ہوا اس میں ہندو قوم پرستوں کے خلاف غم و غصہ کا اظہار کیا گیا کہ وہ اپنے مہا سبھائی عنصر کی مذمت نہیں کرتے جس سے ملک کی فضا مکدر ہوتی جا رہی ہے اس کانفرنس کے بعد مسلم قوم پرور لیڈر کانگریس سے علانیہ کشیدہ نظر آنے لگے انہی لیڈروں میں محمد علی بھی تھے۔

محمد علی کانگریس کے مہا سبھائی ممبروں کی ذہنیت سے برداشتہ خاطر ضرور رہنے لگے تھے لیکن ابھی انہوں نے کانگریس سے اپنا رشتہ نہیں توڑا تھا بلکہ برابر اس کوشش میں لگے رہے کہ کسی نہ کسی طرح ایک دفعہ پھر ہندو مسلم اتحاد ہو جائے چنانچہ محمد علی کی سعی سے کئی "یونیٹی کانفرنسیں" ہوئیں مگر ناکام رہیں ۱۹۲۸ء میں آل پارٹیز کانفرنس" کے نام سے اتحاد کی ایک اور کوشش ہوئی لیکن وہ بھی ناکام رہی جب یہ کوششیں ناکام رہیں تو محمد علی نے مسلمانوں کی سب جماعتوں کو متحد کرنے کی کوشش کی تاکہ یہ سب متحد ہو کر اپنا مطالبہ کانگریس سے منوائیں چنانچہ ۱۹۲۷ء میں اسمبلی کے زمانہ میں مسلم لیگ کا اجلاس دلی میں طلب کیا۔ اور مسٹر جناح کی شرکت سے وہ مطالبے اس اجلاس میں پیش

کئے جو مسلمانوں کے سیاسی حقوق اور مطالبات کے سلسلہ میں بطور بنیاد کام دے سکتے ہیں۔ ان نکات کو سب مسلم جماعتوں نے تسلیم کر لیا اور محمد علی نے مسلم لیگ کی منظوری کے بعد ان کو کانگریس کے روشن خیال طبقے سے بھی منظور کرا لیا۔ اسی اثنا میں انگلستان کی مزدور حکومت کی طرف سے "سائمن کمیشن" ہندوستان بھیجا گیا کہ وہ ملک کے حالات کا مطالعہ کر کے ہندوستان کے لئے ایک دستور اساسی کی سفارش کرے۔ کانگریس نے اس کمیشن کا بائیکاٹ کر دیا اور مسلمانوں کا قوم پرور طبقہ بھی اس مسئلہ میں کانگریس کے ساتھ ہو گیا۔ لیکن مسلمانوں کے حکومت پرست طبقہ نے اس کی حمایت کا اعلان کر دیا اس طبقہ کے لیڈر سر محمد شفیع تھے اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس سال مسلم لیگ کا اجلاس دو مقامات پر ہوا۔ ایک لاہور میں جس کے صدر سر محمد شفیع تھے ایک کلکتہ میں جہاں محمد علی جناح نے صدارت کی۔ کلکتہ والے اجلاس میں دہلی کی تجاویز کا اعادہ کیا گیا اور محمد علی کی تجویز کے مطابق سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کر دیا گیا۔ قوم پرور مسلمانوں کے اس طرز عمل سے کانگریس کے ساتھ مسلمانوں کا اختلاف بڑھنے نہ پایا اور فضا کسی قدر درست ہو گئی لیکن بہت دنوں تک یہ کیفیت باقی نہیں رہی۔

حکومت برطانیہ کے چیلنج کے جواب میں کانگریس نے ہندوستان کا دستور اساسی مرتب کرنے کے لئے پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں کانگریسی ممبروں کی ایک سب کمیٹی بنائی جس نے ہندوستانی دستور کا خاکہ مرتب کر کے کانگریس میں پیش کر دیا۔ یہ خاکہ نہرو رپورٹ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے یہی وہ رپورٹ ہے جس کے کنونشن میں منظور ہونیکے بعد مسلمانوں کے دوسرے لیڈروں کے ساتھ محمد علی نے بھی آل انڈیا کانگریس سے اپنی بے تعلقی کا اعلان کر دیا۔

نہرو رپورٹ جس وقت کانگریس کے آگے پیش ہوئی محمد علی علاج کے لئے یورپ گئے ہوئے تھے لیکن اس خبر کو سن کر وہ فوراً ہندوستان آئے اور انھوں نے علی الاعلان اس رپورٹ کی مخالفت کی۔

نہرو رپورٹ پر محمد علی کو دو بنیادی اعتراض تھے ایک یہ کہ رپورٹ کی بنیاد کانگریس کی منظورہ قرار داد "آزادئ کامل" کے نصب العین پر نہیں رکھی گئی بلکہ یہ ڈومینین اسٹیٹس کا غیر مکمل سا خاکہ ہے۔ دوسرا اعتراض یہ تھا کہ اس میں مسلمانوں کے ان سیاسی مطالبات کا تشفی بخش طریقہ پر حل نہیں پیش کیا گیا جو دہلی کی تجاویز میں صراحت کے ساتھ مسلمانوں کی ساری سیاسی جماعتوں کی منظوری سے قلمبند کئے گئے تھے۔ اسی سلسلہ میں ایک زبردست بیان بھی محمد علی نے شائع کیا جس میں افسوس کے ساتھ کانگریس سے اپنی علیحدگی اور بے تعلقی کا اعلان تھا۔ کانگریس سے علیحدگی کے بعد محمد علی صرف خلافت کمیٹی کے ہو رہے اور مسلمانوں میں تنظیم کا کام شروع کر دیا۔

اسی دورِ تنظیم میں ایک ایسا ناگوار واقعہ پیش آیا جس نے مسلم سیاست میں مزید پراگندگی پیدا کر دی اور محمد علی کی شخصیت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا حکومت سے ترک تعاون کے ابتدائی دور میں محمد علی نے مسلم عوام میں کامیابی سے بیداری اور جوش پیدا کرنے کے لئے مسلمانوں کے مذہبی طبقہ کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دی، لیکن سیاست میں یہ طبقہ چونکہ کچھ بھی بصیرت نہیں رکھتا تھا اس لئے محمد علی خود ہی اس طبقہ کے سیاسی استاد بھی بنے ابتداءً تو شاگردوں کے ساتھ استاد کی نبھتی رہی لیکن کچھ ہی دنوں بعد سیاست کے ان نومشق شاگردوں میں اپنے مذہبی تفوق کا جذبہ پیدا ہو گیا اور محض اس بنا پر کہ محمد علی کے پاس کسی مذہبی مدرسہ کی سند نہیں ہے انھوں نے محمد علی کی قیادت سے

انکار کر دیا یہ وہ وقت تھا جب محمد علی نے کانگریس سے تعلق منقطع کر لیا تھا اور اب وہ مسلمانوں کی ایک طاقتور جماعت کو ہاتھ میں لے کر تنظیم کا کام کرنا چاہتے تھے ایسے وقت میں مذہبی گروہ کے ان چند شوریدہ سر افراد کے عجیب و بیدار اور تنگ دلی اور تنگ نظری سے محمد علی کو سخت تکلیف پہنچی اور انھیں ایسا محسوس ہوا کہ ان کے سیاسی مخالفوں نے ان لوگوں کو اکسا کر انھیں نیچا دکھایا اور مسلمانوں میں اختلاف پیدا کرنا چاہا ہے چنانچہ جب یہ حقیقت بالکل ظاہر ہو گئی تو اسی گروہ کے بعض ان افراد کے ساتھ جن کو ان کی قیادت پر کامل اعتماد تھا محمد علی نے جمعیۃ العلماء ہند کانپور کے نام سے ایک نئی جماعت کی بنیاد ڈال دی اور خود اس کے پہلے صدر منتخب ہو گئے۔ مسلمانوں میں آپس کے اختلاف کی یہ ابتدا تھی جس کے بعد مسلمانوں میں پارٹی بازی کی وہ وبا پھیلی کہ اسلامی یک جہتی کے پرزے اڑ گئے۔

جو لوگ سیاست کو مذہبی عینک سے دیکھنا پسند نہیں کرتے ان کے نزدیک محمد علی کی یہ غلطی تھی کہ انھوں نے مذہبی مولویوں کی جماعت کو سیاسی اسٹیج پر آنے کی ترغیب دی اور یہ اس سے بھی بڑی غلطی تھی کہ سنہ ۱۹۲۹ء میں اس گروہ کو دو مخالف جماعتوں میں تقسیم کر کے خود مسلمانوں میں فتنہ و فساد کا دروازہ کھول دیا۔ اس لئے کہ مولویوں کا اس دور روشن خیالی میں بھی مسلم عوام پر بڑا اثر تھا جس سے کام لے کر بعض کوتاہ اندیش مولویوں نے مسلم سیاست اور مسلم عوام کی حفاظت کو تو پس پشت ڈال دیا اور ذاتی اقتدار کی خاطر مذہبی دھڑے بندی کے اصول پر سیاسی دھڑے بندی شروع کر دی جس کے بعد مسلمانوں کی سیاسی مرکزیت کا خیال ایک [illegible] ہو گیا جس کی کوئی تعبیر ہی نہیں ہو سکتی تھی۔

محمد علی کی زندگی کا آخری کارنامہ گول میز کانفرنس کی شرکت ہے۔ ہندوستان سے لندن تک کا یہ سفر محمد علی نے بستر علالت پر کیا جس وقت لندن پہنچے مرض میں کسی قدر افاقہ تھا۔ کانفرنس میں شریک ہو کر وہ معرکہ آرا تقریر کی جس کا یہ آخری جملہ آج تک زبان زد ہے اور جو حقیقتاً ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ محمد علی نے برطانوی پارلیمنٹ کے نمایندوں کو مخاطب کر کے کہا تھا۔

"میں آج اس مقصد سے یہاں آیا ہوں کہ جب میں اپنے وطن واپس جاؤں تو آزادی کا منشور میرے ہاتھ میں ہو میں غلام ملک میں واپس نہیں جاؤں گا۔ ایک غیر ملک میں جسے آزادی کی نعمت حاصل ہے مجھے غریب الوطنی کی موت منظور ہے اگر آپ مجھے ہندوستان کی آزادی نہیں دیں گے تو آپ کو میرے لئے یہاں قبر کی جگہ دینی ہوگی"

جس سچے جوش اور جذبہ سے محمد علی نے یہ فقرے کہے تھے ان کا اثر بھی فوراً ظاہر ہوا اور اس تقریر کے صرف دو ہی دن بعد ہند و مسلم سمجھوتہ کے لئے اپنی آخری اسکیم تیار کر رہے تھے کہ جاں بحق ہو گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

انتقال کے بعد بعض احباب کی تجویز یہ تھی کہ مرحوم کو لندن ہی میں رکھا جائے اور اعزا اور بیگم محمد علی کو اصرار تھا کہ مرحوم کی لاش ہندوستان واپس جائے لیکن ان دونوں تجویزوں کے خلاف مرحوم بیت المقدس میں سپرد خاک کئے گئے اسلام اور مسلمانوں سے [illegible] حقیقی محبت اور سچا خلوص تھا اور ساری عمر جس طرح انھوں نے اسلام کی خدمت کی انتقال کے بعد وہ یقیناً [illegible] اعزاز کے ہر طرح [illegible]

مستحق تھے وہ مقدس سرزمین انھیں نصیب ہوئی جو مسلمانوں کی قبلۂ اوّل تھی۔

محمد علی قدرت کی طرف سے غیر معمولی ذہانت اور زبردست قوت عمل لے کر آئے تھے اور ان کی سیرت کی یہی وہ خصوصیات تھیں جن سے ان کی شخصیت ہندوستان کے موجودہ لیڈروں میں بہت نمایاں اور ممتاز نظر آتی ہے۔

وہ بیک وقت ادیب بھی تھے اور نکتہ سنج مدبّر بھی انشاء پرداز بھی تھے اور آتش بار خطیب بھی یہ بہت کم ہوتا ہے کہ اچھا ادیب نکتہ سنج مدبر بھی ہو یا چوٹی کا انشاء پرداز فن خطابت میں بھی کامل نظر آئے لیکن محمد علی میں یہ سب خصوصیات بدرجہ کمال جمع تھیں ان کے قلم میں اس قدر قوت تھی کہ بیک جنبش وہ پڑھے لکھے طبقہ کے زاویہ نظر پلٹ دیا کرتے تھے اور ان کی تقریر میں وہ زور تھا کہ بڑے سے بڑے اور مخالف سے مخالف مجمع کو بیخود و وارفتہ بنا دیا کرتے تھے۔

محمد علی کی زبان وقلم کے جوہر اس وقت کھلے جب اپنی نظربندی سے رہائی کے بعد انھوں نے گاندھی جی سے اشتراک عمل کیا اور تحریک ترک موالات کی کامیابی کے لئے ہندوستان بھر کا دورہ کیا۔ یہ وہ وقت تھا جب کانگرس کا ملک میں کوئی اثر نہیں تھا بلکہ لوگ اس سے علانیہ ہمدردی کرتے ہوئے ڈرتے تھے اور خود کانگریسیوں میں یہ حوصلہ پیدا نہ ہوا تھا کہ حکومت سے علانیہ مقابلے کے لئے میدان میں آتے اور مسلمان من حیث الجماعت ملکی سیاست سے بہت دور تھے ان میں نام کو بھی بیداری پیدا نہیں ہوئی تھی لیکن محمد علی کے اسٹیج پر آتے ہی گویا ہندوستانی سیاست کی کایا پلٹ گئی۔

ایک طرف ان کی آتش بار تقریروں نے کانگریس کے پیروں کو عمل [illegible]

مسلمانوں کو جھنجھوڑ کر بیدار کیا دوسری طرف ان کے قلم نے اعتدال پسندوں کی سیاست کو تہہ وبالا کر ڈالا اور حکومت کے قصر استبداد کو جڑ بنیاد سے ہلا ڈالا غرض محمد علی کے سیاسی مطلع پر ظاہر ہوتے ہی ہندوستان کے زمین و آسمان بدل گئے۔ ہر طرف جوش و خروش اور وارفتگی اور سرفروشی کے ایسے دلچسپ مناظر نظر آنے لگے کہ ہندوستان کے سیاسی انقلاب میں مطلق شبہ نہ رہا۔ وہ ہندوستانی جو کبھی پولیس کی وردی کو دور سے دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوتے تھے قومی نعرے لگاتے ہوئے عدالت کے کٹہرے میں کھڑے نظر آتے تھے اور نازوں کے پالے ہوئے افراد جنھوں نے کبھی جیل خانوں کا تصور بھی نہ کیا تھا مادر وطن کی خاطر خوشی خوشی ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں جیل جاترا پر آمادہ ہو گئے تھے۔

اس میں شک نہیں گاندھی جی کی تحریکات نے ملک کے نوجوان دماغوں پر اثر پیدا کر لیا تھا اور انقلاب کے لئے زمین بھی ہموار ہو چکی تھی، لیکن سرگرمی عمل کے فقدان سے گاندھی جی کی تحریکیں بے جان تھیں محمد علی نے اپنی قوت عمل سے ان میں جان ڈالی اپنے بے پناہ جوش و خروش اور بیباک انداز سے نوجوانوں کے دماغی زاویوں کو درست کیا' ان میں بے جگری اور بے باکی پیدا کی ان کے حوصلہ بڑھائے اور انھیں اس قابل بنا دیا کہ وہ برطانیہ جیسی جبروت حکومت سے بھڑ جائیں مسلمان جو عملاً ہندوستان کی سیاست سے علیحدہ تھے محمد علی کی قیادت میں آزادی کی روح رواں بن گئے اور اپنے ایثار اور قربانیوں سے ملک کی فضا میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔

"آزادی گویا محمد علی کے خمیر میں گندھی ہوئی تھی وہ کسی حال اور کسی صورت میں غلامی یا کسی قسم کی پابند زندگی کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے چنانچہ سیاسی بیداری

اور حکومت برطانیہ سے کشمکش کا صرف ایک ہی مقصد ان کے ذہن میں تھا اور وہ تھا "آزادئ کامل" نہ اس سے کم نہ اس سے زیادہ۔

اخلاص اور بے غرضی ان کی سیرت کی دوسری نمایاں خصوصیت تھی جس نے ان کے سیاسی مسلک کو چار چاند لگا دئے تھے طبیعت کے چونکہ اکھڑ اور ضدی واقع ہوئے تھے اس لئے سیاست میں ان کا مسلک ہیر پھیر اور داؤ پیچ سے بالکل بری تھا جو کہنا ہوتا صفائی سے کہتے بلکہ کہنے میں بعض مرتبہ اتنی صفائی برت جاتے کہ جو بات نہ کہنے کی ہوتی وہ بھی کہہ جاتے اور توقع ان کی ہمیشہ بیجا ثابت ہوتی جس کے باعث انھیں اپنے ساتھیوں سے شکایت پیدا ہونے لگی اور اس قدر بڑھی کہ بالکل جدائی ہوگئی بات اصل میں صرف اتنی تھی کہ یہ جس قدر ذہین اور طباع تھے اسی قدر جلد باز اور مغلوب الجذبات بھی تھے، اسی کے ساتھ بے غرض اور بے باک واقع ہوئے تھے اس لئے جب کوئی بات اپنی مرضی اپنے اصول اور ایقان کے خلاف نظر آتی یہ اس پر بے تکلف احتساب کر گذرتے اور احتساب کرنے میں اپنے اور پرائے دوست اور دشمن کی مطلق تمیز نہ کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ دوست ان کے مزاج سے خائف اور مخالف ان کی صاف گوئی سے نالاں رہتے تھے۔ محمد علی کے مزاج میں جلد بازی اور تلون بھی بہت تھا اور اپنی اس کمزوری کے باعث انھوں نے اپنی نجی اور سیاسی زندگی میں نقصان بھی بہت اٹھایا۔

"قومیت" کے متعلق محمد علی کا نظریہ اپنے کانگرسی ساتھیوں سے مختلف تھا جہاں تک ہندوستان کی آزادی کا تعلق تھا وہ ملک کے بڑے سے بڑے قوم پرست

لیڈر سے دو قدم آگے تھے یعنی اس معاملے میں وہ ہندوستانی پہلے تھے اور بعد کو کچھ اور لیکن جب سوال اسلامی مفاد کی حفاظت کا پیدا ہوتا خواہ ہندوستان میں ہو یا ہندوستان سے باہر وہ مسلمان پہلے تھے اور بعد کو کچھ اور۔

حقیقت یہ ہے کہ محمد علی کو اپنے ملک سے محبت تھی اس لئے وہ اسے پنجہ اغیار میں دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے لیکن انھیں اپنے مذہب سے بھی گرویدگی تھی اور وہ اسے برداشت نہ کرتے تھے کہ کوئی ان کے مذہب یا ان کے ہم مذہبوں کے مفاد پر ضرب لگا جائے۔ ان کا مسلک بالکل صاف تھا وہ آزادی کے شیدائی تھے نہ ملک کو غلام دیکھنا پسند کرتے۔ تھے نہ اپنے مذہب پر کسی قسم کی پابندی کو برداشت کر سکتے تھے لیکن ان کے تحریک آزادی کے ساتھی محمد علی کے اس صاف مسلک کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے ان کے نزدیک قوم اور مذہب دو متضاد وجود تھے جو کبھی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے تھے گویا ان کے خیال میں قومیت کا صحیح نظریہ یہ تھا کہ ایک ہندوستانی اول سے آخر تک صرف ہندوستانی ہو اور ہندوستانی کے سوا کچھ نہ ہو۔ قطع نظر اس بحث کہ خود اس مسلک کے ماننے والوں کا اپنے مذہب کے متعلق کیا عمل تھا۔ محمد علی کے لئے جن کی رگوں میں کھولنے والا خون اور جن کے پہلو میں تڑپنے والا دل تھا اور جو اپنے مذہب کے سچے فدائی تھے، ناممکن تھا کہ محض زبان سے بھی اس مسلک کا اقرار کر لیتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ محمد علی کو اپنے ساتھیوں سے علیحدہ ہونا پڑا اور عمر کے آخری ایام میں اپنے اس صاف اور صریح مسلک کی بدولت "فرقہ پرست" کا طعنہ سننا پڑا۔

ہندوستان کے معلم آزادی کے لئے فرقہ پرست کا خطاب! یہ وقت کی ستم ظریفی اور سب سے زیادہ اس قوم کی بے حسی اور بے حمیتی ہے جس کی

خادم محمد علی مرمٹا !!

ہمدرد کو جب دوسری مرتبہ محمد علی نے جاری کیا تو اس کے پہلے ہی نمبر میں انھوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور میں نہایت عاجزانہ انداز میں دعا لکھی اس دعا کا صرف ایک ٹکڑا اس جگہ نقل کیا جاتا ہے جس سے ان کی سیرت کے بعض اہم پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے محمد علی لکھتے ہیں :-

"میں اپنی چھوٹی سی پونجی لے کر بازار جہاں میں نکلا ہوں جو چند ارادوں اور چند افکار سے زیادہ نہیں اس کے سوا میرے ہاتھ خالی ہیں نہ تو میری جیب میں دولت ہے جس کا مجھے غرور ہو۔ نہ میرے پاس طاقت ہے جس کا مجھے گھمنڈ ہو، نہ اعوان و انصار کی کوئی فوج ہے جس کا بھروسہ ہو، با وجود ان بے سرو سامانیوں کے ایک تیرا وجود ہے جس پر مجھے بھروسہ ہے اور ایک تیری ذات ہے جس پر تکیہ اور سہارا ہے کہ اگر دنیا کی ہر ایک شے مجھ سے چھین لی جائے میرا تمام ساز و سامان بے سرو سامانیوں سے بدل دیا جائے اور میں دنیا سے اور دنیا مجھ سے الگ کر دی جائے، تب بھی جب تک تجھ پہ بھروسہ کرنے کی توفیق شامل ہے میں اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتا ہوں، خداوندا میرے دل کو خوف ماسوا اللہ سے پاک کر دے اور صرف اپنے خوف و خشیت کے لیے اس کو چن لے تاکہ کوئی طاقت اور شاہانہ غرور و تمکنت کی خوفناک سے خوفناک نمائش بھی میرے قدموں کو جادۂ صداقت

سے ڈگمگا نہ سکے ۔

خدایا راہ خداوندی میں ایثار و قربانی کرنے کی وہ ہمت و عزم اور صبر و استقامت عطا فرما اور وہ قدرت و جاں فروشی کی روح جو حسین ابن علی کو اپنے اجداد و ابراہیم و اسماعیل اور محمدؐ سے ملی تھی اور کرب و بلا کے ریگ زار میں جس کے ظہور کی تو نے انہیں توفیق دی تھی اسی عزم و استقلال اور اسی صبر و استقامت کی عاجزانہ درخواست میں بھی کرتا ہوں ۔"

اسی طرح گول میز کانفرنس میں اپنی آخری مشہور اور تاریخی تقریر کے دوران میں محمد علی نے اپنے سیاسی مسلک کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا تھا:-

"میرے نزدیک مذہب زندگی کے حقائق کا ترجمان ہے مجھے اسلام کے صدقے میں تہذیب معاشرتی نظام اور زندگی کا امید افزا مستقبل حاصل ہے ۔ اسلام ان باتوں کا مکمل مجموعہ ہے جہاں خدا کے حکم کا سوال ہو ۔ وہاں میں پہلے مسلمان ہوں اور آخر تک مسلمان رہوں گا اگر آپ مجھے اسلام کی تہذیب معاشرتی نظام اور اخلاقیات کے بغیر اپنی سلطنت یا قوم میں داخل ہونے کے لئے کہیں تو میں کبھی داخل نہیں ہوں گا ۔ میرا پہلا فرض یہ ہے کہ اپنے خالق کا حکم مانوں نہ کہ ہز مجسٹی ملک معظم کا یا اپنے دوست ڈاکٹر مونجے کا ۔"

مولانا عبدالماجد دریابادی نے محمد علی کی سیرت پر روشنی ڈالتے ہوئے

حقیقتاً یہ بہت صحیح لکھا ہے :-

اس دل و دماغ کا ایسا جامع الصفات سردار کسی قوم کو خوش نصیبی ہی سے کہیں مدتوں میں ہاتھ آتا ہے جنھیں یہ نعمت ملی انھوں نے قدر نہ کی ـــــ وقت پر نعمت کی قدر دنیا نے کب کی ہے ؟ ـــــ دولت کیا ٹھہرنے والی اور نعمت کیا رکنے والی تھی ؟ ایک آنی دولت، اور فانی نعمت تھی آئی اور گئی ـــــ اور پھر مسلمان انھوں نے اپنی تیرہ سو سال کی تاریخ میں قدر کس کی پہچانی ہے ؟ شیر خدا علی مرتضیٰ کی ؟ خلیفہ رسول عثمان غنی کی ؟ جوانان جنت کے سردار حسین کی ؟ جب اپنی شوربختیوں سے ایسے ایسے سرداروں کی قدر نہ پہچانی تو اس کا کیا غم و ماتم کہ ان کے غلاموں کے غلام محمد علی کی ناقدری رہی ؟ اور اسے خواہ مخواہ شوربختی ہی کیوں قرار دیجیے۔ صناع کامل کی مصلحتوں کی تھاہ اور حکیم علی الاطلاق کے حکمتوں کے بھید کون پاسکا ہے ؟

کم تھے جنھوں نے محمد علی کو پہچاننے کی کوشش کی۔ کمتر تھے جو اس کوشش میں کامیاب رہے !!

دیش بندھو، چترنجن داس

ایثار و شرافت، رواداری اور انسانیت کی اعلیٰ تمثیل۔ ایک سحرکن شخصیت جو شہاب ثاقب کی طرح ہندوستان کی سیاسی فضا پر نمودار ہوئی اور غائب ہو گئی۔

۱۹۱۷ء میں سی آر داس آنجہانی نے ملک کی عملی سیاست میں حصہ لیا اور ۱۹۲۵ء میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ اس آٹھ برس کی مختصر سی مدت میں انھوں نے ہندوستان کے صف اول کے رہنماؤں میں اپنی جگہ بھی بنا لی اور اپنی ایثار نفسی، رواداری اور با اصول سیاست دانی کا اپنوں اور پرایوں پر سکہ بھی بٹھا دیا۔ چنانچہ لارڈ لٹن گورنر بنگال دسمبر ۱۹۲۰ء کی سند پر اس وقت کے وزیر ہند لارڈ اولیور ہندوستان کی سیاسی صورت حال پر روشنی ڈالتے ہوئے دار العوام میں سی آر داس آنجہانی کی شخصیت کا اس طرح اعتراف کرتے ہیں۔

" مسٹر سی، آر، داس کا مرتبہ اپنے کیریکٹر کی بلندی اور با اصول سیاست دانی میں مسٹر گاندھی سے دوسرے نمبر پر ہے اور ہندوستان میں انھیں بڑا وقار حاصل ہے "

فی الحقیقت سی، آر، داس کی شخصیت کا ملک کی سیاست پر بے پناہ

اثر تھا اگر وہ زندہ رہتے تو یقیناً کانگریس کی سیاسی حکمت عملی اس سے بالکل مختلف ہوتی جو آج ہے۔

چترنجن داس ۵ اکتوبر ۱۸۷۰ء کو کلکتہ میں پیدا ہوئے "تلر باغ" ڈھاکہ کے مشہور ویدیا خاندان سے ان کا تعلق تھا۔ ان کے والد بھوبن موہن داس اگرچہ پیشے کے اعتبار سے وکیل تھے لیکن برہمو سماج کے نہایت سرگرم ممبر اور اس سماج کے آرگن "برہمو پبلک اوپینین" کے ذمہ دار ایڈیٹر تھے کچھ دنوں بعد انھیں سیاست سے دلچسپی پیدا ہوگئی اور انھوں نے اس مذہبی پرچے کی ادارت سے دست بردار ہو کر بنگال پبلک اوپینین کے نام سے ایک خالص سیاسی ہفتہ وار اخبار جاری کر دیا۔ چترنجن داس کو سیاست کا ذوق اپنے والد سے ورثہ میں ملا۔ ان کی والدہ شریمتی نستارنی دیوی، رحم دلی ایثار و شفقت میں ہندوستانی خواتین کا مکمل نمونہ تھیں۔ نوجوان چترنجن داس کی تربیت میں اس خاتون کی سیرت کا اثر پوری قوت سے کارفرما رہا اور اسی پر بعد میں چترنجن داس کی سیرت کی تعمیر ہوئی۔

مدرسہ میں چترنجن داس ذہین طالب علم ثابت نہیں ہوئے البتہ اپنے ہم عمروں میں بہت ہر دلعزیز مشہور تھے۔ بھوانی پور کے مشن اسکول سے انھوں نے ۱۸۸۶ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا ۱۸۹۰ء میں انھوں نے "پریسیڈنسی کالج" سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ بی اے پاس کرنے کے بعد ان کے والد نے ان کو سول سروس کے لئے تیار کرنا شروع کیا چنانچہ یہ سول سروس کے داخلہ کے امتحان میں شریک ہونے کے لئے اسی سال انگلستان چلے گئے لیکن سول سروس کے امتحان داخلہ میں یہ کامیاب نہ ہوسکے مجبوراً

بیرسٹری کے لئے پڑھنا شروع کر دیا اور ۱۸۹۲ء میں انھوں نے "مڈل ٹمپل" سے بیرسٹری کی سند حاصل کر لی۔

یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ہندوستانی طالب علم جو اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کے لئے انگلستان جاتے ہیں ان میں اپنی قومی برتری کا ایک جذبہ پیدا ہو جاتا ہے نوجوان چترنجن داس میں بھی دوران تعلیم میں یہ جذبہ پرورش پاتا رہا چنانچہ بیرسٹری کے امتحان سے پہلے دارالعوام کے انتخابات کا زمانہ آگیا اور اس انتخاب میں ہندوستان کے مشہور قوم پرست لیڈر دادا بھائی نوروجی بھی ایک نشست کے لئے کھڑے ہوئے چترنجن داس نے ان کے انتخاب میں اس قدر سرگرمی سے حصہ لیا کہ اپنی پڑھائی تک کو اس مدت کے لئے خیرباد کہدیا۔

۱۸۹۳ء میں چترنجن داس ہندوستان واپس ہوئے اور کلکتہ ہائیکورٹ میں بہ حیثیت ایڈوکیٹ پیروی شروع کر دی۔ ۱۸۹۷ء میں مسٹر براد ہالدار کی صاحبزادی بسنتی دیوی سے ان کی شادی ہوگئی جس کے بعد ان کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ ابتدا میں سی۔آر۔داس کی پریکٹس اچھی نہ تھی اور خاندان کا خرچ بہت بڑھا ہوا تھا جس سے پریشانی رہتی تھی۔ اس پر مزید مصیبت یہ آپڑی کہ سی۔آر۔داس کے والد مسٹر بھوبن موہن داس نے اپنے کسی دوست کی چالیس ہزار کی ضمانت دیدی تھی وہ دوست عدالت میں حاضر نہ ہوا۔ عدالت نے ضامن کو کھڑا اس تازہ مصیبت سے بچنے کے لئے باپ بیٹے دونوں نے جون ۱۹۰۶ء میں عدالت کے آگے دیوالیہ کی درخواست پیش کر دی اور اپنے آپ کو بالکل ہی تباہ ہونے سے بچالیا۔ لیکن اس درخواست کے بعد ہی حیرت انگیز رفتار سے حالات بدلنے شروع ہوئے۔ سی۔آر۔داس

کی وکالت چمکنے لگی۔ مقدمات کا رجوعہ بڑھنے لگا' بڑے بڑے تجربہ کار وکیلوں سے عدالتوں میں معرکہ پڑے اور ہر معرکہ میں سی۔آر۔ داس کامیاب ہوتے گئے ملک میں ان کی قانونی قابلیت کی دھوم مچ گئی اور خود عدالتوں پر ان کا رعب چھا گیا کلکتہ کا ایک مشہور بیرسٹر سی۔آر۔ داس کی قانونی قابلیت اور انکی پیروی کے انداز کے متعلق کہتا ہے:۔

وہ عدالت میں ایک مضبوط چٹان کی طرح ہوتے ہیں جسے نہ جج ہلا سکتا ہے اور نہ مخالف وکیل اسی کے ساتھ ان کے دلائل کی قوت ایسی بے پناہ ہوتی ہے کہ مخالف سے مخالف جج بھی بالآخر اس کے آگے بے بس ہو جاتا ہے۔
پیروی کے وقت ان میں ذرا جھجک پیدا نہیں ہوتی اور نہ بڑے سے بڑے حاکم سے وہ مرعوب ہوتے ہیں وہ ہمیشہ نہایت بے باکی اور بے پرواہی سے بولتے ہیں اور ان کی شخصیت کا اثر جج اور حاضرین کو بہت خاموشی سے مرعوب کرتا جاتا ہے ان میں عجیب بات یہ ہے کہ کمزور مقدمات پر سب سے زیادہ اپنا زور خرچ کرتے ہیں اور مضبوط مقدمات پر بالکل توجہ نہیں دیتے چنانچہ میں ایک وکیل بھی ایسا نہیں جانتا جس نے سی۔آر۔ داس کے برابر کمزور مقدمات عدالت سے جیتے ہوں۔ ان کا آخری اور سب سے معرکہ کا مقدمہ وہ تھا جو " دم راون کیس " کے نام سے مشہور ہے اس مقدمے میں ہندوستان کے بہترین قانونی دماغوں نے کام کیا لیکن مقدمہ بگڑتا ہی گیا آخری نوبت پر جو مایوسی کی حد تک پہنچ چکی تھی'

سی آر داس نے وہ مقدمہ اپنے ہاتھ میں لیا اور عجیب
انداز سے اپنے فریق کو جتا دیا۔

سی آر داس کی ان مسلسل کامیابیوں کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ ملک کے
چوٹی کے بیرسٹروں میں گنے جانے لگے اور ان کی آمدنی چالیس ہزار
روپیہ سے بھی آگے بڑھ گئی۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جب سی آر
داس کو مالی فراغت حاصل ہوئی تو انھوں نے سنہ ۱۹۱۳ء میں وہ چالیس ہزار
روپے عدالت میں داخل کر دئے۔ جس کے لئے انھیں سنہ ۱۹۰۰ء میں دیوالیہ
کی درخواست کرنی پڑی تھی۔ حالانکہ دیوالہ کی درخواست کر چکنے کے بعد وہ اخلاقاً
یا قانوناً اس رقم کی ادائی کے ذمہ دار نہ تھے اور پھر یہ رقم بھی وہ تھی جو ایک
دوست کی بے وفائی کے باعث ان کے والد پہ عائد ہوگئی تھی لیکن سی آر
داس کو کبھی روپے پیسے سے محبت نہ ہوئی جوان تاویلات پر غور کرتے
ان کے نزدیک یہ چالیس ہزار کی رقم ان پر قرض تھی اور وہ اس کو اتارنا
اپنا اخلاقی فرض سمجھتے تھے۔ حقیقت میں ان کی سیر چشمی کا یہ حال تھا کہ اپنی
ضروریات کی تکمیل کے بعد جو کچھ ان کے پاس بچتا اسے وہ دوسرے ضرورت
مندوں کا مال سمجھتے چنانچہ اس وقت بھی جب انکی پریکٹس اچھی نہ تھی
اور آمدنی مشکل سے ان کے خرچ کے لئے کافی ہوتی تھی۔ انھوں نے
ایک مرتبہ گاندھی جی کو جنوبی افریقہ کے قومی کام کے سلسلہ میں اپنی بنک کی
ساری جمع کا ایک چیک دیدیا تھا۔

بنگال کا کوئی خیراتی کام ایسا نہ تھا جس میں سی آر داس نے دل
کھول کر حصہ نہ لیا اور کوئی قومی ادارہ ایسا نہ تھا جو ان کے چندے سے

محروم رہ گیا ہو بعض زر شکاروں نے بھی اُن سے خوب فائدہ اٹھایا جھوٹ موٹ کے افسانے گھڑ کے سی آر داس سے روپیہ لیا اور سی آر داس نے یہ جان بوجھ کر کہ یہ لوگ محض روپیہ لینے کے لئے باتیں بنا رہے ہیں انھیں روپیہ دیا۔ ایسے لوگوں کے متعلق ان کی دلیل یہ تھی 'ضرورت اندھی ہوا کرتی ہے نہ معلوم ان غریبوں پر کیا وقت پڑا ہے' جو انھیں جھوٹ بولنے کی بھی ضرورت محسوس ہوئی، اس لئے اگر ان کا کام مجھ سے نکل جائے تو میرا کیا حرج ہے .... یہ دلیل اسی بے نفس کے دماغ میں آسکتی ہے جو اپنی اور پرائی ضرورت میں امتیاز نہیں کرتا اور ایسی ہستیاں اس زمانہ ہی میں نہیں ہر زمانہ میں نایاب رہی ہیں۔

غالباً بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہے کہ سی آر داس شاعر بھی تھے، اگرچہ بہ حیثیت شاعر انھیں ملک میں شہرت حاصل نہیں ہوئی لیکن بڑے اچھے پایہ کے شاعر تھے ان کے کلام کے دو مجموعے چھپ چکے ہیں ایک میں ان کی ابتدائی شاعری ہے اور دوسرے میں سیاست میں شامل ہونے کے بعد کے تاثرات کا عکس ہے یہ دونوں مجموعے اپنے رنگ میں خوب ہیں ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سی آر داس فطرتاً شاعر پیدا ہوئے تھے۔

سیاست میں دلچسپی کا جہاں تک تعلق ہے سی آر داس اوائل عمر ہی سے اس میں دلچسپی لیتے رہے اور ۱۹۰۶ء میں کانگریس کے باقاعدہ ممبر بھی بن گئے۔ لیکن عملاً سیاسی تحریکوں میں ۱۹۱۷ء سے پہلے کوئی حصہ نہیں لیا۔ کانگریس کے ممبر ہونے کے بعد سیاسی مقدمات انھیں کثرت سے ملے ان مقدموں میں آمدنی تو کیا ہوتی الٹے سی آر داس کو

بعض مقدموں میں اپنی گرہ ہی سے خرچ کرنا پڑتا جس محنت، خلوص اور قانونی قابلیت سے انھوں نے سیاسی مقدموں کی پیروی کی اس نے انھیں کانگریس کے سیاسی حلقوں میں روشناس کر دیا اور کانگریس کے بعض تجربہ کار لیڈروں کی اس جوہر قابل پر نظریں پڑنے لگیں سیاست کی چیٹک سی، آر، داس کے دل میں ہمیشہ سے تھی لیکن اس کے اظہار کا موقع انھیں اب تک نہ ملا تھا ان لوگوں کی مسلسل ترغیب سے بالآخر یہ جذبہ ان میں ابھر آیا اور وہ ۱۹۱۷ء میں عملی سیاست میں حصہ لینے پر تیار ہوگئے اسی سال بھوانی پور میں بنگال پراونشل کانفرنس کا اجلاس تھا، سی آر داس اس کے صدر منتخب ہوئے اس کانفرنس کے لئے سی، آر، داس نے جو خطبہ صدارت لکھا اس میں انھوں نے نہایت صفائی سے اپنے سیاسی ایقان کا ذکر کر دیا ہے اور اسی اجلاس سے در اصل ہندوستان کی سیاست میں ان کا کامیاب داخلہ ہوا۔ اپنے اس خطبہ میں انھوں نے عوام سے یہ اپیل کی تھی کہ مغربی معاشرت اور مغربی مصنوعات کے مقابلہ میں مشرقی معاشرت اور مشرقی مصنوعات کو ترجیح دیں اور سب سے زیادہ اپنی دیہاتی زندگی کی اصلاح کریں کہ آئندہ سیاسی کشمکش میں سب سے زیادہ اسی کا حصہ ہوگا یہ وہ بات ہے جو مدت بعد گاندھی جی نے کہی تھی اور کانگریس نے اس اہم ضرورت کی طرف توجہ کی تھی۔ بہرحال سی آر داس کا اس کانفرنس کی صدارت کے بعد ہی سے کانگریس کے لیڈروں میں شمار ہونے لگا۔ جب گاندھی جی نے تحریک ستیہ گرہ شروع کی تو ان کے مشیروں میں سی، آر، داس نمایاں تھے اور جب اس تحریک کے پرچار کا سوال پیدا ہوا تو سی، آر، داس پیش پیش ہوگئے جس کے بعد وہ ہندوستان

کے مسلم لیڈروں میں گنے جانے لگے۔ ۱۹۱۹ء میں جلیانوالہ باغ میں گولی چلی اس حادثہ کی تحقیقات کے لئے جو غیر سرکاری کمیٹی بنائی گئی تھی اس کے ایک ممبر سی، آر داس بھی تھے۔ اس کمیٹی میں شامل ہونے کے بعد سی، آر، داس کو گاندھی جی کی شخصیت سمجھنے اور ان کے ساتھ کام کرنے کا موقعہ ملا اس اتفاق نے سی آر داس کی طرز معاشرت پر بڑا اثر کیا اوران میں دیکھتے ہی دیکھتے نمایاں تبدیلی ہوگئی۔ گاندھی جی کی سادگی سے تو وہ بے شک اس قدر متاثر ہوئے کہ خود انھوں نے اپنی معاشرت بدل ڈالی۔ لیکن اس سے ان کی آزادی رائے پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ وہ سادگی میں گاندھی جی کے چیلے بن جانے کے باوجود ان کی سیاست کو پوری طرح قبول نہ کر سکے اور جب موقع ملا وہ برابر آزادی کے ساتھ اس کا مقابلہ کرتے رہے۔ چنانچہ جب گاندھی جی نے اپنا ترک موالات کا پروگرام ملک کے آگے پیش کیا توسی، آر، داس اس پروگرام سے متفق نہ ہو سکے اور کلکتہ کے اجلاس کانگریس میں جو سنہ ۱۹۲۰ء میں منعقد ہوا تھا انھوں نے پوری قوت اور شدت سے اس کی مخالفت کی لیکن اس مخالفت کے باوجود جب کانگریس نے اس پروگرام کو قبول کیا تو سی، آر داس نے بھی کانگریس کے اس فیصلے کو بے چون وچرا تسلیم کر لیا اور اس کی تعمیل میں اپنی پریکٹس سے دست بردار ہو گئے، سی، آر، داس کا یہ اتنا بڑا ایثار تھا اور ایسی بے مثال قربانی تھی کہ ساری تحریک کانگریس میں اس کی کوئی نظیر نہیں تھی جس وقت سی، آر، داس نے پریکٹس چھوڑ کر ترک موالات کی حمایت میں ملک کا دورہ شروع کیا اور جگہ جگہ قومی مفاد کی حفاظت کے لئے رضاکاروں کیلئے

اپیل کی تو مدرسے اور کالج کے طلبہ اور طالبات کا ان کے جھنڈے کے نیچے ایک انبوہ کثیر جمع ہو گیا حکومت بنگال نے یہ دیکھ کر رضا کار بھرتی کرنے کو خلاف قانون قرار دے دیا اور ان لوگوں کو گرفتار کرنا شروع کر دیا جو اس تحریک کا پرچار کر رہے تھے ۔ یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ کانگریس کے اور لیڈروں کی طرح سی' آر' داس نے ذاتی طور پر اس تحریک کے نتائج سے بچنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اپنے اکلوتے لڑکے ' اپنی بیوی اور اپنی بہن تک کو اس تحریک میں شامل کر دیا۔

سنہ ۱۹۲۲ء کے لئے یہ کانگریس کے صدر منتخب ہوئے تھے لیکن اس سے پہلے کہ وہ احمد آباد کانگریس کی صدارت کریں ۱۰ دسمبر سنہ ۱۹۲۱ء کو حکومت نے انھیں رضا کاروں کی تحریک کے سلسلہ میں گرفتار کر لیا اور ۹ جنوری سنہ ۱۹۲۲ء کو اسی جرم کی پاداش میں چھ مہینے قید سادہ کی سزا سنادی جیل جاتے ہوئے سی' آر' داس نے اپنے رضا کاروں کے نام یہ ولولہ انگیز پیغام دیا تھا :۔

"ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ ہم ہی لوگ جو تارک موالات کہلاتے ہیں اس ملک کے دعوے دار ہیں یاد رکھو جس حد تک ہم عوام کو منظم کرنے میں ناکامیاب رہیں گے اسی حد تک تحریک ترک موالات بے اثر رہے گی "

جب سی' آر' داس جیل سے رہا ہوئے تو ملک کو انھوں نے عجیب حالت میں پایا۔ گاندھی جی اور دوسرے لیڈر جیل میں تھے ترک موالات کا پروگرام فنا ہو چکا تھا اس لئے کہ جو لیڈر جیل سے باہر

تھے وہ اس پروگرام کو تنہا چلانے کی صلاحیت نہ رکھتے تھے اور خود سی آر داس کی رضاکاروں والی تجویز بھی تقریباً ختم ہوچکی تھی۔ یہ حالت دیکھ کر سی آر داس نے ایک تعمیری پروگرام بنایا اور اس پروگرام کے ماتحت کونسلوں کے اندر پہنچکر حکومت برطانیہ سے مقابلہ کی طرح ڈالدی۔

دسمبر ۱۹۲۲ء میں سی آر داس نے گیا کانگریس کی صدارت کی اسی اجلاس میں سی آر داس کی یہ تجویز بھی منظور ہوگئی جس کے بعد انھوں نے انتہائی سرگرمی سے اپنی قیادت میں سوراج پارٹی کے نام سے ایک سیاسی پارٹی بنائی اور کونسل اور اسمبلی کے انتخابوں کے لئے اسے تیار کرنا شروع کردیا۔ چند ہی دنوں میں یہ پارٹی سی آر داس کی قیادت میں اس قدر طاقتور ہوگئی کہ دوست اور دشمن سب اس کے نظم اور قوت کے معترف نظر آنے لگے۔

۱۹۲۳ء میں بنگال کی نئی کونسل کے عام انتخابات شروع ہوئے اور سوراج پارٹی نے پوری سرگرمی سے اس میں حصہ لیا اور کونسل میں سوراج پارٹی کی اکثریت ہوگئی۔ انتخاب کے بعد اس وقت کے گورنر بنگال لارڈ لٹن نے سی آر داس کو طلب کیا اور ان شعبوں کے لئے جنھیں ہندوستانیوں کے سپرد کردیا گیا تھا وزارت ترتیب دینے کی دعوت دی۔

لیکن سی آر داس نے اپنی پارٹی سے مشورے کے بعد دعوت کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ اس کے دوسرے برس یعنی ۱۹۲۴ء میں کلکتہ کارپوریشن کا پہلا انتخاب ہوا اس انتخاب میں کارپوریشن کے ۷۵ منتخب ممبروں میں سے ۵۵ ممبر سوراج پارٹی کے منتخب

ہو گئے اور کارپوریشن کے پہلے ہی اجلاس میں سی آر داس کلکتہ کے میئر چن لئے گئے۔

سی آر داس نے اس موقع پر جو افتتاحی خطبہ پڑھا ہے اور جو عملی پروگرام کارپوریشن کے آگے رکھا ہے وہ حقیقتاً اس قابل ہے کہ ملک کی میونسپلٹیاں اسے اپنا دستور العمل بنائیں۔ اس خطبہ میں سب سے زیادہ غریبوں کی خدمت اور انہی کی اصلاح کا پروگرام پیش کیا گیا ہے اس خطبہ کے آخر میں سی آر داس کہتے ہیں :-

ہندوستانی غریبوں کا بڑا احترام کرتے ہیں ان کا عقیدہ ہے کہ خدا ہمیشہ غریبوں ہی کی صورت میں آتا ہے چنانچہ ہندوستانی غریبوں کی خدمت سمجھتے ہیں اس لئے میں چاہتا ہوں کہ آپ کی سرگرمیاں بھی غریبوں ہی کی سدھار پر مرکوز رہیں۔ آپ نے دیکھا میں نے اپنے اس خطبہ میں جس قدر پروگرام پیش کیا ہے وہ سب غریبوں سے متعلق ہے، غریبوں کے لئے مکانوں کی تعمیر کا انتظام، ان کے لئے مفت ابتدائی تعلیم کا اہتمام شفاخانوں اور ہسپتالوں کا قیام وغیرہ۔ یقین مانئے یہ چیزیں غریبوں کے لئے رحمت ہیں پس اگر ہماری کارپوریشن ان کاموں کو محدود سے محدود دائرہ میں بھی کر سکی تو اس کا وجود حق بجانب ثابت ہو سکتا ہے ورنہ نہیں۔

۱۹۲۵ء میں سی آر داس نے فرید پور میں بنگال پروانشل کانفرنس کی صدارت کی اس موقع پر ان کا خطبہ صدارت قوم کے نام گویا

ان کا آخری پیغام تھا اور حقیقت یہ ہے کہ اس خطبہ میں جس انداز سے ملک کے حالات پر نظر کی گئی تھی اور جس رواداری کے ساتھ اختلافی مسائل کا حل اس میں بتایا گیا تھا اس نے اس خطبہ کی سیاسی اہمیت کو بہت اونچا کر دیا تھا لیکن یہ خطبہ سی آر داس کا قوم کے نام آخری پیغام ان معنوں میں تھا کہ اس کے بعد پھر ہندوستان کے ہونہار سپوت کو پبلک اسٹیج پر آنا نصیب نہ ہوا۔

سی آر داس ایک مدت سے تپ کہنہ میں مبتلا تھے اور آئے دن ان پر اس کے دورے پڑتے رہتے تھے ۱۹۲۵ء میں بھی ان پر اس بخار کا دورہ پڑا اور وہ تبدیل آب و ہوا کے لئے دارجلنگ چلے گئے لیکن اب کے تبدیل آب و ہوا سے بھی انھیں کوئی فائدہ نہ ہوا اور ۱۶ جون ۱۹۲۵ء کو وہ اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ سی آر داس کے یکایک انتقال سے ملک کو بے حد صدمہ ہوا اس لئے کہ سی آر داس کی شخصیت اور ان کی با اصول سیاست سے ہندوستان مانوس ہو چلا تھا اور اسے توقع ہو گئی تھی کہ سی آر داس کی ذات ہندوستان کی سیاسی کشمکش میں ہندوستانیوں کی صحیح رہنمائی کرے گی۔

انتقال کے دوسرے دن سی آر داس کا جنازہ کلکتہ لایا گیا اور نہایت شاندار جلوس نکالا گیا جلوس تقریباً دو میل لمبا تھا اور جلوسیوں کی تعداد تین لاکھ سے متجاوز تھی۔ ملک کے ہر طبقہ نے سی آر داس کا سوگ منایا اور اس طرح ہر طرف سے آنجہانی کی غیر معمولی صلاحیتوں کا اعتراف کیا گیا۔

مرنے سے چھ مہینے پہلے آنجہانی نے اپنی ساری املاک قوم کے سپرد کر دی تھی اسی میں ان کی خوب صورت کوٹھی بھی تھی جسے انھوں

نے عزیب عورتوں کی تعلیم کے لئے وقف کر دیا تھا یہ سی آر داس کے ایثار کی یہ آخری شہادت تھی جو ملک کے آگے پیش ہوئی اور حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں ہندوستان کا کوئی لیڈر ان کا مثیل نہیں اور اور وہ سب میں منفرد اور ممتاز نظر آتے ہیں۔

ان کے انتقال کے بعد ان کی کوٹھی میں لڑکیوں کے لئے طبی اسکول قائم کیا گیا اور سی آر داس کی ان سرگرمیوں کی یادگار "سیوا سدن کور" کے نام سے قائم کی گئی جو انھوں نے اپنی زندگی میں بنگال میں رضاکاروں کی بھرتی کے سلسلہ میں دکھائی تھی۔

یہ عجب اتفاق ہے کہ ہندوستان کی تحریک آزادی کے رہنما سوائے دو ایک کے سب مذہبی آدمی ہوئے ہیں۔ تلک، گوکھلے اربند وگھوش، اور محمد علی سب کٹر مذہبی آدمی تھے اور گاندھی جی تو اپنی مذہب پرستی میں اس وقت بھی سب سے آگے نظر آتے ہیں اور جو لوگ اس وقت ان کے ساتھ کام کر رہے ہیں ان پر بھی سوائے دو چار کے یہی رنگ چڑھا ہوا ہے۔

یہاں اس بحث کا موقع نہیں کہ ہندوستان کی سیاست میں یہ عجیب اتفاق کیوں ہوا کہ اس کی باگیں مذہب پرستوں کے ہاتھوں میں چلی گئیں۔

کہنا صرف یہ ہے کہ سی آر داس پر بھی انہی لوگوں کی طرح مذہب کا اثر تھا چنانچہ ایک موقع پر ہمین سنگھ میں تقریر کرتے ہوئے سی آر داس اپنے مذہبی اثر کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں:۔

"میں اپنے ملک کی خدمت کرنے میں یوروپین سیاست

کی پیروی نہیں کر رہا ہوں بلکہ اپنے مذہب کی پیروی کر رہا ہوں میرے نزدیک اپنے ملک اور قوم کی خدمت بنی نوع انسان کی خدمت ہے اور بنی نوع انسان کی خدمت ہی خدا کی عبادت ہے ۔"

اپنا سیاسی مطمح نظر بھی سی آر داس نے ایک سے زائد مرتبہ بڑی صفائی سے ملک کے آگے پیش کیا ہے اس معاملہ میں ان کا بیان اس لئے قابل توجہ ہے کہ وہ گنجلک سے پاک ہے ہندوستان کے لئے جو وہ دل سے مفید سمجھتے رہے اسی کو انھوں نے بڑی جرأت سے ظاہر بھی کر دیا اس وقت کے بعض لیڈروں کی طرح یہ نہیں کیا کہ دل میں تو کچھ سمجھ رہے ہیں اور ظاہر کچھ کر رہے ہیں ۔ ایک مرتبہ سی آر داس نے ڈومینین اسٹیٹس اور مکمل آزادی کا ذکر کرتے ہوئے اعلان کیا :

" سلطنت برطانیہ کے ماتحت آزادی کامل" حاصل کرنے میں بڑے فوائد ہیں ۔ میں سمجھتا ہوں قوموں کی یہ بڑی سلطنت مشترکہ جسے سلطنت برطانیہ کہتے ہیں مختلف قوموں کا ایک "فیڈریشن" یا مرکزہ اجتماع ہے جس میں ہر قوم اپنی مخصوص ... روایات کو آزادی کے ساتھ برقرار رکھتے ہوئے دنیا کے امن کی خاطر ایک دوسرے سے اشتراک عمل کرتی ہے :-

" اگر ہر قوم کو اچھے لیڈر مل گئے اور انھوں نے اپنی قوموں کی صحیح رہنمائی کی تو یہ مسئلہ ایک ملک سے آگے بڑھ کر ساری دنیا کی نسلوں کو ایک دوسرے سے متحد کرنے کا باعث ہو سکتا

ہے اس لئے میں ہندوستان کی بہتری بلکہ دنیا کی بہتری کے لئے یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ ہندوستان دولت مشترکہ کے اندر آزادی حاصل کرے اور اس طرح بنی نوع انسان کی ایک اہم خدمت انجام دے۔

میں ہندوستانی ریاستوں کا بھی فیڈریشن چاہتا ہوں ہر ریاست اپنی روایات اور اپنے کلچر کو آزادی سے باقی بھی رکھے اور آپس میں متحد بھی ہو جائے اور ایسا اتحاد صرف بنی نوع انسان کی بھلائی کے لئے ہو "

ہندو مسلم اختلافی مسائل میں سی آر داس کا نظریہ ہندو اکثریت سے مختلف تھا وہ مسلم اقلیت سے مول تول کرنا پسند نہ کرتے تھے چنانچہ اس مسئلہ میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے ایک سے زیادہ مرتبہ یہ اعلان کیا تھا۔

" مسلمان ہندو اکثریت کی روش کے متعلق اپنے اطمینان کے لئے جو مطالبہ پیش کرنا چاہتے ہیں انھیں منظور کرتا ہوں اور ہندو اکثریت کو بھی چاہیئے کہ اپنے مسلمان بھائیوں کی ہمدردیاں اور امداد حاصل کرنے کے لئے انھیں اپنے مستقبل سے مطمئن کر دیں "

یہ صرف اعلان ہی اعلان نہ تھا بلکہ سی آر داس نے بنگال کی حد تک مسلمانوں کے سارے مطالبات منظور کر لئے تھے جن سے ہندو اکثریت کو سخت اختلاف ہوا اور بہت مدت

تک اس پر دو قدح رہی اور فرقہ وار فضا جس کو سی آر داس نے درست کرنا چاہا اس ناگوار بحث کے بعد اور بگڑ گئی۔
اگرچہ سی آر داس آنجہانی ہندو مسلم اختلافات کو طے نہ کر سکے لیکن اپنی فراخ حوصلگی اور وسیع النظری سے انھوں نے مسلمانوں میں بھی بڑا اثر حاصل کر لیا۔

بنگال ایک مدت سے دہشت انگیزوں کی سرگرمیوں کا میدان بنا رہا ہے سی آر داس اپنے صوبہ کی اس بدنامی سے بہت دل برداشتہ ہوتے ہیں لیکن تحریک دہشت انگیزی کے مصنف چونکہ پڑھے لکھے نوجوان ظاہر ہوتے ہیں اس لئے ان کی درستی کا طریقہ وہ یہ اختیار کرتے ہیں کہ طرح طرح سے دہشت انگیزی کی برائی ان کے دلوں پر نقش کرتے ہیں ملک کے نقصانات کا انھیں احساس دلاتے ہیں اور انھیں اس پر آمادہ کرتے ہیں کہ وہ بجائے دہشت انگیز طریقہ اختیار کرنے کے غریبوں کی سدھار کی خاطر شریفانہ ایثار سے کام لیں کہ ملک اور قوم کو نجات دلانے کا یہی سب سے احسن طریقہ ہے چنانچہ اپنے انتقال سے پہلے مارچ ۱۹۲۵ء میں دہشت انگیزی کے خلاف جو آخری پمفلٹ شائع کرتے ہیں اس میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"میں کئی مرتبہ یہ صفائی سے کہہ چکا ہوں اور اس مرتبہ اور بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں سیاسی جبر و تشدد یا دہشت انگیزی کی ہر صورت کا مخالف ہوں اس کو اپنی سیاسی

ترقی کی راہ میں سنگ گراں سمجھتا ہوں اور یہ بات ہماری مذہبی تعلیمات کے بھی سراسر خلاف ہے اگر دہشت انگیزی ہماری عملی سیاست میں داخل ہوگئی تو یہ سمجھ لو کہ ہمارا سوراج کا خیال ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا اس لئے میں دل سے چاہتا ہوں کہ دہشت انگیزی جو سیاسی ہتھیار کے طور پر استعمال ہو رہی ہے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میرے ملک سے ختم ہو جائے۔

دیہات سدھار کی اسکیم کا مصنف گاندھی جی کو بتایا جاتا ہے حالانکہ سب سے پہلے یہ خیال سی آر داس کے دماغ میں پیدا ہوا تھا انھوں نے "گیا" میں ایک تقریر کے دوران میں اس کی اہمیت کو اس طرح جتایا تھا:-

"میرے نزدیک دیہاتی زندگی کی اصلاح اور مقامی پنچایتوں کا قیام صوبائی حکومتوں یا مرکزی ذمہ داریوں سے زیادہ اہم ہے اگر مجھے ان دونوں میں سے کسی ایک کو چن لینے کا اختیار دیا جائے تو میں وہی مرکز قائم کرنے زیادہ پسند کروں گا۔ اگر پارلیمنٹ میں صوبوں میں آزاد حکومتیں اور مرکز میں ذمہ داری ہندوستان کو دیدی تو میں اس کے خلاف شدید احتجاج کروں گا اس لئے کہ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ حکومت ملک کے اوسط طبقہ کے ہاتھ میں آجائے۔ گویا سفید فام کے استبداد

کا جوا ملک کے کندھے سے اترا تو اوسط طبقہ کے استبداد کا جوا
اس کے کندھے پر آ گیا۔ استبداد چونکہ بہرصورت قائم رہیگا
اس لئے اس سے ملک کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

سوراج کے متعلق میرا جو معیار ہے وہ اس وقت تک
پورا نہیں اتر سکتا جب تک ہر طبقے کے آدمی ملک کے
نظم ونسق میں برابر کا اشتراک عمل نہ کریں۔

سی آر داس کے اس سیاسی نظریہ پر غور کیجئے اور سوچئے کہ اگر
سی آر داس اس وقت جب کہ صوبائی حکومتیں عالم وجود میں آچکی ہیں
اور ملک میں ایک خاص طبقہ کی حکومت قائم ہو چکی ہے زندہ ہوتے
تو ہندوستان کی سیاست کا رخ کیا ہوتا؟

(۳)

قائد اعظم محمد علی جناح

جودت و ذہانت کا پتلا، بحر سیاست کا پرانا غواص، فولاد کی طرح سخت اور مضبوط عزم اور ارادے اور برف کے سے ٹھنڈے دل و دماغ کا مہندس جو اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کا خاکہ تیار کر رہا ہے۔

ہندوستان میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کا سہرا دادا بھائی نورو جی اور گوکھلے کے سر ہے اور محمد علی ان دونوں کے رفیق کار رہ چکے ہیں اس اعتبار سے محمد علی جناح ابتدائی دور کے ان چند ہندوستانی رہنماؤں میں ہیں جنھوں نے ملک میں سیاسی مذاق پیدا کیا اور ہندوستانی کو اپنے صحیح سیاسی مرتبہ کا احساس دلایا۔

گوکھلے کے متعلق محمد علی جناح کی رائے تھی :-

گوکھلے ہندوستانی سیاست کا امام ہے جس نے اپنی قوم میں نئی زندگی پیدا کر دی۔

میری دلی تمنا ہے کہ میں مسلمانوں کا گوکھلے بن جاؤں"

اور خود گوکھلے نے محمد علی جناح کے متعلق کہا تھا :-

" محمد علی جناح میں بڑی بڑی صلاحتیں ہیں، سیاسی مسائل میں

ان کا فرقہ وارانہ اور مذہبی تعصب سے آزاد انداز انھیں ایک
دن ہندو مسلم اتحاد کا بہترین قاصد بنا دے گا۔

ممکن ہے کانگریس کی نظروں میں آج محمد علی جناح وہ نہ رہے ہوں
جو گوکھلے کے زمانہ میں تھے لیکن اس میں غالباً محمد علی جناح کا کوئی قصور
نہیں ہے۔ وہ آج بھی وہی محمد علی جناح ہیں جو گوکھلے کے زمانہ میں تھے
اور ان کا سیاسی نقطۂ نظر بھی وہی ہے جو ۱۹۱۵ء اور اس سے پہلے تھا
۱۹۱۶ء کے بعد سے خود کانگریس کے سیاسی نقطۂ نظر میں کچھ تبدیلی ہوئی
ہے۔ ہو سکتا ہے کہ سیاسی نقطۂ نظر کی اسی تبدیلی کے باعث اب محمد علی جناح کے
متعلق کانگریس کے نزدیک گوکھلے کی وہ رائے صحیح نہ رہی ہو!

بہرحال ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں کے برخلاف محمد علی جناح نہ کبھی
پہلے مذہبی قسم کے لیڈر تھے اور نہ آج ہیں ان کی امتیازی خصوصیت صرف
یہ ہے کہ وہ محض سیاسی مفکر ہیں، سیاسی مدبر ہیں اور مسلمانوں کے سیاسی رہنما ہیں
اور اس سے زیادہ کچھ نہیں سیاسی مسائل کا وہ ہمیشہ سیاست کی روشنی میں
مطالعہ کرتے ہیں مذہبی عینک سے وہ خالص سیاسی مسائل کو سمجھنے کے قائل
نہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے سیاسی افکار و آرا میں مذہبی تعصب کا شائبہ
تک نہیں ہوتا اور نہ ان کے نظریوں پر اصولاً فرقہ وارانہ جانب داری کا الزام
عائد ہو سکتا ہے۔ گوکھلے نے دراصل مسٹر محمد علی جناح کی اسی خصوصیت پر
روشنی ڈالی تھی جسے کانگریس تنگ نظری سے یا مصلحتاً نظر انداز کر رہی ہے

اختصار کے ساتھ محمد علی جناح کا سیاسی نقطۂ نظر اس طرح بیان کیا جا سکتا
ہے کہ ہندوستان اس وقت تک اپنا صحیح سیاسی مرتبہ حاصل نہیں کر سکتا اور
نہ امن و سکون کے ساتھ ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہو سکتا ہے جب تک ملک

کی فرقہ وارسیاست میں توازن نہ قائم ہو جائے سیاسی توازن قائم کرنے کے لیئے ملک کی اکثریت اور اقلیتوں کے درمیان باعزت سمجھوتہ ہونا ضروری ہے اور باعزت سمجھوتہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ملک کی اکثریت سے اقلیتوں کی سیاسی انفرادیت نہ تسلیم کرالی جائے —— چنانچہ آج محمد علی جناح کی ساری سرگرمیاں اسی ایک نقطہ پر مرکوز ہیں اور فی الحقیقت یہی وہ "نقطہ" ہے جو غالباً مستقبل میں ہندوستانی سیاست کا محور ثابت ہوگا۔

محمد علی جناح ۲۵ دسمبر ۱۸۷۶ء کو کراچی میں پیدا ہوئے ان کے والد کا کراچی کے متمول تاجروں میں شمار تھا اور محمد علی جناح چونکہ ان کی پہلی اولاد تھے اس لیئے ان کی پرورش بڑے ناز و نعم سے ہوئی نازوں کا پالا اور ماں باپ کا لاڈلا بچہ بڑا ہوکر بہت کم دنیا میں کسی قابل ہوا کرتا ہے لیکن محمد علی جناح خوش قسمتی سے اس کلیہ کی استثنائی مثال ثابت ہوئے۔

ابتدائی تعلیم ان کی محلہ کے مدرسہ میں ہوئی اس کے بعد کراچی مشن ہائی اسکول میں ان کا داخلہ کرایا گیا یہاں ثانوی تعلیم ختم کرکے ۱۸۹۲ء میں محمد علی جناح قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لیئے انگلستان روانہ ہوگئے انگلستان میں محمد علی جناح کو خوش قسمتی سے ہندوستان کے مشہور قوم پرست لیڈر دادا بھائی نوروجی کی سرپرستی کا شرف حاصل ہوگیا چنانچہ انہی کے زیر نگرانی محمد علی جناح نے "لنکانز ان" سے بیرسٹری کی سند حاصل کی اور ۱۸۹۶ء میں ہندوستان واپس آئے۔ یہاں آکر انھوں نے اپنے گھر کا نقشہ ہی پلٹا ہوا دیکھا، نہ وہ فراغت تھی اور نہ وہ تمول کاروبار مسلسل نقصان کے باعث تباہ ہو چکا تھا اور گھر کا اثاثہ جس قدر تھا قرض خواہوں کے نذر ہو رہا تھا۔ محمد علی جناح کے

لئے جو رئیسانہ زندگی کے خوگر ہو چکے تھے یہ وقت بہت سخت تھا۔ اب ان کا دنیاوی سہارا سوائے بیرسٹری کی سند کے اور کچھ نہ تھا۔

محمد علی جناح کراچی سے بمبئی آگئے اور ہائیکورٹ میں پریکٹس شروع کردی پریکٹس کے ابتدائی تین برس بہت سخت گذرے بمبئی کے تجربہ کار وکیلوں اور بیرسٹروں کے سامنے اس نوجوان بیرسٹر کا چراغ نہ جل سکا۔ لیکن محمد علی جناح نے ہمت نہ ہاری قانون کا مطالعہ برابر جاری رکھا اور عدالتوں میں گھوم پھر کر اس پیشہ کا عملی تجربہ بھی حاصل کرتے رہے۔ تین برس کی مسلسل جدو جہد کے بعد بالآخر اپنے مقصد میں انھیں کامیابی ہوئی انھیں بھی مقدمات ملنے لگے اور ساتھ ہی ان کی قانونی قابلیت اور مقدموں کو لڑانے کی مہارت کا بھی چرچہ ہوتا گیا جس نے ان کی اس پیشے میں آئندہ کامیابی پہ مہر ثبت کردی

محمد علی جناح کو ابتدا ہی سے قانون کے ساتھ ساتھ سیاست سے بھی دلچسپی تھی چنانچہ فرصت کے زمانہ میں وہ کثرت سے سیاسی لٹریچر پڑھتے اور اسی کی روشنی میں ہندوستانی سیاست کا مطالعہ کرتے۔ اسی زمانہ میں آل انڈیا کانگریس سے انھیں لگاؤ پیدا ہو گیا اور وہ اس کے ممبر بن گئے کانگریس میں شامل ہونے کے بعد دادا بھائی نوروجی نے اس ہونہار بیرسٹر میں اعلیٰ سیاسی صلاحیتیں دیکھ کر اسے اپنا پرائیویٹ سکریٹری بنا لیا، ابتدا میں دادا بھائی نوروجی کے پرائیویٹ سکریٹری ہی کی حیثیت میں ملک کو محمد علی جناح کی اعلیٰ سیاسی صلاحیتوں کا تجربہ ہوا جس کے بعد بہت جلد انھوں نے ملک کے صف اول کے سیاسی مدبروں میں اپنی جگہ بنا لی۔

سنہ ۱۹۰۶ء میں محمد علی جناح دادا بھائی نوروجی کے ساتھ نیشنل کانگریس

کے اس تاریخی اجلاس میں شامل ہوئے جو کلکتہ میں منعقد ہوا تھا اور جس میں دادا بھائی نوروجی نے ہندوستان کے لئے حکومت خود اختیاری کا خاکہ پیش کیا تھا اسی اجلاس میں محمد علی جناح نے "وقف علی الاولاد" کے قانون کی ضرورت پر ایک معرکہ آرا تقریر کی جو انڈین نیشنل کانگریس میں ان کی پہلی تقریر سمجھی جاتی ہے کانگریس میں شرکت کے بعد سے محمد علی جناح کی سیاسی دلچسپیاں برابر بڑھتی ہی گئیں اور ہر سیاسی کانفرنس اور کمیٹی میں ان کی ضرورت محسوس کی جانے لگی۔

۱۹۱۰ء جب سر ولیم ویڈر برن کی زیر صدارت الہ آباد میں ہندو مسلم لیڈروں کی ایک کانفرنس ہوئی جس میں آپس کے اختلافی مسائل کو حل کرنے کی تدابیر زیر غور آئیں اس کانفرنس میں محمد علی جناح نے بڑا حصہ لیا اور ہندو مسلم اتحاد کے مسئلہ کو سلجھانے کے لئے نہایت مؤثر تدابیر پیش کیں لیکن فضا سازگار نہ تھی کانفرنس اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوئی۔ اسی سال محمد علی جناح مسلمانان بمبئی کی طرف سے "امپیریل لیجسلیٹو کونسل" کے ممبر منتخب ہوئے اس اہم اور ذمہ داری کی جگہ محمد علی جناح کو منتخب کرتے ہوئے اس وقت مسلمانوں کو یہ خیال ہوا کہ محمد علی جناح چونکہ سیاست میں بہت آزاد خیال واقع ہوئے ہیں اس لئے ممکن ہے کہ کونسل میں مسلمانوں کے خیالات کی صحیح ترجمانی نہ کر سکیں لیکن اسی کونسل میں جب محمد علی جناح نے وقف بل پیش کیا اور محض اپنی سیاسی قابلیت کی بنا پر اس کی اہمیت اور ضرورت کو کونسل کے سرکاری اور غیر سرکاری ممبروں سے تسلیم کرا لیا تو محمد علی جناح کے متعلق مسلمانوں کی بدگمانیاں دور ہو گئیں اور اس کے بعد ہی وہ محمد علی جناح کو اپنا سیاسی رہنما تسلیم کرنے لگے اسی سال محمد علی جناح نے سر ڈنشا پیٹیٹ کی صاحبزادی سے شادی کی۔

۱۹۱۲ء کے وسط میں مسلم لیڈروں کی ایک کانفرنس کلکتہ میں ہوئی

جس میں حالات کے اعتبار سے مسلم لیگ کے دستور اساسی میں ضروری ترمیم کرنے کی تجویز منظور کی گئی اس تجویز پر عمل کرنے سے پہلے طے یہ پایا کہ آل انڈیا مسلم لیگ نے سکریٹری وزیر حسن (جو اس وقت سر وزیر حسن کہلاتے ہیں) سارے ملک کا دورہ کریں اور لیگ کے دستور اساسی پر نظر ثانی کرنے کے متعلق عام مسلمانوں کی رائے معلوم کریں۔ سر وزیر حسن کے اس دورے کے بعد اسی سال دسمبر میں مسلم لیگ کونسل کا خاص اجلاس، سر آغا خاں کی زیر صدارت منعقد ہوا اور ضروری دفعات کی ترمیم کے بعد لیگ کے دستور اساسی کا جدید مسودہ تیار کر لیا گیا۔ یہی مسودہ بعد کو آل انڈیا مسلم لیگ کے لکھنؤ والے سالانہ اجلاس میں ۲۲ مارچ ۱۹۱۳ء کو منظور کیا گیا۔

ابتدا میں محمد علی جناح مسلم لیگ سے بالکل علیحدہ رہے۔ اگرچہ یہ کلکتہ کانفرنس میں بھی شریک ہوئے اور بعد کی کمیٹی میں بھی موجود رہے لیکن عملاً مسلم لیگ سے کوئی دلچسپی نہیں لی البتہ ۱۹۱۳ء کے لکھنؤ والے اجلاس میں محمد علی جناح نے مسلم لیگ سے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا اور مسلم لیگ کے جدید دستور کی نہایت سرگرمی سے تائید کی جس میں مسلم لیگ کا سیاسی مطمع نظر بھی وہی قرار دیا گیا تھا جو اس وقت کانگریس کا تھا۔ یعنی :-

"تاج برطانیہ کے زیر نگین آئینی طریقوں سے ایسی خود اختیاری حکومت حاصل کرنا جو ہندوستان کے مناسب حال ہو"۔

اپریل ۱۹۱۳ء میں محمد علی جناح کچھ دنوں آرام لینے کی نیت سے یورپ روانہ ہوئے۔ اس سفر میں گوکھلے بھی ان کے ساتھ تھے لیکن لندن پہنچتے ہی لامحالہ انہیں وہاں ایک نئی مصروفیت نکل آئی۔

ہندوستانی طالب علم جو اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کے لئے انگلستان میں مقیم تھے ان کا انگلستان میں کوئی ایسا مرکز نہیں تھا جس کے ذریعہ وہ اپنی غریب الوطنی کی نئی نئی مشکلات کا کامیابی سے مقابلہ کر سکتے۔ محمد علی جناح نے لندن پہنچ کے دو ہی تین ہفتے کے اندر "لندن انڈین ایسوسی ایشن" کے نام سے ایک ادارہ قائم کر دیا جس نے انگلستان کے سارے ہندوستانی طالب علموں کو ایک رشتہ میں گوندھ لیا اور محمد علی جناح کی ذاتی سرگرمیوں سے اسے اس قدر اہمیت حاصل ہو گئی کہ انڈیا آفس نے محض اس ادارے کے مطالبہ پر وہاں کی کالجوں کی تعلیم اور داخلہ کے سلسلہ میں ہندوستانی طالب علموں کی جائز شکایتوں کی دریافت کے لئے ایک کمیٹی مقرر کر دی اس کامیابی کے بعد اسی سال اکتوبر میں محمد علی جناح کے ہندوستان واپس ہونے سے پہلے مولانا محمد علی مرحوم اور سر وزیر حسن نے جو اس زمانہ میں لندن ہی میں تھے محمد علی جناح کو مجبور کیا کہ وہ مسلم لیگ میں شامل ہونے کا اعلان کر دیں مارچ ۱۹۱۳ء کے لیگ کے لکھنؤ والے سالانہ اجلاس میں تو محمد علی جناح شامل ہوئے تھے اور اس کے ترمیم شدہ دستور کی انھوں نے حمایت بھی کی تھی۔ لیکن لیگ کے یہ باقاعدہ ممبر نہیں ہوئے تھے ان دونوں کے اصرار پر محمد علی جناح نے ایک مرتبہ پھر لیگ کی پالیسی پر تبادلہ خیالات کیا اور لیگ میں اپنی شمولیت کا اعلان کر دیا یہیں سے مسلم لیگ سے محمد علی جناح کی عملی دلچسپیوں کا آغاز ہوتا ہے۔

مئی ۱۹۱۴ء میں آل انڈیا کانگریس نے انڈیا کونسل کی مجوزہ اصلاحات کے سلسلہ میں اپنا ایک وفد لندن بھیجا اس وفد کے سب سے ممتاز ممبر محمد علی جناح تھے اس سال لندن جانے سے قبل محمد علی جناح نے انڈیا کونسل کی مجوزہ اصلاحات کے خلاف کانگریس کے کراچی والے اور مسلم لیگ کے آگرہ والے اجلاس میں

قراردادیں منظور کرائیں تھیں۔ محمد علی جناح کی سیاسی صلاحیتوں کا ملک کی طرف سے یہ کھلا ہوا اعتراف تھا کہ کانگریس نے ان کو برطانوی پارلیمنٹ اور اہل برطانیہ کے روبرو اپنا ترجمان بناکر بھیجا اور اس موقع پر خود محمد علی جناح نے جس انداز سے ہندوستانیوں کا مطمع نظر حکومت برطانیہ اور انگریزوں کے آگے پیش کیا۔ اس نے انگریزوں کے دلوں پر ہندوستانیوں کی سیاسی فہم وتدبر کا سکہ بٹھا دیا۔ انگلستان کا کوئی معتمد اخبار ایسا نہیں تھا جس نے اس موقع پر محمد علی جناح سے انٹرویو نہیں کیا اور لندن کی کوئی معتمد سیاسی جماعت ایسی نہ رہی جہاں محمد علی جناح کے بیانات کا چرچا نہ ہوا ہو

فروری ۱۹۱۵ء میں گوپال کرشن گوکھلے کا انتقال ہوگیا۔ ہندوستانی سیاست کے اس امام کی بے وقت موت ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے بری طرح محسوس کی۔ محمد علی جناح نے اسی حادثہ کو وجہ بناکر ہندو مسلم اتحاد کی طرح ڈالی۔ اس سال کانگریس کا اجلاس بمبئی میں ہونے والا تھا محمد علی جناح نے کوشش کی کہ مسلم لیگ کا اجلاس بھی اس سال بمبئی ہی میں ہو۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۱۵ء میں لیگ کا اجلاس مسٹر مظہرالحق بیرسٹر پٹنہ کی زیر صدارت بمبئی میں ہوا بمبئی میں لیگ اور کانگریس کے اس اجتماع کو تاریخی حیثیت حاصل ہے اس لئے کہ اسی اجتماع میں ہندو مسلم مفاہمت کی کوششیں پہلی مرتبہ بارآور ہوئیں۔

اور محمد علی جناح کی قیادت میں ایک کمیٹی بنائی گئی اور ہندو مسلمانوں کے سیاسی مفاہمت کی ایک اسکیم تیار کرنے کا کام اس کمیٹی کے سپرد ہوا۔ اس وقت ملک کی سیاسی صورت حال یہ تھی کہ حکومت کی طرف سے ۱۹۱۵ء

میں ریفارم کی دوسری قسط ہندوستان کو ملنے والی تھی اور اس موقع پر کانگریس ملک میں سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی جد وجہد کر رہی تھی لیکن سیاسی اقتدار اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا تھا جب تک وہ ہندوستان کی دوسری اکثریت سے سیاسی مفاہمت نہ کرے دوسری طرف مسلمانوں کو بھی مجوزہ اصلاحات کے معاملے میں گھاٹے میں رہنا منظور نہیں تھا اور ان کا اثر چونکہ اس وقت تک حکومت پر نہیں پڑ سکتا تھا جب تک .... ہندوستان کی اہم سیاسی جماعت سے سمجھوتہ نہ ہو جائے اس لئے مسلمانوں کے ذمہ دار حلقوں میں مفاہمت کی سچی خواہش پیدا ہو گئی تھی جس نے ملک میں ہندو مسلم سمجھوتہ کے لئے سازگار فضا پیدا کر دی تھی ۔ ایسے وقت میں مسلم لیگ اور کانگریس دونوں جماعتوں کی نظریں محمد علی جناح پر پڑیں ۔کیونکہ اس وقت ہندو مسلمان کے سیاسی اختلافات کو سمجھنے اور طے کرانے کی صلاحیت محمد علی جناح سے بہتر کسی لیڈر میں نظر نہ آتی تھی ۔چنانچہ محمد علی جناح نے یہ اہم اور نازک ذمہ داری قبول کر لی اور ایک کمیٹی کے ذریعہ ایک ایسی اسکیم تیار کر لی جس پر ہندو مسلمانوں کی سیاسی مفاہمت ہو سکتی تھی ۔

نومبر ۱۹۱۶ء میں کلکتہ میں سر سریندر ناتھ بینرجی کی صدارت میں لیگ اور کانگریس کا ایک مشترکہ اجلاس ہوا جس میں محمد علی جناح کی اسکیم کی روشنی میں وہ میثاق مرتب کیا گیا ۔ جسے "لکھنؤ پیکٹ" یا میثاق لکھنؤ کہتے ہیں اس میثاق کی آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس لکھنؤ نے محمد علی جناح کی زیر صدارت ۳۱ دسمبر ۱۹۱۶ء کو اور آل انڈیا نیشنل کانگریس کے سالانہ اجلاس امبکا چرن موزمدار کی صدارت میں ۲۶ دسمبر ۱۹۱۶ء کو تصدیق

کر دی اس موقع پر محمد علی جناح نے فرمایا:۔

"میں ہمیشہ سے پکا کانگریسی ہوں اور فرقہ وار ذہنیت کو میں نے کبھی پسند نہیں کیا لیکن اس کے باوجود میرے نزدیک مسلمانوں پر ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے کا جو الزام لگایا جا رہا ہے وہ بالکل غلط ہے اس موقع پر جب کہ ایک عظیم الشان قومی نظام نہایت تیزی کے ساتھ عالم وجود میں آ رہا ہے ایک اقلیت والی قوم کے لئے اس قومی نظام کی تشکیل میں حصہ لینے سے پہلے اپنی انفرادیت کی کامل حفاظت کا اطمینان حاصل کر لینا بہت ضروری ہے اور یہ اطمینان اور طمانیت بہ حیثیت ایک منفرد قوم کے اپنی سیاسی ہستی کے کامل اور مؤثر تحفظ ہی کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے"

"میثاق لکھنؤ جو مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان اسی سال مرتب ہوا ہے اس کی رو سے یہ طے کیا گیا ہے کہ مجالس قانون ساز کے آئندہ انتخابات میں ہندوستان کی اہم اقلیتوں کو مؤثر نمائندگی حاصل رہے اور یہ بھی طے پایا ہے کہ صوبوں کی مجالس قانون ساز میں مسلمانوں کی نمائندگی خاص نشستوں کے ذریعہ سے کی جائے چنانچہ اس تصفیہ کی رو سے صوبوں کی کونسلوں میں ان کی نیابت کا تناسب یہ ہوگا۔

صوبہ پنجاب	۵۰ فیصدی
صوبہ بنگال	۴۰ فیصدی
صوبہ متحدہ	۳۰ فیصدی

صوبہ بہار	۲۵ فی صدی
صوبہ متوسط	۱۵ فی صدی
صوبہ مدراس	۱۵ فی صدی
صوبہ بمبئی	۳۳ فی صدی

— یجسلیٹو کونسل کے منتخب شدہ ہندوستانی ممبروں کی کل تعداد کا ایک تہائی حصہ مسلمان ہوگا مختلف صوبوں میں جداگانہ حلقہائے انتخاب سے مسلمان ممبروں کا انتخاب ہوگا جو تناسب صوبائی کونسلوں میں مسلمانوں کو حاصل ہے ۔"

اسی سال ۱۹۱۶ء میں بمبئی کے مسلمانوں نے محمد علی جناح کو دوسری مرتبہ وائسرائے کی کونسل کے لئے اپنا نمائندہ منتخب کیا جہاں وہ اپنے انتہائی خودداراںہ انداز اور غیر معمولی سیاسی قابلیتوں کی بدولت اپنے ساتھیوں میں ممتاز مرتبہ حاصل کر چکے تھے۔ لیکن کونسل کی مصروفیتوں میں محمد علی جناح اپنی قومی سرگرمیوں کو نہ بھولے۔

میثاق لکھنؤ کی اگرچہ لیگ اور کانگریس کی طرف سے تصدیق ہو چکی تھی اور ملک کے ذمہ دار حلقوں میں یہ ہندو مسلم مفاد کا سنگ بنیاد سمجھا جاتا تھا لیکن ہندو مہاسبھا نے ابھی اس کی توثیق نہیں کی تھی اور نہ ہندوؤں نے بہ حیثیت جماعت اسے تسلیم کیا تھا اس کے باوجود محمد علی جناح کی تجویز سے کانگریس اور مسلم لیگ کی ایک مشترکہ کمیٹی بن گئی جسے اصلاحات کا اسکیم مرتب کرنے کا کام سپرد کیا گیا ۱۹۱۷ء میں یہ اسکیم مرتب ہو گئی اور کانگریس

اور مسلم لیگ کے مشترکہ وفد نے یہ اسکیم حکومت کے آگے بھی پیش کر دی۔ چنانچہ ہندوستان میں آئینی اصلاحات کے متعلق حکومت ہند نے حکومت برطانیہ کو جو رپورٹ بھیجی ہے اس میں اس مشترکہ اسکیم سے بحث کی ہر اور اصلاحات کی سفارشات میں بھی اس کا لحاظ رکھا ہے لیکن مسلم مطالبات کا کچھ زیادہ لحاظ نہیں کیا گیا جس کی وجہ سے عام مسلمانوں کو شکایات پیدا ہوگئیں۔

۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۲ء تک کا زمانہ ہندوستان میں سیاسی بحران کا زمانہ ہے۔ جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد ملک کے اندر اور باہر کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے کہ ہندوستانی سیاست میں اعتدال قائم نہ رہا ملک میں متعدد نئی نئی سیاسی تحریکیں پیدا ہوگئیں اور ان کو چلانے کے لئے بے شمار سیاسی جماعتیں عالم وجود میں آگئیں ملک کی قیادت سکون پسند معتدلین کے ہاتھ سے نکل گئی اور ہر جماعت کے انتہا پسند لیڈر اسٹیج پر نمودار ہوگئے۔ اس ہنگامے میں محمد علی جناح کہیں نظر نہیں آتے وہ بدستور کانگریس کے ممبر تھے لیکن کانگریس کی موجودہ پالیسی سے متفق نہ تھے وہ بدستور مسلم لیگ کے حامی رہے لیکن عوام کی توجہ اب مسلم لیگ سے ہٹ کر چند نئی اور ہنگامہ خیز جماعتوں کی طرف ہوگئی تھی۔ اس لئے محمد علی جناح کی ٹھوس ٹھنڈی اور تعمیری سرگرمیوں کے لئے کوئی میدان باقی نہ رہا تھا ۱۹۲۰ء میں گاندھی جی نے "ترک موالات" کی تجویز ملک کے آگے پیش کی۔ ناگپور والے کانگریس کے اجلاس میں اس پر غور کرنے کے لئے مختلف نقطہ خیال کے سیاسی رہنما اکھٹے ہوئے ان میں محمد علی

جناح بھی شریک تھے گاندھی جی کی اس تجویز کی سی آر داس اور محمد علی جناح دونوں نے مخالفت کی اور اس معاملے میں کانگریس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ سی آر داس کو تو بعد کو مولانا محمد علی اور گاندھی جی نے منا لیا لیکن محمد علی جناح کو یہ دونوں مطمئن نہ کر سکے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کانگریس سے محمد علی جناح کا عملی تعلق ختم ہو گیا۔

سنہ ۱۹۲۲ء کے بعد سیاسی بحران کا ردِّ عمل شروع ہوا قومی جوش و خروش کا نشہ اتر چکا اور اس کے بجائے فرقہ وارانہ منافرت کا بازار گرم ہوا ایک طرف شدھی و سنگھٹن تبلیغ اور تنظیم کے نام سے ہندو مسلمان کے درمیان مغائرت کی خلیج وسیع کی جانے لگی تو دوسری طرف قوم پرستی کے پردے میں فرقہ وار برتری کی جد وجہد شروع ہو گئی اور ملک کی سیاست میں ایسی گتھیاں پڑ تی گئیں کہ ان کے کھولنے سے وہ انتہا پسند لیڈر بھی عاجز نظر آنے لگے جن کے ہاتھوں میں صحیح معنوں میں اس وقت ملک کی باگ دوڑ تھی۔

حالات کی اس غیر متوقع رفتار نے خصوصیت کے ساتھ ان مسلم زعما کو بہت پریشان کیا جنھوں نے قوم پرستانہ جذبات سے مغلوب ہو کر کانگریس سے مسلمانوں کے مستقبل کے متعلق کوئی وعدہ لئے بغیر محض اپنی ذاتی ذمہ داری پر انھیں بہ حیثیت جماعت سیاسی جنگ میں جھونک دیا تھا۔ انھیں محسوس ہونے لگا کہ اکثریت والی قوم ان کے ساتھ چال کر گئی۔ سیاسی جنگ میں مسلمانوں کو آلۂ کار بنا کر اس نے اپنے آپ کو آئندہ سیاسی اقتدار کی جد وجہد کے لئے منظم و تیار کر لیا لیکن مسلم زعما کا یہ احساس بعد

از وقت تھا اس لئے کہ سیاسی جنگ کا پہلا مرحلہ بہرحال کامیابی سے
طے ہو چکا تھا۔ ملک کی اکثریت کو اپنی قوت عمل اور مسلمانوں کی غیر منظم
حالت کا بھی اچھی طرح تجربہ ہو چکا تھا اور اب اسے اقتدار کی جنگ
میں مسلمانوں کو اپنے ساتھ لینے کی کوئی ضرورت نہیں رہی تھی۔

مسلم زعما نے عام مسلمانوں کی نظروں میں اپنی پوزیشن بچانے کے
لئے خود اپنی طرف سے ایک مرتبہ پھر ہندو مسلم مفاہمت کا سوال اٹھا دیا
لیکن اب کہ مفاہمت کی خواہش چونکہ یک طرفہ تھی اس لئے باوجود ان
کی مخلصانہ سعی اور کوششوں کے مفاہمت کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی
اس دوران میں ملک کی فضا بد سے بدتر ہوتی گئی، مسلم لیڈروں کی مسلسل نا
کامیوں کے باعث خود مسلمانوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ تنظیم تو یوں بھی مسلمانوں
میں نہیں تھی، اس پر آپس کے اختلاف نے ان کی جماعت کو اور بھی منتشر
اور پراگندہ کر دیا۔

اس عالم میں محمد علی جناح ۱۹۲۴ء میں پھر ایک مرتبہ مسلم لیگ کے
اسٹیج پر نظر آتے ہیں اور ۱۹۲۷ء میں پراگندہ مسلمانوں کو چند تجاویز کے
ذریعہ جو "تجاویز" دہلی کے نام سے موسوم ہیں مسلم لیگ کے جھنڈے کے
نیچے جمع کرتے ہیں ان تجاویز کے ذریعہ ملک میں مسلم مفاد کی حفاظت کے
ساتھ ساتھ ہندو مسلم مفاہمت کی آخری کوشش کی جاتی ہے۔ کانگریس
کی ورکنگ کمیٹی ان تجاویز کو مان لیتی ہے اور آل انڈیا کانگریس کے مدراس
والے اجلاس میں بھی یہ تجاویز منظور ہو جاتی ہیں لیکن کانگریس کی یہ منظوری
محض برائے بیت ثابت ہوتی ہے اس لئے کہ انھیں ہندو مہاسبھا تسلیم
نہیں کرتی اور نہ خود کانگریس ہی ان کا لحاظ رکھتی ہے۔

۱۹۲۸ء میں جدید اصلاحات کے تعین کے لئے سائمن کمیشن ہندوستان آیا، کانگریس نے اس کا بائیکاٹ کیا اور محمد علی جناح بھی اس معاملہ میں کانگریس کے ساتھ ہو گئے لیکن لیگ میں سر محمد شفیع کی زیر قیادت ایک ایسی جماعت اٹھ کھڑی ہوئی جس نے سائمن کمیشن سے اشتراک عمل کی حمایت کا نتیجہ یہ ہوا کہ لیگ میں پھوٹ پڑ گئی لیکن یہ پھوٹ بالکل عارضی تھی اور بہت جلد مسلم لیگ کے دونوں حصے محمد علی جناح کی قیادت میں متحد ہو گئے۔ اسی دوران میں دہلی میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا اور ہندوستان کے لئے مناسب حال دستور مرتب کرنے کے لئے ایک آل پارٹیز کانفرنس کے کئی اجلاس ہوئے جس میں محمد علی جناح کی تجاویز زیر بحث آئیں لیکن نتیجہ ساری بحثوں کا کچھ نہ نکلا، لیگ اور مہا سبھا کی کشمکش میں شدید اختلافات پر یہ کانفرنس ختم ہو گئی۔

کانگریس نے اس ناکامی کے بعد مئی ۱۹۲۸ء میں پنڈت موتی لال نہرو کی زیر صدارت ایک اور کمیٹی بنائی اس کمیٹی نے دسمبر تک اپنی رپورٹ مرتب کر لی اس رپورٹ پر غور کرنے کے لئے کانگریس نے بمبئی میں ایک آل پارٹیز کنونشن طلب کیا، لیگ کی طرف سے محمد علی جناح بہ حیثیت نمائندہ شریک ہوئے اور مسلم نقطہ نگاہ کو نہایت وضاحت کے ساتھ کنونشن کے آگے پیش کیا لیکن بےسود مہا سبھا نے لیگ کی مخالفت میں پورا زور خرچ کر دیا اور خود کانگریس نے بھی لیگ کے نقطہ نگاہ سے ہمدردی نہیں کی۔

بالآخر کانگریس اور ہندو مہا سبھا کی اس ذہنیت کے مقابلے کے لئے ۲۸ مارچ ۱۹۲۹ء کو محمد علی جناح نے نہرو رپورٹ پر نہایت سخت تنقید کی اور دہلی کی مسلم اتحاد کے مقابلے میں اس کو ہندو تجاویز سے تعبیر کیا۔

اسی اجلاس میں محمد علی جناح نے وہ مشہور "چودہ نکات" پیش کئے جو بعد کو ہندوستانی مسلمانوں کی جداگانہ سیاست کی بنیاد قرار پائے اور جو برابر آج تک مسلمانوں کے قومی مطالبات سمجھے جاتے ہیں وہ نکات یہ ہیں:

۱- آئندہ دستور ہند کی شکل وفاقی ہوگی۔

۲- صوبوں کو کامل خودمختاری حاصل ہوگی اور ہندوستان کے تمام صوبوں کو بلا کسی استثنار کے اصلاحات دی جائیں گی۔

۳- ملک کی تمام مجالس قانون ساز کی ترتیب اس معین اصول پہ ہوگی کہ ہر صوبہ میں اقلیتوں کو کافی اور مؤثر نیابت حاصل رہے لیکن کسی اکثریت کو گھٹا کر اقلیت یا مساوات کے درجہ تک نہ پہنچایا جائے۔

۴- مرکزی مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کی نیابت ربع، ایک تہائی سے کم نہ ہوگی۔

۵- فرقہ وار گروہوں کی نمائندگی و نیابت بطریق جداگانہ انتخاب ہوگی جیسی کہ اب ہوتی ہے البتہ ہر قوم مجاز ہوگی کہ اپنی خوشی سے اپنے اس قانونی حق سے خود دست بردار ہو جائے۔

۶- ہندوستانی صوبوں کی تقسیم میں آئندہ کوئی تبدیلی ایسی نہیں کی جائے گی جس کا اثر صوبہ سرحد، پنجاب اور بنگال کی مسلم اکثریتوں پر پڑے۔

۷- تمام ملتوں کے لئے ضمیر و مذہب کی آزادی یعنی عقیدہ و یقین کی آزادی، تنظیم و اجتماع کی آزادی کی ضمانت کی جائے۔

۸- کوئی مسودہ قانون، قرارداد یا تحریک کسی مجلس قانون ساز میں منظور نہ ہو سکے گی اگر کسی قوم کے ¾ ممبران مجلس اس کو اپنے قومی مفاد کے خلاف قرار دیں۔

۹۔ سندھ کو بغیر کسی شرط کے صوبہ بمبئی سے علیحدہ کر کے ایک جدید صوبہ بنایا جائے۔

۱۰۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے مساوی اصلاحات نافذ کی جائیں۔

۱۱۔ سلطنت کے ذمہ دار عہدوں اور سرکاری ملازموں میں مسلمانوں کو دوسری قوموں کے پہلو بہ پہلو صلاحیت دکارکردگی کا لحاظ رکھتے ہوئے مناسب حصہ دیا جائے۔

۱۲۔ دستور اساسی میں ایسے کافی تحفظات رکھے جائیں جن کی رو سے اسلامی کلچر اسلامی تہذیب و تمدن کی حفاظت و ترقی اور مسلم تعلیم زبان رسم الخط و مذہب پرسنل لا اور اسلامی اداروں کی ترقی و حمایت کئے لئے سلطنت اور سلطنت کے دوسرے اداروں سے گرانٹ میں مناسب حصہ حاصل کیا جا سکے۔

۱۳۔ کسی صوبہ کی کابینہ وزارت کم از کم ⅓ مسلم نیابت کے بغیر ترتیب نہ دی جائے۔ یعنی ہر وزارت کی ترتیب میں ⅓ مسلم وزیروں کی شمولیت ضروری ہوگی۔

۱۴۔ دستور اساسی میں کوئی ترمیم یا تبدیلی اس وقت تک نہ کی جائیگی جب تک وفاق ہند کے سارے ممبر یعنی ہندوستان کے صوبے اور دیسی ریاستیں اس کو تسلیم نہ کر لیں۔

۱۹۳۰ء میں لارڈ ارون کی کوششوں سے لندن میں ایک گول میز کانفرنس کا اعلان ہوا تاکہ سائمن کمیشن کی سفارشات کی روشنی میں ہندوستان کے لئے ایک جدید دستور مرتب کیا جا سکے۔ اس کانفرنس میں ہندوستان

کے ہر طبقے کے نمائندے چنے گئے اور انھیں بھی یہ موقع دیا گیا کہ وہ جدید دستور کی تدوین میں اپنی رائے کا اظہار کریں کانگریس نے اس دعوت نامہ کو قبول نہیں کیا۔ البتہ مسلم لیگ کی طرف سے محمد علی جناح لندن گئے ۱۳ نومبر ۱۹۳۰ء میں لندن میں گول میز کانفرنس کا پہلا اجلاس ہوا لیکن کام کی بات کوئی نہ ہو سکی اور نہ ہو سکتی تھی اس لئے کہ ہندوستانی نمائندے گول میز کانفرنس میں تو شریک ہو گئے مگر بالکل خالی ہاتھ اپنے آپس کے اختلافی مسائل کا ان کے پاس کوئی حل نہیں تھا اور بغیر اس کے اصلاحات کی گفتگو شروع نہیں کی جا سکتی تھی اس موقع پر محمد علی جناح کی کوششوں سے ایک میناریٹی کمیٹی بنائی گئی جس کے سپرد یہ کام ہوا کہ ہندوستان کے فرقہ وارانہ نیابت اور انتخاب کے مسئلے کو حل کر دے۔

۱۹۳۱ء میں گاندھی ارون سمجھوتہ ہوا اور گاندھی جی کانگریس کے واحد نمائندے کی حیثیت سے دوسری گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے میناریٹی کمیٹی نے گاندھی جی کی آمد کو غنیمت جانا اور ان کی مدد سے فرقہ وارانہ نیابت اور انتخاب کے مسئلے کو حل کرنا چاہا لیکن آپس کے تصفیہ کے متعلق میناریٹی کمیٹی کی ساری کوششیں بیکار گئیں۔ ہندو مسلم نقطۂ نگاہ ایک نہ ہو سکا۔ کانگریس پارٹی نے اپنی طرف سے وزیر اعظم مسٹر ریمزے میکڈانلڈ سے درخواست کر دی کہ جدید دستور میں فرقہ وارانہ نیابت کے متعلق وہ اپنا فیصلہ صادر کریں۔ چنانچہ انھوں نے کمیونل ایوارڈ کے نام سے اپنا فیصلہ صادر کر دیا۔ جو مسلمانوں کی حد تک آج تک قائم ہے۔

گول میز کانفرنس کے موقع پر ہندو مسلم مفاہمت کے لئے آخری مرتبہ جن مسلم زعماء نے سرگرمی سے کوشش کی تھی ان میں محمد علی جناح اور سر آغا خان

کے نام پیش پیش نظر آتے ہیں۔

سنہ ۱۹۳۰ء سے سنہ ۱۹۳۴ء تک کا زمانہ محمد علی جناح کا زیادہ تر لندن میں گزرا۔ اس وقت ہندوستان میں مسلم لیگ پر رجعت پسندوں کا قبضہ تھا جنھوں نے اسے اپنے ذاتی اغراض کا آلہ کار بنا رکھا تھا۔ لیگ کے ساتھ آل پارٹیز مسلم کانفرنس تھی جو ہر خیالات کے مسلم زعماء کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کے لئے عالم وجود میں آئی تھی۔ انہی رجعت پسندوں کا میدان بن گئی جدید اصلاحات کے نفاذ کا زمانہ قریب آگیا تھا اور مسلمان کو اپنا ایک مرکز نظر نہ آتا تھا جس پر وہ متحد ہو کر جدید اصلاحات کے سلسلے میں رہنمائی حاصل کر سکیں۔ اسی مایوسی کے عالم میں مسلمانوں کو پھر اپنا پرانا محتاط لیڈر محمد علی جناح یاد آیا اور انھوں نے محمد علی جناح کو لندن تار دے کر مسلم لیگ کی قیادت کے لئے ہندوستان بلا لیا اور ۴ مارچ سنہ ۱۹۳۴ء کو حافظ ہدایت اللہ کی زیر صدارت لیگ کا اجلاس کیا اور محمد علی جناح کو مسلم لیگ کا مستقل صدر منتخب کر لیا۔

محمد علی جناح کے مستقل صدر منتخب ہوتے ہی مسلم لیگ میں گویا جان سی پڑ گئی اور وہ جماعت جو اپنے عالم وجود میں آنے کے بعد سے ملک کی عملی سیاست سے بے تعلق رہی تھی۔ پہلی مرتبہ سیاست کے میدان میں اتری۔ محمد علی جناح نے لیگ کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیتے ہی ایسے عنصر کو لیگ سے خارج کر دیا جس کا وجود لیگ کے لئے مضر ثابت ہو رہا تھا اور لیگ کے دستور اساسی میں ضروری ترمیم کے لئے ایک کمیٹی بنا ڈالی۔

اسی سال مرکزی اسمبلی کے انتخابات ہوئے اور محمد علی جناح کو مسلمانوں

نے بمبئی کے شہری حلقے سے بلا مقابلہ منتخب کیا۔ اسمبلی میں پہنچ کر محمد علی جناح نے اپنا ایک انڈیپنڈنٹ بلاک بنایا اور اپنی سیاسی قابلیت کے بل پر اس بلاک کو اس قدر با اثر بنا دیا کہ اسمبلی کی میزان اس کے ہاتھ میں آگئی۔

۱۹۳۵ء میں جوائنٹ پارلیمنٹری کی رپورٹ اسمبلی میں پیش ہوئی کانگریس پارٹی کے لیڈر بھولا بھائی ڈیسائی نے اس کو مسترد کر دینے کی تجویز پیش کی اور کمیونل ایوارڈ کے متعلق اپنا رویہ غیر جانب دارانہ رکھا۔ محمد علی جناح نے اس کے جواب میں ایک معرکہ آرا تقریر کی جس میں اس پر زور دیا کہ جب تک کمیونل ایوارڈ کا نعم البدل آپس میں مل بیٹھ کر نہ بنا لیں اس وقت تک کمیونل ایوارڈ کو منظور کر لینا چاہیئے چنانچہ اسمبلی میں محمد علی جناح کی یہ تجویز منظور ہو گئی۔

اپریل ۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس سر وزیر حسن کی زیر صدارت بمبئی میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس کو اس اعتبار سے اہمیت حاصل ہے کہ ۱۹۳۷ء میں ہندوستان میں جدید دستور نافذ ہونے والا تھا اور مسلم لیگ کو اس دستور کی پذیرائی کے سلسلے میں اپنے لیے ایک عملی پروگرام کا اعلان کرنا تھا اس اجلاس میں مسلم لیگ نے یہ فیصلہ کیا کہ ملک میں اس وقت تک جو حالات پائے جاتے ہیں ان کے پیش نظر جدید دستور کو قبول کر لیا جائے اگرچہ اس میں نقائص بہت ہیں اور ان کی موجودگی میں مجالس قانون ساز کی ذمہ داریاں بے حقیقت سی رہ جاتی ہیں تاہم اس وقت مناسب یہی ہے کہ ان اصلاحات سے جس قدر فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے وہ حاصل کیا جائے۔ اسی کے ساتھ یہ طے پایا کہ آل انڈیا مسلم لیگ انتخابات میں اپنے

امیدوار پیش کرے۔ محمد علی جناح کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ اپنی ماتحتی میں ایک پارلیمنٹری بورڈ قائم کریں جس میں کم سے کم (۲۵) ممبر شامل ہوں اور صوبوں کے عام انتخابوں میں مسلمانوں کی رہنمائی کریں۔

پارلیمنٹری بورڈ قائم کر لینا تو ایسا مشکل نہیں تھا لیکن انتخابی مہم میں مسلمانوں کی رہنمائی کرنا بہت مشکل تھا اس لئے کہ مسلمانوں میں کوئی تنظیم نہیں تھی اور نہ کسی مرکز پر وہ متحد تھے، مسلمانوں کے اس انتشار اور لامرکزیت کی ذمہ دار وہ چھوٹی چھوٹی مسلم جماعتیں تھیں جو مذہب کے نام پر قائم کی گئی تھیں اور جنھوں نے اپنے جماعتی اقتدار کی خاطر مسلمانوں کو سیاست کی راہِ مستقیم سے ہٹا کر پارٹی بازی میں پھنسا دیا تھا۔ ان جماعتوں کی موجودگی میں مسلمانوں کو ایک مرکز پر لانے کے معنی یہ تھے مسلم لیگ ان سب سے مقابلہ کرتی چنانچہ محمد علی جناح کو ان مشکلات کا اچھی طرح احساس تھا جو مسلمانوں کو نئے سرے سے ایک مرکز پر جمع کرنے میں پیش آنی ضروری تھیں لیکن وہ ان سے ہراساں نہیں ہوئے۔ پارلیمنٹری بورڈ کے قیام کے بعد انھوں نے ملک کا دورہ کیا، جگہ جگہ مسلم لیگ کی شاخیں قائم کیں مسلمانوں میں سرگرمیٔ عمل پیدا کی اور انھیں آمادہ کیا کہ بے معنی جوش و خروش کو چھوڑ کر اپنی قومی تعمیر کا ٹھوس کام کریں۔

جیسی کہ توقع تھی محمد علی جناح کی ان سرگرمیوں کی بعض مذہبی قسم کی مسلم جماعتوں کی طرف سے شدید مخالفت ہوئی اور کانگریس اور ہندو پریس نے اس کو پوری قوت سے ہوا دی۔ چنانچہ ان مسلم جماعتوں اور کانگریسی ہندوؤں کی طرف سے مخالفت کا یہ سلسلہ برابر اب تک جاری ہے

سنہ ۱۹۳۷ء میں نئے دستور کے ماتحت صوبوں میں عام انتخابات شروع ہوئے مسلم لیگ بھی میدان عمل میں آئی ' صرف چند مہینے کی تنظیمی جدوجہد کے بعد یہ توقع نہیں تھی بسلم لیگ کو اس انتخاب میں بہت زیادہ کامیابی ہو سکتی ہے ۔ تاہم صوبوں کے عام انتخابات میں اور انتخابات کے بعد مجالس قانون میں مسلم لیگ پارٹی کا گروپ قائم کرنے میں جس حد تک کامیابی ہوسکی وہ سب تنہا محمد علی جناح کی سیاسی مہارت اور سرگرمی عمل کا نتیجہ تھا ۔ اصل میں عام مسلمان اپنی قومی تنظیم اور آئینی جدوجہد کے مفہوم ہی سے نا آشنا تھے ان کی سیاسی زندگی ایک مسلسل ہڑبونگ اور بے معنی جوش وخروش سے عبارت رہی تھی ۔ اپنی جداگانہ قومی تعمیر کا بھولے سے بھی کبھی انھیں خیال نہیں آیا اور نہ انھیں یہ خیال دلایا گیا ' اب محمد علی جناح نے پہل کی تھی۔ اور جداگانہ قومیت کی تعمیر کا ایک مستقل پروگرام ان کے آگے رکھا تھا ظاہر ہے اس تعمیری پروگرام سے وہ رفتہ رفتہ ہی مانوس ہو سکتے تھے خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ مذہب کا نام لے لے کر بعض مسلم جماعتیں محمد علی جناح اور مسلم لیگ کی طرف سے برابر مسلمانوں کو بدظن کر رہی تھیں ۔ اس کا کوئی قرینہ ہی نہ تھا کہ محمد علی جناح کو اپنے پروگرام میں فوراً ہی کامیابی ہو جاتی لیکن محمد علی جناح ان مخالف حالات سے مایوس نہیں ہوئے اور اپنی سرگرمیوں کو بدستور جاری رکھا انتخابات کے وقت محمد علی جناح نے مسلم لیگ کی طرف سے جو اعلان کیا تھا وہ حسب ذیل چودہ دفعات پر مشتمل تھا :-

۱- مسلمانوں کے مذہبی حقوق کی حفاظت۔

۲- تشدد آمیز قوانین کی تنسیخ کی سعی۔

۳- ان تمام قوانین کی مخالفت جو ہندوستان کے مفاد کے لئے مضر ہوں

افراد کے حقوق اساسی پر اثر انداز ہوں یا ملک میں اقتصادی تصرفات کا دروازہ کھول دیں۔

۴۔ ملک کے نظم و نسق کے خرچ کو کم کر کے آمدنی کا بڑا حصہ ملک کے تعمیری اداروں پر خرچ کرنا۔

۵۔ ہندوستان کا فوجی خرچ گھٹانا اور فوج کو ہندوستانی بنانا۔

۶۔ ملک کی صنعتوں کو فروغ دینا۔

۷۔ کرنسی مبادلہ اور قیمتوں کو ملک کے اقتصادی فائدہ کے مطابق منتظم کرنا

۸۔ دیہاتی آبادی کی اقتصادی، معاشرتی اور تعلیمی فلاح کی کوشش کرنا۔

۹۔ زراعتی قرضہ میں تخفیف کے لئے قوانین بنانا۔

۱۰۔ ابتدائی تعلیم کو عام و لازمی بنانا۔

۱۱۔ اردو زبان و رسم الخط کی حفاظت کرنا۔

۱۲۔ مسلمانوں کی حالت کو مجموعی حیثیت سے بہتر بنانے کی تدابیر اختیار کرنا

۱۳۔ ہندوستانیوں پر سے محاصل کے بوجھ کو کم کرنا۔

۱۴۔ ملک میں صحیح رائے عامہ اور عام سیاسی بیداری پیدا کرنا۔

اسی کے ساتھ محمد علی جناح نے یہ اعلان بھی کر دیا تھا کہ مجالس قانون ساز میں عام اصول جس پر مسلم لیگ کے ممبر کام کریں گے وہ یہ ہے۔

۱۔ موجودہ پروونشل آئین اور مجوزہ فیڈرل اسکیم کو بدل کر اس کی جگہ کامل ڈیموکریٹک سلف گورنمنٹ قائم کرنا۔

۲۔ جب تک یہ مقصد حاصل نہ ہو مسلم لیگ مختلف مجالس قانون ساز کے ذریعہ وہ مفاد حاصل کرنے کی کوشش کرے گی جو اہل ملک کی قومی زندگی اور ان کی فلاح و ترقی کے لئے ضروری ہوں گے۔ چنانچہ انتخاب کے بعد سے

مسلم لیگ کے ممبر صوبوں کی مجالس قانون ساز میں اسی اصول پر کام کرتے ہیں اور لیگ پارلیمنٹری بورڈ اس معاملہ میں ان کی نگراں ہے۔

محمد علی جناح کی ان سرگرمیوں کے جواب میں کانگریس کی طرف سے مسلم ماس کنٹیکٹ کی تحریک صدر کانگریس پنڈت جواہر لال نہرو کی زیر نگرانی شروع ہوئی اور اس معاملہ میں کانگریس نے خود ان مسلمانوں کو آلہ کار بنایا جو کانگریس میں شریک تھے۔ کانگریس کے اس اقدام کا محمد علی جناح نے فوراً اور بہت مؤثر جواب حاضر کیا۔ ایک طرف مسلسل کئی بار اور مدلل بیان شائع کئے۔ جس میں مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے والی کانگریسی پالیسی پر روشنی ڈالی اور مسلمانوں کے مستقبل کے سیاسی خطرات سے آگاہ کیا۔ دوسری طرف اپنی تنظیمی سرگرمیوں کو اور زیادہ تیز کر دیا جگہ جگہ ملک میں دورہ کیا جلسے کئے مسلمانوں کے آگے ملک کی عملی سیاست کا خاکہ پیش کیا اور اپنی جداگانہ قومیت کی تعمیر کی ترغیب دلائی، محمد علی جناح کی یہ جوابی کارروائی اس قدر مؤثر ثابت ہوئی کہ مسلم ماس کنٹیکٹ والی تحریک عملاً ناکام رہی اور عام مسلمانوں میں مسلم لیگ سے ہمدردی بڑھ گئی، چنانچہ اکتوبر ۱۹۳۷ء میں لیگ کا جو سالانہ اجلاس محمد علی جناح کی زیر صدارت لکھنؤ میں ہوا تھا وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے اس قدر اہم اور شاندار تھا اور اس کثرت سے مسلمان ملک کے طول عرض سے آکر اس میں شریک ہوئے اور اس میں بے پناہ جوش وخروش کا اظہار کیا گیا تھا کہ لیگ کی تاریخ میں ایسے کامیاب اجلاس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ اس اجلاس میں محمد علی جناح نے خطبہ بھی نہایت معرکۃ آرا پڑھا ایک طرف آپ نے برطانوی حکومت کی سیاسی چالوں کا جائزہ لیا۔ دوسری طرف کانگریس اور ہندوؤں کی ذہنیت پر احتساب کیا اور مسلمانوں کو تلقین

کی کہ وہ ان دونوں کے مقابلے میں اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے ایک مرکز پر متحد ہو جائیں۔

محمد علی جناح کا یہ خطبہ صدارت کانگریس کو کھلا ہوا چیلنج تھا جس کے بعد گاندھی جی نے محمد علی جناح سے سمجھوتہ کی بات چیت کرنی چاہی اس سے پہلے جواہر لال نہرو اور راجندر پرشاد نے بھی محمد علی جناح سے گفتگو کی تھی مگر وہ ادھوری رہ گئی تھی، اب کہ گاندھی جی نے نئے سرے سے اس مسئلے کو اٹھایا، ایک مدت تک گاندھی جی اور صدر کانگریس سبھاس چندر بوس کی محمد علی جناح سے خط و کتابت رہی اور ۱۹۳۸ء میں ان دونوں کی محمد علی جناح سے بالمشافہ گفتگو بھی ہوئی لیکن یہ ساری تگادو بیکار گئی اور لیگ اور کانگریس کا نقطہ نگاہ ایک نہ ہو سکا۔

اسی سال محمد علی جناح کی ذاتی کوششوں سے بنگال اور پنجاب کی وزارتوں سے لیگ کا معاہدہ ہو گیا، آسام میں لیگ کی وزارت قائم ہو گئی (جو بعد کو ٹوٹ گئی) سندھ میں لیگ کی وزارت قائم کرنے کے امکانات پیدا ہوئے محمد علی جناح نے بہ نفس نفیس اس مہم کی قیادت کی لیکن بعض مسلمان ممبروں کی وعدہ خلافی اور ذاتی غرض مندیوں کے باعث محمد علی جناح کو اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔

۱۹۳۹ء میں مسلم لیگ کی سرگرمیاں تیز ہو گئیں اور ہندوستان کے عام مسلمانوں میں بھی اس کا اعتبار قائم ہو گیا۔ اکثر مقامات پر بعض مسائل میں کانگریس اور مسلم لیگ کی رسہ کشی بھی ہوئی جس میں مسلم لیگ کو کامیابی ہوئی۔

اگست ۱۹۳۹ء میں یورپ کی سیاسی فضا مکدر ہو گئی اور ہر لحہ جنگ چھڑ جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا۔ اس نئی صورت حال نے ملک کی سیاست پر بھی اثر ڈالا اور کانگریس اور مسلم لیگ کے لئے یہ طے کرنا ضروری ہو گیا کہ جنگ

چھڑ جانے کی صورت میں ملک کی ان اہم سیاسی جماعتوں کی پالیسی کیا ہوگی۔
محمد علی جناح نے اس مسئلہ کو طے کرنے کے لیے لیگ کونسل کا اجلاس دہلی طلب کیا اور کانگریس نے واردھا میں لیگ کونسل کا اجلاس کانگریس سے پہلے ہوا اور اس میں اس مسئلے پر سخت معرکہ پڑا۔ لیگ کے بعض ممبر جنگ کی صورت میں غیر مشروط طور پر برطانیہ کی حمایت پر مائل تھے اور بعض اس موقع پر اس کا مقاطعہ کرنا چاہتے تھے۔ بحث بہت نازک صورت اختیار کر گئی خصوصاً اس لیے کہ لیگ کے دو ذمہ دار لیڈر سر سکندر حیات خاں اور مولوی فضل الحق اپنے اپنے صوبوں میں لیگ کونسل کے مشورے کے بغیر ہی حکومت برطانیہ کی غیر مشروط حمایت کا اعلان کر چکے تھے لیکن عین اس وقت جب کہ لیگ کی اس اندرونی کشمکش کے باعث عام طور پر یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ لیگ میں پھوٹ پڑ جائے گی محمد علی جناح نے انتہائی تدبر و دانش مندی سے کام لے کر جنگ کے مسئلے میں لیگ کونسل کے فیصلہ کو کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس تک ملتوی کر دیا اور جب کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے یہ اعلان کیا کہ "جب تک حکومت برطانیہ یہ قرار نہ کرلے کہ جنگ کے بعد ہندوستان کی آزادی تسلیم کر لی جائے گی کانگریس یوروپین جنگ میں حکومت برطانیہ کا ساتھ نہیں دے سکتی" تو مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے ایک طویل قرارداد میں حکومت برطانیہ اور کانگریسی وزارتوں سے مسلمانوں کو جو شکایات تھیں ان کا ذکر کرتے ہوئے یہ شرط پیش کی کہ "جب تک حکومت برطانیہ ان شکایتوں کو دور کرنے کا وعدہ نہ کرلے مسلمان یورپین جنگ میں حکومت برطانیہ کی حمایت نہیں کر سکتے" اس کے ساتھ ہی لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے حکومت ہند اور کانگریس سے گفتگو کرنے کا پورا پورا اختیار جناح کو دیا۔

کانگریس اور لیگ کے ان فیصلوں سے ملک کی سیاست میں انتشار پیدا ہوگیا اور ہندوستان کی عارضی مرکزی حکومت کے قیام کا مسئلہ جسے حکومت ہند نے اٹھایا تھا کھٹائی میں پڑگیا۔ وائسرائے ہند نے اس انتشار کو دور کرنے کی انتہائی کوشش کی۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے ذمہ دار لیڈروں سے مشورہ کیا اور ملک کی دوسری چھوٹی بڑی جماعتوں کے لیڈروں سے اس گتھی کے سلجھانے میں امداد کی درخواست کی لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا کانگریس اور لیگ کا نقطہ نگاہ ایک نہ ہوسکا اور نہ ان دونوں جماعتوں میں آپس کی مصالحت کا کوئی قرینہ پیدا ہوا۔ اگرچہ اسی مقصد کے لئے گاندھی جی اور پنڈت نہرو کی کئی ملاقاتیں بھی ہوئیں۔ پنڈت نہرو اور محمد علی جناح کی آخری ملاقات میں یہ طے ہوا تھا کہ یہ دونوں بعد کو اپنی فرصت سے فرقہ وار مسائل پر گفتگو کریں گے لیکن اس وقت کے آنے سے پہلے ہی کانگریسی وزارتوں نے اس عذر کو سامنے رکھ کر کہ حکومت برطانیہ نے مقاصد جنگ کی اطمینان بخش طریقہ پر تشریح نہیں کی اپنے اپنے صوبوں سے استعفیٰ دیدیا اور اس موقع پر کانگریس کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے محمد علی جناح نے "یوم نجات" منانے کا اعلان کر دیا اس اعلان کا ہونا ہی تھا کہ لیگ اور کانگریس کے درمیان مخالفت کی خلیج اور زیادہ وسیع ہوگئی اور پنڈت نہرو نے فرقہ وار مسائل پر محمد علی جناح سے گفتگو کرنے سے بھی انکار کر دیا۔

لیگ اور کانگریس کے درمیان گفتگوئے مصالحت نہ ہوسکنے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ لیگ کو ہمیشہ سے یہ اصرار رہا کہ اسے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت تسلیم کرکے گفتگو کی جائے اور کانگریس اسی مطالبہ کو تسلیم

کرنے سے ہمیشہ انکار کرتی رہی۔

چنانچہ آخر دسمبر ۱۹۳۹ء تک ہندوستانی سیاست میں انتشار قائم ہے۔ کانگریس یہ سوچ رہی ہے کہ دوسرا قدم کس انداز سے اٹھایا جائے جو مؤثر ثابت ہو۔ مسلم لیگ یہ دیکھ رہی ہے کہ حکومت برطانیہ اسکی شکایتیں دور کرنے کے لئے کیا صورت اختیار کرتی ہے ہندو مہاسبھا مصر ہے کہ ہندوؤں کی واحد نمائندہ جماعت صرف وہی ہے اسی سے گفتگو کی جائے۔ اچھوت اعلان کر رہے ہیں کہ مستقبل کے اعلان میں انہیں بھی منہ کھولنے کی اجازت دی جائے۔ اعتدال پسند حکومت کو متنبہ کر رہے ہیں کہ انتہا پسندوں کی پالیسی سے متاثر ہوئے بغیر ہندوستان کا دستور ترتیب دیا جائے وغیرہ۔

بہرحال ملک کی فضا گو اب تک پوری طرح محمد علی جناح کے موافق نہیں ہوئی ہے لیکن ان کی سرگرمیاں بدستور جاری ہیں اور ان کی قیادت میں اس وقت مسلم لیگ کو سیاسی حیثیت سے اس قدر زبردست اہمیت حاصل ہوگئی ہے کہ اب نہ اس کو کانگریس نظر انداز کر سکتی ہے اور نہ حکومت۔ مسلمانوں کی جداگانہ قومی تعمیر کے سلسلے میں محمد علی جناح کی کامیاب حکمت عملی کی یہ بڑی زبردست شہادت ہے۔

محمد علی جناح کی سیاسی زندگی کا جو مختصر سا خاکہ ہم نے پچھلے اوراق میں پیش کیا ہے اس کے مطالعہ کے بعد غالباً ان کی سیاست کو سمجھنا کچھ مشکل نہیں رہتا۔

محمد علی جناح اپنی سیاسی زندگی کے ہر دور میں نہایت محتاط اور

دوراندیش انتہائی متوازن دماغ اور با اصول سیاست داں نظر آتے ہیں، غیر ذمہ دارانہ جوش و خروش، بے معنی شور و غل اور بے مقصد ہنگاموں کے وہ کبھی قائل نہیں ہوئے اور نہ ٹھوس سیاسی مسائل میں انھوں نے دور از کار اور محض جذباتی "تاویلات کی قوت کو کبھی تسلیم کیا۔

سیاست میں ہمیشہ سے ان کا ایک ہی اصول ہے "زندہ رہو اور دوسروں کو زندہ رہنے دو" اور اسی اصول پر وہ اپنی زندگی بھر اسی مضبوطی سے قائم نظر آتے ہیں کہ نہ اپنی شہرت اور نام آوری کی ترغیب انھیں اس سے ہٹا سکتی ہے اور نہ اپنوں پرایوں کے طعن و تشنیع انھیں اس اصول سے برگشتہ کر سکتے ہیں۔

ملک جب تک ان کے اس اصول کی قدر کرتا ہے وہ پورے خلوص جوش و سرگرمی سے اس کی قیادت کرتے ہیں۔ لیکن ملک جب غیر ذمہ دارانہ جوش و خروش اور بے مقصد ہنگاموں کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے وہ نہایت خاموشی سے اسٹیج سے ہٹ جاتے ہیں۔

وجہ ظاہر ہے بے مقصد ہنگاموں کے وہ قائل نہیں اور ملک کے ساتھ جذبات اور تاثرات کی رو میں بہنا انھیں منظور نہیں!

محمد علی جناح کے سیاسی حریفوں کی طرف سے سب سے بڑا اعتراض ان پر یہی ہے کہ وہ محض "آرم چیئر پالیٹیشن" یعنی ایسے سیاسی مدبر ہیں جو عمل کی زحمتوں میں گرفتار ہونا پسند نہیں کرتے لیکن ہمارے نزدیک اس اعتراض میں کوئی وزن نہیں ہے اس لئے کہ مقصد عمل میں آج تک کبھی ہم آہنگی پیدا نہیں ہوئی اور نہ کبھی ایسا موقع ہی آیا کہ محمد علی جناح کی عملی صلاحیتو

کا امتحان ہو سکتا ہے :-

آج سے بہت پہلے جب محمد علی جناح آل انڈیا کانگریس کے رہنماؤں میں گنے جاتے تھے، سیاست عملی کی بنیاد پڑی اور مقصد عمل میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے ہندو مسلم مفاہمت کا خیال ہوا کانگریس نے اس کی ذمہ داری محمد علی جناح پر ڈالی، محمد علی جناح نے چھ برس کی مسلسل کوششوں کے بعد مفاہمت کی اسکیم تیار کی اور اسی اسکیم کی بنیادوں پر سیاسی جدوجہد کے لئے متحدہ قومی محاذ کا خاکہ تیار کیا۔ مفاہمت کی اسکیم ۱۹۱۶ء میں منظور ہوگئی مگر بے معنی ایک دن کے لئے بھی اس پر عمل کی نوبت نہ آئی۔ اسی کے ساتھ متحدہ قومی محاذ کا وہ خاکہ بھی بے معنی ہو کر رہ گیا جو اسی اسکیم کی بنیاد پر تیار کیا گیا تھا۔ ملک سیاسی بحران میں مبتلا ہو گیا، ٹھوس اور تعمیری پروگرام سے اسے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ محمد علی جناح کی تعمیری پالیسی کو کامیابی کے بعد ناکامی ہوئی —— اب محمد علی جناح کے لئے دو ہی راستے کھلے ہوئے تھے یا تو وہ اپنے سیاسی اصول کو تج دیں اور بے مقصد ہنگاموں میں عوام کے ساتھ شامل ہو جائیں یا خاموشی کے ساتھ اسٹیج سے اتر آئیں۔ محمد علی جناح نے اسٹیج سے نیچے اترنا پسند کیا —— ان کے نزدیک ہندوستانیوں پر اگرچہ دیوانگی طاری تھی کہ اپنی صفوں کی درستی اور اپنے مقصد میں ہم آہنگی پیدا کئے بغیر جنگ چھیڑ دی تو وہ (محمد علی جناح) اپنے آپ کو اس دیوانگی میں مبتلا کرنا نہیں چاہتے تھے۔

جس سیاسی کشمکش کو آزادی کی جنگ کے نام سے یاد کیا جا رہا ہے محمد علی جناح کی رائے میں وہ صرف ہندو اقتدار کی جنگ تھی جس میں مسلمانوں کو چالاکی سے آلہ کار بنایا گیا تھا اور اس جنگ میں مسلمانوں کے شامل ہونے

کے معنی یہ تھے کہ وہ خود اپنی غلامی پر مہر لگا لیں ——— یہ رائے محمد علی جناح کو بہت مہنگی پڑی وہ ایک دم قوم پرست سے فرقہ پرست کہلانے لگے اور خود مسلمانوں نے انھیں رجعت پسند کا خطاب دیا ——— لیکن محمد علی جناح اب بھی وہیں تھے اور مسلمانوں کی خاطر بھی اپنا اصول بدلنے کو تیار نہیں تھے بہ ظاہر انھیں مسلمانوں میں سستی شہرت کی تمنا نہیں تھی۔ کچھ دنوں بعد خود مسلمانوں کا نظریہ بدل گیا۔ انھیں پھر محمد علی جناح کی رہنمائی حاصل کرنے کی تمنا ہوئی۔ محمد علی جناح بغیر کسی تکلیف کے آج پھر انھیں میں موجود ہیں "رجعت پسند" کی حیثیت سے نہیں "قائد اعظم کی حیثیت میں! لیکن سیاسی اصول ان کا اب بھی وہی ہے "زندہ رہو اور دوسروں کو زندہ رہنے دو" اور اسی اصول پر آج وہ پوری سرگرمی سے مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کی تعمیر میں مصروف ہیں۔

———

۹ ستمبر ۱۹۲۹ء کو بمبئی میں جناح ہال کا افتتاح ہوا، یہ محمد علی جناح کی قومی خدمات کا صلہ تھا ——— ان محمد علی جناح کی قومی خدمات کا صلہ جو کانگریس کے نزدیک ہندوستان کے قوم پرست اور محبوب رہنما تھے ——— گاندھی جی کے بعد یہ اعزاز غالباً صرف محمد علی جناح ہی کے حصہ میں آیا کہ جیتے جی کانگریس نے ان کی یادگار قائم کر دی ——— مسز نائیڈو نے اس ہال کا افتتاح کیا تھا اور اپنی افتتاحی تقریر میں کہا تھا:

> "جناح ہندو مسلم اتحاد کا قاصد ہے اور ایک ایسی خوش نصیب ہستی ہے جس کے ہم وطنوں نے اپنے وطن ہی میں اس کے جیتے جی اس کی قدر کی"

اور مسز اینی بسینٹ نے کہا تھا۔

"جناح جیسی شخصیتیں بنی نوعِ انسان کے گلے کا ہار ہیں جن کی یاد ہمیشہ تازہ رہے گی"۔

کانگریسی جناح کے بعد یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ مسلم لیگی سیاست اور لیگی جناح کے متعلق لوگوں کی کیا رائے ہے۔ بہ ۱۹۳۶ء کے آخر میں لارڈ لوتھین جنھوں نے دستور جدید کی تدوین میں کام کیا تھا ہندوستان کے دورے پر آئے تھے۔ یہاں انھوں نے کانگریس کے اجلاس میں بھی شرکت کی اور ملک کے سیاسی لیڈروں سے بھی تبادلہ خیال کیا اور یہاں سے واپسی پر سیاسیاتِ ہند پر اپنے خیالات اس طرح ظاہر کئے ہیں

"ہندوستان کی سیاست میں کانگریس کے علاوہ دو اہم عُنصر اور ہیں مسلمان اور والیانِ ریاست۔ جدید دستور کے نفاذ نے مسلمانوں میں ایک نہایت اہم حرکت پیدا کر دی ہے مسلمانوں کی تعداد اب آٹھ کروڑ سے زیادہ ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ گیارہ صوبوں میں سے چار صوبوں میں مسلمانوں کو عملاً مستقل قابو حاصل ہے اور دوسرے صوبوں کے اندر نیابت کے سلسلے میں تناسب آبادی سے زیادہ حق حاصل ہے اور ووٹ بھی جُداگانہ حلقوں کی صورت میں دیتے ہیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ معاشرتی اصلاحات سے متعلق مسلمانوں کے پروگرام اور کانگریس کے پروگرام میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ البتہ مسلمان سول نافرمانی کے اُصول کو نہیں مانتے۔ حال میں مسلم لیگ نے بھی اعلان کر دیا ہے کہ ہندوستان کی منزلِ مقصود آزادی ہے۔ لیکن مسلمان

اس بات کو فراموش نہیں کر سکتے کہ روشن خیال کانگریسیوں کے غیر فرقہ دارانہ دعاوی چاہے کچھ ہوں لیکن کانگریسیوں کی اکثریت ان متعصب ہندوؤں پر مشتمل ہے۔ جو مسلمانوں اور برطانیہ کی صدیوں کی حکومت کے بعد اب ہندو راج کی قیام کی منتظر ہے۔ مسلمانوں کو ایک اقلیت کی حیثیت سے اپنے مستقبل کے متعلق خطرہ ہے۔ کیونکہ کانگریس ایک طرف نوجوان مسلمانوں کو اپنے عقیدے قومیت متحدہ پر لاڈالنے کی جو کوشش کر رہی ہے اور دوسری طرف وہ مسلمان کسانوں کو اپنے زرعی پروگرام کا گرویدہ بنانا چاہتی ہے ان چیزوں نے مسلمانوں کی ایک زبردست اکثریت کو از سر نو ایک زندہ پارٹی کی صورت میں متحد اور مستحکم بنادیا ہے۔ اس پارٹی کا نام "مسلم لیگ" اور اس کے لیڈر کا نام "محمد علی جناح" ہے۔ اس وقت مسلمانانِ ہند کی پوزیشن وہی ہے جو آئرلینڈ میں السٹر کی ہے ایک سیاسی اقلیت کی حیثیت سے ان کی تنظیم کی حقیقی بنیاد مذہب کا اختلاف ہے اور اگر یورپ کا تمام تجربہ غلط نہیں ہے تو میں کہہ سکتا ہوں، ہندوستان سے فرقہ دارانہ عنصر دور ہونے میں ایک طویل مدت درکار ہوگی فیڈریشن پر مسلمانوں کو ایک ہی اعتراض ہے وہ یہ ہے کہ تمام تحفظات کے باوجود فیڈریشن کے ذریعہ مرکزی وفاقی حکومت میں ایک مستقل ہندو اکثریت مستحکم ہو جائے گی۔

اور فن سیاست اور محمد علی جناح کے متعلق ایک مسلم نقطۂ نظر یہ ہے "سیاست فی الحقیقت ماحول کی بے اعتدالیوں اور عملی زندگی کی تلخ حقیقتوں سے مقابلہ اور مجادلہ کا ایک فن ہے جس کا مقصد وحید یہ ہے کہ متمدن زندگی کی پیچیدگیاں

اور بے اصولیوں کو دُور کر کے اس میں ایک توازن قائم کر دے۔"

ظاہر ہے ماحول کی بے اعتدالیوں اور عملی زندگی کی تلخ حقیقتوں سے مقابلہ محض جذبات اور تاثرات کی فراوانی سے نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے لئے ضرورت ہے، تربیت یافتہ فہم، متوازن دماغ اور محتاط اور مصلحت اندیش قوت ممیزہ کی ———— خوش قسمتی سے یہ سب صفات محمد علی جناح میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ جن کی قیادت میں ہندوستان اپنی جداگانہ سیاست کے ذریعہ ماحول کی بے اعتدالیوں کو دُور کرنے کی کوشش میں مصروف ہے۔

عہدِ حاضر کے بڑے لوگ

حصہ دوم

چین و ایران

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تعارف

عہد حاضر کے بڑے لوگوں کے سلسلہ کا یہ دوسرا حصّہ ہے اس میں اختصار کے باوجود ایشیا کی صرف دو ہی نامور ہستیوں کا ذکر آسکا۔ ایک مارشل چیانگ کائی شک۔ دوسرے رضا شاہ پہلوی۔

چیانگ شک کے تذکرہ میں چین اور جاپان کی موجودہ کش مکش پر پوری تفصیل سے بحث کی گئی ہے اور اس کش مکش سے یورپ کی موجودہ متلاطم سیاست کا جو تعلق ہے اس پر نہایت جامعیت کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسی طرح رضا شاہ پہلوی کے حالات میں ایران قدیم اور ایران جدید کا موازنہ کیا ہے۔ اور پہلوی عہد کی برکتوں اور رضا شاہ پہلوی کی ذاتی کمزوریوں پر ناقدانہ انداز میں گفتگو کی ہے۔ اردو میں آج تک ان دونوں کی لائف پر کوئی مستقل کتاب موجود نہیں ہے اور نہ ان کے قومی و ملی کارناموں کا کوئی ریکارڈ ہی موجود ہے۔ لیکن ایشیا کے ان نامور سپوتوں سے چونکہ عام طور پر دلبستگی پائی جاتی ہے۔ اس لئے توقع ہے کہ یہ حصّہ اردو داں طبقہ کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔

محمد مرزا

مارشل چیانگ کائی شک

چین کا نہایت دلیر اور جانباز سپاہی، ذہین اور مصلحت اندیش قومی رہنما۔ آہنی عزم اور غیر متزلزل قوت ارادی کا مالک انسان جس نے اپنی قیادت میں طوائف الملوک سے پارہ پارہ چین کو ایک مرکز پر متحدہ کر دیا۔

انداز حکومت اس کا اسٹالن سے ملتا جلتا ہے اور متحدہ چینی قومیت میں یہ بسمارک کا پیرو ہے۔ لیکن یورپ کے سیاسی مدبّروں کی رائے ہے کہ مارشل چیانگ جتنا اچھا سپاہی ہے اُتنا اچھا سیاسی مدبّر نہیں!

متحدہ چینی قومیت کی تعمیر مارشل چیانگ کی زندگی کا مقدس ترین مشن ہے۔ جس کی تکمیل میں وہ کامل دس برس تک اپنے دوستوں سے لڑتا رہا اور اب سات برس سے اپنے واحد قومی دشمن جاپان سے دست وگریبان ہے۔

مارشل چیانگ کی یہی سترہ برس کی مسلسل جد وجہد دراصل اس زبردست احساس قومیت اور حیرت انگیز حوصلہ مندی کی ذمہ دار ہے، جو آج جاپانیوں کے مقابلہ میں چین کے ہر طبقہ میں مشاہدہ کی جا رہی ہے۔

چیانگ ۱۸۸۸ء میں صوبہ چی کیانگ کے ایک گمنام قصبہ چی کو میں پیدا ہوا۔ اس کا خاندان اگرچہ تجارت پیشہ تھا، لیکن دولت مند نہ تھا۔ تاہم اس کے والدین نے اس کی تعلیم کے سلسلہ میں بخل سے کام نہیں لیا۔

چیانگ نے ابتدائی تعلیم مقامی مدرسہ میں پائی۔ ثانوی تعلیم کے لئے

صوبے کے مدرسہ میں داخل ہوا۔ ثانوی تعلیم ختم کرچکنے کے بعد فوج کی طرف اس کا رجحان دیکھ کر اس کے والدین نے پایۂ تخت چین کے قریب "پاؤٹنگ" کی فوجی اکاڈمی میں اس کا داخلہ کرادیا۔ یہاں سے یہ "کنٹن" کی فوجی اکاڈمی میں بھیج دیا گیا۔ کنٹن کی فوجی اکاڈمی کے امتحان میں یہ بڑے اچھے نمبروں سے کامیاب ہوا۔ جہاں سے اسے فوج کی اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کے لئے جاپان کے فوجی کالج "شمبو گو کیو" میں بھیجا گیا۔ دو برس کی عملی تربیت کے بعد چیانگ نے اس کالج سے اعزاز کے ساتھ سند حاصل کی، اور چین واپس آنے کے بجائے جاپان ہی کی فوج میں ملازمت قبول کرلی۔

۱۹۰۹ء میں جب چیانگ جاپانی فوج میں لفٹنٹ کی حیثیت سے بھرتی ہوا تو اس کی عمر ۲۲ برس کی تھی۔ نوجوان تھا، طبیعت میں کام کرنے کی اُمنگ تھی، حوصلہ بڑھا ہوا تھا، مشقت پسندی اور اپنی ذمہ داریوں کا احساس اس میں فطرۃً موجود تھا۔ بہت جلد لفٹنٹ سے جاپانی فوج کا کپتان ہوگیا۔ اسی دوران میں چین کے مشہور قوم پرست فلسفی اور سیاسی مدبر ڈاکٹر سن یات سین سے جاپان میں اس کی ملاقات ہوئی اور نوجوان چیانگ بے تکلف ڈاکٹر سن کے پیروؤں میں داخل ہوگیا۔ ڈاکٹر کی صحبت میں چینی قوم پرستی کا رنگ اس پر بہت گہرا چڑھا اور باوجود اس کے کہ یہ اس وقت جاپان کی ملازمت میں تھا، قوم پرست چینیوں کی ایک خفیہ سوسائٹی "ٹنگ منگ سیو" کا ممبر ہوگیا۔ یہ سوسائٹی اس وقت ڈاکٹر سن کی زیر نگرانی جاپان میں قائم تھی اور چین کے مشہور شاہی خاندان "منچو" کے خلاف بغاوت کی تیاریاں کر رہی تھی۔ چنانچہ ۱۹۱۱ء میں اس سوسائٹی کی سرگرمیوں سے چین میں بغاوت ہوگئی۔ منچو خاندان کا شہنشاہ معزول کردیا گیا، اور اس کی بجائے چین کے پایۂ تخت پیکنگ میں جمہوریت کا اعلان کردیا گیا۔

اس اعلان کے ساتھ ہی نوجوان چیانگ نے جاپان کو خیر باد کہا اور اپنے وطن روانہ ہوگیا۔ مشہور ہے کہ چین پہونچکر چیانگ نے اپنی جاپانی ملازمت سے استعفے بھیجا اور استعفی کے ساتھ ہی جاپانی تلوار اور یونیفارم ایک پارسل میں بھر کر روانہ کردیا۔

ڈاکٹر سن یات سن نے چین کے شاہی خاندان کو معزول کرنے کے بعد "کومنتانگ" کے نام سے نوجوان چینیوں کی ایک زبردست سیاسی پارٹی بنائی جس نے چین میں سوشل اصلاح اور سیاسی بیداری پیدا کرنے کا کام اپنے ذمہ لیا۔ کچھ دنوں میں اس پارٹی کو سیاسی حیثیت سے اس قدر کامیابی ہوئی کہ اعلان جمہوریت کے بعد اسی پارٹی نے چین کی پہلی جمہوری حکومت کی تشکیل کی اور ڈاکٹر سن یات سن اس جمہوری حکومت کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔ نوجوان چیانگ جو جاپان سے اپنی فوجی ملازمت چھوڑ کر چین آگیا تھا اس نوزائیدہ جمہوری فوج کے ایک حصہ کا کمانڈر مقرر ہوگیا۔

۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۶ء تک چیانگ جمہوریت کے خلاف چھوٹی چھوٹی بغاوتوں کو فرو کرنے اور سرکش زمینداروں کے اثرات کو توڑنے میں مصروف رہا لیکن ۱۹۱۷ء میں اس نے یکایک فوجی اور ملکی سیاست سے اپنا تعلق منقطع کرلیا اور ہمہ تن تجارتی کاروبار کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اس نوبت پر چیانگ نے اپنے لئے تجارتی لائن اس لئے پسند کی تھی کہ اسے معاش سے بیفکری ہوجائے۔ کیونکہ معاشی بیفکری کے بغیر ملکی سیاست سے وہ گہرا تعلق پیدا نہیں کرسکتا تھا۔ خوش قسمتی سے کاروباری لائن میں اسے چین کے دو متمول ترین تاجروں کی ہمدردیاں حاصل ہوگئیں اور چیانگ نے ان دونوں کی مدد سے تھوڑے ہی عرصہ میں خاصہ روپیہ کمالیا۔

۱۹۲۱ء میں پوری طرح تیار ہو کر یہ پھر میدان سیاست میں واپس آیا اور فوج میں اس نے

اپنے عہدہ کا چارج بھی لے لیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سن یات سن چین کی سوشل اصلاح میں مصروف تھے۔ اور نوجوان چینی پارٹی ملک میں بیداری پیدا کرنے میں سن کا ہاتھ بٹا رہی تھی، چیانگ نے سیاست میں واپس آتے ہی ڈاکٹر سن کی کیومنتانگ کی بنیادوں کو مضبوط کرنے اور اس کے اثرات کو بڑھانے کی کوشش شروع کردی اور اس کے ساتھ ہی وہ براہ راست ملکی معاملات میں بھی دخیل ہوتا گیا۔

ڈاکٹر سن نے چین میں اصلاح اور تنظیم کا پروگرام تو نافذ کر دیا، لیکن اس کی تکمیل کے لئے اس کو سرمایہ کی بہت ضرورت تھی اور چین کے پاس اتنا سرمایہ نہ تھا کہ وہ ڈاکٹر سن کی مدد کرتا۔ مجبوراً ڈاکٹر سن نے سرمایہ کے مسئلہ کو ان مغربی حکومتوں کی طرف رجوع کیا جنھوں نے چین میں اپنی تجارتی منڈیاں قائم کر رکھی تھیں لیکن یہ حکومتیں چین کی اصلاح اور تنظیم کے لئے روپیہ دینے کو تیار نہ ہوئیں اس لئے کہ ان کا تجارتی فائدہ اسی میں تھا کہ چین میں طوائف الملوکی قائم رہے اور یہ کسی مرکز پر متحد نہ ہونے پائے۔ کیونکہ چین کے متحد ہونے کے بعد ان کی وہ مخصوص رعائتیں چھن جاتیں جو انھوں نے زبردستی حاصل کر رکھی تھیں۔

ان حکومتوں سے مایوس ہو کر ڈاکٹر سن سوویٹ روس کی طرف متوجہ ہوا۔ سوویٹ روس نے ۱۹۱۷ء کی بغاوت کے بعد ان سب چینی علاقوں کو آزاد تسلیم کر لیا تھا۔ جو زار روس کے زمانہ میں روسی حکومت کے زیر اثر تھے اور اسی کے ساتھ ان مراعات سے بھی دست برداری کرلی۔ جو زار روس کی حکومت نے چین میں حاصل کی تھیں۔ سوویٹ روس کے اس طرز عمل کے باعث ڈاکٹر سن نے روس سے رشتہ جوڑا اور سوویٹ روس کے ماہرین سیاست، فوج اور زراعت کی مدد سے چین کی اصلاح اور تنظیم کا کام شروع کر دیا۔

۱۹۲۳ء میں ڈاکٹر سن نے سوویٹ روس کے نظم و نسق اور فوجی تنظیم و ترتیب کے مطالعہ کے لئے چیانگ کو ماسکو بھیجا۔ جہاں اس نے چھ مہینے تک روسی

فوج میں دوسرے درجہ کے افسر کی حیثیت سے فوجی تربیت حاصل کی۔ ماسکو سے واپس آکر چیانگ نے ڈاکٹر سن کی پارٹی کومنتانگ کی دوبارہ تنظیم کی۔ کیومنتانگ کی بنیاد ڈاکٹر سن نے تین اصولوں پر رکھی تھی۔ قومیت، جمہوریت اور معاشی فراغت چیانگ کے نزدیک متحدہ قومیت ہی پہلی چیز تھی۔ جس پر پوری توجہ دینے کی ضرورت تھی۔ لیکن اس وقت ملک میں بالشویک اثر بہت زیادہ تھا اور پارٹی کے نظم و نسق میں بھی بالشویک آفیسر دخیل تھے۔ اس لئے کیومنتانگ کی دوبارہ تنظیم میں عوام کی معاشری مساوات اور معاشی فراغت کے اصول کا زیادہ خیال رکھا گیا۔

۱۹۲۵ء میں چیانگ کیومنتانگ کی اسٹانڈنگ کمیٹی کا چیرمین منتخب ہوا اور ڈاکٹر سن کے انتقال کے بعد یہ چین کی قومی فوج کا سپہ سالار بنا دیا گیا۔

ڈاکٹر سن کی کیومنتانگ پارٹی کا اثر صرف جنوبی چین میں تھا۔ چین کے دوسرے صوبے اس کے اثر سے آزاد تھے، اور ان میں خود مختار فوجی جنرل حکومت کر رہے تھے۔ بالفاظ دیگر ڈاکٹر سن کی متواتر کوششوں کے باوجود چین میں کوئی مرکز قائم نہ ہو سکا تھا۔ اور چین کے بڑے بڑے علاقوں میں بدستور طوائف الملوکی پائی جاتی تھی۔ اسی طوائف الملوکی کے مقابلہ کے لئے چیانگ نے قومی فوج کے سپہ سالار کی حیثیت سے اپنی چھوٹی سی فوج میدان میں اتار دی۔

چیانگ کا یہ عزم اس وقت کے حالات کے اعتبار سے بہت ہی حیرت انگیز تھا۔ اس لئے کہ قومی فوج اس قدر طاقتور نہیں تھی کہ چین کے خود مختار فوجی جنرلوں کو آسانی سے زیر کر سکتی، اور نہ کیومنتانگ پارٹی کے پاس اس قدر روپیہ تھا کہ دیر تک یہ مہم جاری رکھی جا سکتی۔ لیکن چیانگ ان مخالف حالات سے

بددل نہ ہوا اور اپنی چھوٹی سی فوج کو ترتیب دیکر خود اپنے وطن کی تسخیر کے لئے چل کھڑا ہوا۔

اکتوبر ۱۹۲۶ء میں اس نے "ووچنگ" فتح کیا۔ فروری ۱۹۲۷ء میں اس نے "ہان کاؤ" لے لیا۔ ہان کاؤ کی فتح کے بعد "کیومنٹانگ" نے یہاں مرکزی حکومت قائم کر لی جس میں کمیونسٹ عنصر کو بڑا غلبہ حاصل ہو گیا۔

مارچ ۱۹۲۷ء میں چیانگ نے نانکن اور شنگھائی فتح کر لیا، اور جولائی ۱۹۲۸ء میں چین کے قدیم پایہ تخت "پیکن" پر قابض ہو گیا۔

لیکن اسی دوران میں ہانکاؤ کی مرکزی حکومت اور فوج کے سپہ سالار چیانگ کائی شک کے تعلقات بگڑ گئے۔ بنیادی سیاسی عقائد میں اختلاف پیدا ہوا اور آپس میں ایک ناخوش گوار کشمکش شروع ہو گئی۔ چیانگ کائی شک اب کافی طاقتور تھا۔ اس نے اپنے حمایتوں کی مدد سے ہانکاؤ کی حکومت کا تختہ الٹ دیا، اور نانکن میں اپنی زیر قیادت ایک متوازی مرکزی حکومت قائم کر ڈالی۔ ہانکاؤ کی حکومت کے بچے کھچے ممبروں نے پایۂ تخت سے فرار ہو کر صوبہ کیانگسی میں پناہ لی اور چیانگ کے مقابلہ میں اپنی حکومت کا اعلان کر دیا۔

ہانکاؤ کی حکومت اور چیانگ کائی شک میں دراصل مرکزی حکومت کی پالیسی پر اختلاف تھا۔ چیانگ اور اس کے ساتھی ڈاکٹر سن کے مقرر کردہ تین اصولوں میں سے پہلے اصول یعنی متحدہ چینی قومیت کی تعمیر کو مرکزی حکومت کا بنیادی اصول قرار دینا چاہتے تھے۔ لیکن ہانکاؤ کی حکومت نے جس میں کمیونسٹوں کو غلبہ حاصل تھا مرکزی حکومت کی بنیادی حکمت عملی کسانوں کی اصلاح اور تنظیم کو قرار دیا تھا۔

ابتدا میں چیانگ کے ساتھیوں اور حکومت کے ممبروں کے درمیان یہ اختلاف معمولی درجہ پر تھا اور یہ دونوں پارٹیاں حکومت کا دایاں اور بایاں بازو سمجھی جاتی تھیں۔ لیکن کچھ دنوں بعد اس میں شدت پیدا ہوئی چیانگ نے علانیہ دائیں بازو کا ساتھ دیا اور بائیں بازو کی حکومت کو جو سب کی سب چیانگ کے دوستوں اور مددگاروں پر مشتمل تھی اُلٹ کر رکھ دیا۔ چیانگ کی اس حرکت سے کیومنتانگ پارٹی میں پھوٹ پڑ گئی۔ چیانگ کے ہمنواؤں نے کیومنتانگ پارٹی پر قبضہ کر لیا۔ اور بائیں بازو والوں نے اپنی کونسل علیحدہ بنالی۔

نانکن میں مرکزی حکومت قائم کر چکنے کے بعد چیانگ نے اپنی حکومت کے مخالفوں اور دوسرے صوبوں کے خود مختار جنرلوں کے خلاف ایک ساتھ مہمیں شروع کر دیں۔ ایک طرف ہانکاؤ کی حکومت کے کمیونسٹ ممبروں سے جنھوں نے کیانگسی میں سوویٹ روس کی ماتحتی میں پہلی چینی جمہوریہ قائم کرنے کی داغ بیل ڈال دی تھی معرکے پڑنے لگے۔ دوسری طرف دور دراز پہاڑی علاقوں کے خود مختار فوجی جنرلوں سے لڑائیاں ہونے لگیں۔ ان دو طرفہ مقابلوں کے لئے چیانگ کو فوج کے علاوہ کثیر سرمایہ کی ضرورت تھی یہ سرمایہ اس نے شنگھائی اور نانکن کے بینکروں سے حاصل کیا اور اس کے عوض انھیں چین کی درآمد اور برآمد کے شعبے میں رعایتیں عطا کر دیں۔

کمیونسٹ لیڈر جو چیانگ سے نبرد آزما ہوئے تھے۔ ان میں تین نام بہت نمایاں ہیں۔ کمیونسٹ فوج کا سپہ سالار جنرل چوٹھ ، سیاسی لیڈر ماؤزے تنگ اور حکومت کا مشہور مشیر اور مدبر چواِن لائی۔ ان لیڈروں کا

کیانگسی کے صوبہ میں اشتراکیوں کا زبردست اثر تھا اور انھوں نے وہاں بڑی مضبوطی سے اپنے قدم جمالئے تھے اور برابر شمال مغرب کی طرف اپنا اثر بڑھاتے جاتے تھے۔

چیانگ اور جنرل چوپٹہ کی فوجوں میں کئی معرکے پڑے۔ لیکن کسی معرکہ میں چیانگ کو نمایاں کامیابی نہیں ہوئی۔ البتہ شمال میں چیانگ کو اپنا اثر بڑھانے کا موقع مل گیا، اور اس کی فوجیں برابر شمالی صوبوں کی خود مختاری کو ایک ایک کرکے ختم کرنے لگیں یہ ۱۹۲۵ء میں چیانگ کی فوجیں چین کے قدیم پایۂ تخت پیکن پر حملہ آور ہوئیں۔ یہاں ایک پرانے تجربہ کار جنرل چیانگ سولن کی حکومت تھی۔ چیانگ نے اس جنرل کو صلح کا پیغام دیا اور اس سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے آپ کو نانکن کی حکومت کے حوالے کردے۔ چیانگ سولن چند شرائط کے ماتحت چیانگ کائی شک سے صلح کرنے پر راضی ہوگیا۔ لیکن عین اس وقت جبکہ چیانگ کائی شک اور چیانگ سولن میں صلح ہونے کو تھی۔ جاپان بیچ میں پھاند پڑا بوڑھے جنرل کو صلح کی شرائط طے کرنے سے روک دیا اور اپنی حفاظت میں منچوریا کی سرحد میں بھیجدیا۔ لیکن ریل کا وہ ڈبہ جس میں بوڑھا جنرل منچوریا کی طرف سفر کر رہا تھا بم سے اڑا دیا گیا اور غریب جنرل منچوریا پہونچنے سے پہلے ہی انتقال کر گیا۔

جاپان نے یہ چال اس لئے چلی تھی کہ چیانگ سولن کی فوج کو چیانگ سے صلح کرنے کے بعد غیر معمولی قوت نہ حاصل ہو سکے اور خود اسے منچوریا ہضم کرلینے میں آسانی رہے۔ اسی کے ساتھ چیانگ کائی شک کا اقتدار بھی شمال میں نہ بڑھنے پائے جہاں ۱۹۱۱ء کی چینی بغاوت کے بعد کوریا اور جزیرہ فارموسہ کو فتح کرکے جاپان نے اپنا اثر قائم کرلیا تھا لیکن جاپان کی یہ چال بازی چل نہ سکی۔ جنرل چیانگ سولن کے ہلاک ہوتے ہی اس کے لڑکے چیانگ ہسولیانگ نے انہی شرائط پر جو بوڑھا جنرل طے کر گیا تھا چیانگ کائی شک سے صلح کرلی اور اپنا سارا علاقہ نانکن کی حکومت

کے حوالے کر دیا۔

جنرل ہسو لیانگ کی اس خود سری سے کہ جاپان کی پناہ میں آنے کے بجائے اس نے اپنے آپ کو چیانگ کائی شک کے حوالے کر دیا براہ راست جاپان اور چیانگ کائی شک میں ٹھن گئی۔ اور مشکل سے ایک برس گذرنے پایا تھا کہ ۱۸ ستمبر ۱۹۳۱ء کو جاپانی فوجوں نے بلا کسی عذر کے منچوریا پر حملہ کر دیا۔ ۱۹۳۲ء کے آخر تک انھوں نے منچوریا کے تینوں صوبے فتح کر لئے اور مئی ۱۹۳۳ء میں جہول کا صوبہ بھی چین سے لے لیا۔

چیانگ کائی شک نے جاپان کی اس زیادتی کی شکایت لیگ اقوام سے کی جس کا چین بھی ممبر تھا۔ لیکن کوئی شنوائی نہ ہوئی اس وقت فوجی طاقت چیانگ کی ایسی اچھی نہیں تھی کہ وہ اس زیادتی کو وجہ قرار دیکر جاپان کا مقابلہ کرتا۔ اس لئے اس نے مجبوراً جاپانی مطالبات کے آگے سر تسلیم خم کر دیا، اور منچوریا اور جہول جاپان کو نذر کرنے کے علاوہ یہ وعدہ بھی کر لیا کہ چین میں جاپان کے خلاف کسی پروپیگنڈے کو راہ نہ دی جائے گی۔ چیانگ کے ذاتی اقتدار اور نانکن کی حکومت پر یہ کاری ضرب تھی جس نے اس کے ٹھپا نے مخالف کمیونسٹوں کو جو شمال مغرب میں اپنا قدم مضبوط کرنے میں مصروف تھے ابھار دیا۔

اس موقع پر کمیونسٹوں نے چیانگ اور نانکن کی حکومت کے رویہ کی قلعی کھول کر مذمت کی اور نوجوان چینیوں کو جاپان کے مقابلہ کے لئے ابھارنا شروع کیا۔ بہت جلد یہ تحریک چین کی قومی تحریک بن گئی اور جگہ جگہ جاپان اور چیانگ کائی شک کے خلاف شدید مظاہرے ہوئے اور ان مظاہروں کے ساتھ ساتھ بعض ایسے ناگوار حادثے بھی پیش آتے گئے جنھیں وجہ بنا کر جاپان ہمیشہ چین کی حکومت کے آگے نئے نئے مطالبے پیش کرتا رہا اور چیانگ کی حکومت میں چونکہ جاپانیوں

سے مقابلہ کا بوتہ نہیں تھا اس لئے وہ جاپان کے ناممکن سے ناممکن مطالبے کے آگے بھی برابر جھکتی چلی گئی۔

چیانگ کی حکومت کی اس کمزوری سے جاپان کے حوصلے بڑھ گئے اور اس نے سارے چین پر اپنا اثر و اقتدار قائم کرنے کے منصوبے باندھنے شروع کر دیئے۔ کوریا اور فارموسہ پر قبضہ کرنے کے بعد جاپان نے اپنی معاشی ضروریات کے لئے شمالی چین پر اپنا اقتدار قائم کیا۔ منچوریا کے تین صوبے فتح کر کے سلطنت منچکو کے نام سے ایک حکومت قائم کی اور چین کے قدیم منچو خاندان کے نام لیوا ایک ناکارہ شخص کو اپنی تلواروں کے سایہ میں وہاں کا بادشاہ بنا دیا۔ اس کے بعد جاپان نے باقی ماندہ شمالی صوبوں کی طرف توجہ کی اور ہوپائی شانٹنگ شانسی، چاہار، اورسوئی یوں صوبوں کو ملا کر چین کی حکومت سے علیحدہ ایک جدید سلطنت کی شکل دینی چاہی، لیکن جاپان کی یہ چال پوری طرح کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شمالی چین کے کسانوں اور نوجوان چینیوں میں کیومنٹانگ اور چیانگ کائی شک کی حکومت بہت مقبول ہو چکی تھی اور وہ اس حکومت کو دوسری حکومت کی خاطر بدلنے کو تیار نہیں تھے۔

اصل میں جاپان مشرق بعید میں وہی سیاسی اہمیت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ جو یورپ میں بعض بڑی سلطنتوں کو حاصل ہے۔ لیکن جاپان کے اس منصوبے کے پورا ہونے کے لئے یہ ضروری تھا کہ روس ایشیا کے معاملات سے بے دخل اور چین کمزور محض رہے۔ بلکہ سارے چین پر جاپان کو اسی طرح کا تسلط حاصل ہو جائے۔ جس طرح برطانیہ کو ہندوستان پر تھا۔

اسی حکمت عملی کے ماتحت جاپان کی انتہا پسند فوجی پارٹی نے چین پر رفتہ رفتہ اپنا تسلط جمانے کے لئے ایک طویل پروگرام بنایا، اور جاپان کی حکومت

کو اس پروگرام پر چلنے کے لئے مجبور کر دیا منچکو کی حکومت کا قیام اسی پروگرام کا ایک جزو تھا۔ اس کے بعد ہوپائی اور چاہار میں ایک پولٹیکل کونسل بھی اسی پروگرام کے ماتحت قائم کی گئی اور چیانگ کی حکومت کو آئے دن نئے نئے مطالبے سے بھی اسی لئے زچ کرنا شروع کیا کہ اس کا اثر و اقتدار چین سے اٹھتا چلا جائے اور جاپان کو چین میں اپنے پیر پھیلانے کا موقع ملے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ منچکو کی حکومت کے قیام کے بعد سے ۱۹۳۰ء تک جب تک چیانگ کائی شک اور جاپان میں باقاعدہ جنگ نہ چھڑ گئی جاپان نے چیانگ کی حکومت کو اپنے مطالبوں سے نیم جان بنا دیا اور اسے یہ موقع ہی نہ دیا کہ وہ چین کی اصلاح اور تنظیم کی طرف کوئی موثر قدم اٹھاتی۔

ان سیاسی مطالبوں کے علاوہ چینیوں کو کمزور اور اپنی مدافعت سے ناقابل بنا دینے کے لئے جاپان نے یہ گری ہوئی حرکت بھی کی کہ جن صوبوں میں اسے اقتدار حاصل ہو گیا تھا ان صوبوں کے ساحلوں پر اس نے افیون اور طرح طرح کی نشہ آور چیزیں درآمد کرنی شروع کر دیں اور رفتہ رفتہ چینیوں کو ان زہریلی چیزوں کا عادی بنانے لگا۔ جاپان کی فوجی چھاؤنیاں ان زہریلی نشہ آور چیزوں کی منڈیاں بن گئیں اور جو ذمہ دار چینی ان کی اس تجارت میں مداخلت کی جسارت کرتا اس کو جاپان کے فوجی افسر سزا دیئے بغیر نہ چھوڑتے۔ چیانگ کی حکومت نے افیون اور دوسری زہریلی نشہ آور چیزوں کا استعمال جرم قرار دیا تھا لیکن جاپان کی نگرانی میں ان چیزوں کا رواج برابر چین میں بڑھتا جا رہا تھا اور چیانگ کی حکومت اس کے مقابلہ میں بے بس نظر آنے لگی تھی۔

جاپان کی اس چین آزار پالیسی اور چیانگ کی اس کمزوری ہی کے باعث نوجوان چینیوں میں جاپان کے خلاف غم و غصہ بڑھنا شروع ہوا اور

نانکن اور ہانگکاؤ میں طلبا اور نوجوان چینیوں نے علانیہ جاپان اور حکومت نانکن کے خلاف مظاہرے کئے اور حکومت کو مجبور کیا کہ جاپان سے مقابلہ کرے۔ دوسری طرف کمیونسٹوں نے بھی شمال مغرب سے سر اٹھایا اور جاپان کے خلاف لڑائی کا ایک محاذ تیار کر لیا۔ جون ۱۹۳۶ء میں کونٹانگ اور کوانگسی کے صوبوں نے جاپان کے مقابلہ کے لئے ایک فوج تیار کی اور چیانگ کی حکومت کے خلاف بغاوت کر دی۔ لیکن چیانگ کائی شک کی فوجوں نے اس بغاوت کا بہت جلد ہی خاتمہ کر دیا اور دونوں صوبوں پر اپنا قبضہ کر لیا۔

چیانگ کائی شک نے ان دونوں صوبوں کی بغاوتوں کو تو کچل دیا لیکن اس طوفان سے وہ بے خبر نہیں تھا۔ جو جاپان کے خلاف ملک کے طول و عرض میں اٹھ رہا تھا۔ چیانگ نے خود بھی خوشی سے کبھی چین میں جاپانی اثر اور اقتدار کو پسند نہیں کیا تھا بلکہ اپنی نج کی صحبتوں میں وہ ہمیشہ اپنے بے تکلف دوستوں اور اپنی حکومت کے ذمہ دار افسروں کو یہ نصیحت کرتا رہتا تھا کہ جاپان سے زیادہ دنوں نہ نبھ سکے گی۔ ایک دن اس سے جنگ ضرور ہو گی۔ کوشش کرو کہ وہ دن قریب آنے سے پیشتر چین جاپان سے مقابلہ کے قابل ہو جائے۔ چیانگ جو جاپان کے ہر مطالبہ کے آگے سر تسلیم کرتا چلا گیا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک چین نہ تو ایک مرکز پر متحد ہوا تھا نہ اس میں اس قدر بوتا تھا کہ جاپانی اقتدار سے ٹکر کھا سکے۔ اگر اس وقت چیانگ جاپان سے الجھ پڑتا تو نتیجہ ایک ہی تھا وہ یہ کہ چین تباہ ہو جاتا اور ہمیشہ کے لئے جاپان کا غلام بن جاتا اور چیانگ کائی شک کی یہ تمنا کہ چین کو ایک متحد اور منظم قوم کی حیثیت سے اقوام عالم میں اپنی مخصوص

تجربہ حاصل کرتا ہوا دیکھے کبھی پیر نہ آتی۔ اس لئے چیانگ ایک طرف برابر جاپان کے
آگے جھکتا چلا جاتا تھا اور دوسری طرف وہ اپنی فوجوں کی تنظیم اور اپنی حکومت
کی اصلاح میں مصروف تھا۔ گویا جاپان سے ایک آخری مقابلہ کی تیاریاں کر رہا
تھا اور بھانپ رہا تھا کہ ملک کس حد تک جاپان کے خلاف اس کا ساتھ دینے
کو تیار ہے۔

چیانگ کائی شک نے اپنی فوجوں کی تربیت بالکل جدید اصول جنگ
کے مطابق کی تھی، اور اس مطلب کے لئے جرمنی کے چند ریٹائرڈ فوجی افسروں
کی اس نے خدمات حاصل کر لی تھیں۔ جو فوجی معاملات میں چیانگ کو مشورہ
بھی دیتے اور اس کی فوجوں کو جدید آلات جنگ کے استعمال سے مانوس بھی
کرتے۔ اس کے علاوہ چین میں آدمیوں کی کمی نہ تھی۔ چیانگ کو لاکھوں سپاہی
آسانی سے مل سکتے تھے۔ سوال صرف ان کے مسلح کرنے کا تھا۔ اور سرمایہ
چونکہ چیانگ کی حکومت کے پاس اس قدر وافر نہیں تھا کہ وہ یورپین ممالک
سے خاطر خواہ اسلحہ خرید سکتا اس لئے وہ آدمیوں کے اس ریوڑ سے خاطر خواہ
فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ تاہم جسقدر فوج وہ رکھ سکا اس کی ترتیب اور تنظیم
میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور مسلسل دس برس کی محنت کے بعد چیانگ کی چھوٹی
سی تربیت یافتہ فوج چین میں اس کی حکومت کو قائم رکھنے کے قابل ہو گئی۔
لیکن جاپان کی اعلیٰ تربیت یافتہ اور آلات جدیدہ سے مسلح فوجوں سے مقابلہ بالکل جدا
بات تھی جس کے لئے چیانگ ابھی تیار نہ تھا۔ اصل میں چیانگ کو اسلحہ سے زیادہ
چینیوں کے حوصلے میں کلام تھا۔ اسے خیال تھا کہ جاپانیوں سے مسلسل دبتے
رہنے کے باعث چینیوں کے حوصلے اس قدر پست ہو چکے ہیں کہ یہ جاپانیوں

سے کسی بڑی جنگ میں مقابلہ نہ کر سکیں گے۔ اس کا یہ شبہ سنہ ۱۹۳۲ء میں کسی قدر دور ہو گیا۔ جبکہ جاپان نے بغیر کسی معقول وجہ کے شنگھائی کی چینی فوج پر حملہ کر دیا اور چینی فوج نے کمال جی داری سے ان کا مقابلہ کیا۔

یہ حادثہ تو آپس میں صلح صفائی پر ختم ہو گیا۔ لیکن اس سے چیانگ نے جو سبق لیا وہ یہ تھا کہ چینیوں میں اسقدر سکت موجود ہے کہ اگر صحیح اصول پر ان کی تربیت کی جائے اور آلات جدید سے انھیں مسلح ہونیکا موقع دیا جائے تو وہ بڑی جی داری سے جاپان سے مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اس واقعہ کے بعد ہی دراصل چیانگ نے بڑے پیمانہ پر فوجی تیاریاں شروع کیں اور چین کو ایک مرکز پر متحد کرنے کی کوششوں کو تیز تر کر دیا۔

سنہ ۱۹۳۶ء میں جب جاپان کے خلاف چین میں مخالفت کا شدید طوفان اٹھا اور کمیونسٹوں نے بھی شانسی کے دور دراز صوبوں سے سر اٹھایا تو چیانگ نے نوجوان مارشل چیانگ ہسیو لیانگ کو اپنی منچوریا کی فوج کے ساتھ ان کمیونسٹوں کے مقابلہ کے لئے بھیجا۔ منچوریا کی فوجیں اور یہ نوجوان مارشل خود جاپان سے جلے ہوئے تھے۔ اس لئے کہ چار برس پہلے جاپان نے انھیں اپنے وطن منچوریا سے بے دخل کر کے وہاں اپنے زیر اقتدار ایک برائے نام حکومت قائم کر دی تھی۔ چنانچہ مارشل چیانگ ہسیو لیانگ اور اس کی فوجیں بجائے اس کے کہ کمیونسٹوں سے مقابلہ کرتیں ان سے جا ملیں۔ اور سیان فو میں کمیونسٹوں اور مارشل چیانگ ہسیو لیانگ نے جاپان کے خلاف اپنا متحدہ فوجی ٹولہ ڈالدیا۔

اس نئی صورت حال سے چیانگ نے اس طرح مقابلہ کیا کہ اپنے چند مصاحبوں کے ساتھ یکہ و تنہا ہوائی جہاز کے ذریعہ سیان فو پہنچ گیا دشمنوں کے درمیان اس طرح بیدھڑک پہنچ جانا اور اپنے دشمنوں کے

درمیان جن کے ہزاروں آدمیوں کو چیانگ ہلاک کر چکا تھا اور جن کے خلاف وہ برابر دس برس سے نبرد آزما تھا۔ چیانگ کائی شیک کی جی داری اور بے خوفی کی ایسی زبردست شہادت ہے کہ تاریخ میں بہت کم اس کی مثال مل سکتی ہے۔

چیانگ کائی شیک جو وقت اپنے چند ذاتی مصاحبوں کے ساتھ سیان فو پہونچا تو حالات وہاں توقع سے زیادہ خراب دیکھے۔ کمیونسٹوں نے چیانگ کے مصاحبوں کو قتل کر دیا اور خود چیانگ کو گرفتار کرکے ایک کمرہ میں بند کر دیا لیکن اسے کوئی گزند نہیں پہونچایا۔ البتہ نوجوان مارشل اور کمیونسٹ لیڈروں نے چیانگ کو طرح طرح سے مجبور کرنا شروع کیا کہ وہ جاپان کی حمایت چھوڑ دے اور اس کی مخالفت میں کمیونسٹوں کے ساتھ اتحاد کرے۔ لیکن چیانگ ان کی کسی دھمکی میں نہ آیا اور ان سے کسی قیمت پر صلح کرنے کو تیار نہ ہوا۔

سیان فو میں مارشل چیانگ کے کمیونسٹوں کے ہاتھوں گرفتار ہونے کی خبر نے نانکن میں بڑی بے چینی پھیلا دی اور حکومت نانکن کے بعض ناتجربہ کار ممبروں نے باغیوں پر فوراً حملہ کر دینے کی ٹھان لی۔ لیکن میڈم چیانگ کائی شیک نے اس ارادے کی شدت سے مخالفت کی اور اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ یہ میڈم کی انتہائی دوراندیشی تھی۔ ورنہ اگر حکومت نانکن کی فوجیں باغیوں کے خلاف بھیجی جاتیں تو پھر چیانگ کی جان بچنے کی کوئی توقع نہ تھی میڈم چیانگ نانکن کی حکومت کو باغیوں کے خلاف کسی قسم کی کارروائی نہ کرنے کی ہدایت کرکے اپنے بھائی ٹی۔ وی۔ سونگ اور چیانگ کے مشیر مسٹر ڈونالڈ کے ساتھ خود سیان فو پہونچیں اور فوراً باغیوں سے چیانگ کی رہائی کے لئے گفت و شنید شروع کر دی۔ یہ اب تک نہ کھلا کہ سیان فو میں میڈم اور باغیوں میں کیا سمجھوتہ ہوا۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ تیسرے دن جب میڈم سیان فو سے واپس ہوئیں تو

تو چیانگ کائی شک ان کے ساتھ تھے۔ خود چیانگ کائی شک کا بیان اس حادثہ کے متعلق یہ ہے کہ انھوں نے باغیوں کی کسی دھمکی کی پرواہ نہیں کی اور ان کے ساتھ کسی شرط پر بھی سمجھوتہ کرنے کی حامی نہ بھری۔ ممکن ہے یہ سچ ہو۔ لیکن چیانگ کائی شک کی رہائی کے بعد کیومنٹانگ کی پالیسی میں ہلکی سی تبدیلی ضرور ہو گئی، اور حکومت نانکن کی طرف سے کمیونسٹوں کے خلاف مدت سے جو مہم جاری تھی اس میں ڈھیل بھی محسوس ہونے لگی۔ دوسری طرف کمیونسٹوں نے نانکن کی حکومت اور چیانگ کائی شک کی ذات کے خلاف ہر قسم کا پروپیگنڈا بند کر دیا اور اس کی بجائے اُنھوں نے اپنی ساری قوتیں جاپان کی مخالفت پر مرکوز کر دیں۔

جاپان نے بھی چیانگ کائی شک اور حکومت نانکن کے رویّہ میں اس تبدیلی کو محسوس کیا اور صحیح طور پر سمجھ لیا کہ چپکے چپکے چین کو منتشر اور کمزور کرنے کی جو پالیسی اس نے اختیار کر رکھی تھی وہ بالکل ناکام رہی اور اب اس کے لئے چین میں اپنا اقتدار قائم رکھنے کی صرف ایک ہی صورت رہ گئی ہے، اور وہ یہ کہ چیانگ کی حکومت کو جس کی جڑیں خود جاپان نے اتنے دنوں میں اپنی غرض کے لئے مضبوط کر دی تھیں، اُلٹ دے اور کمیونسٹوں کے بڑھتے ہوئے حوصلوں کو اُبھرنے سے پہلے ہی کچل کر رکھ دے۔

ے۔ جولائی ۱۹۳۷ء کی رات کو ایک جاپانی فوجی دستے نے جو پیکن کے قریب فوجی مظاہروں کے سلسلہ میں مقیم تھا لوکو چاؤ نامی ایک گاؤں میں چینی سپاہیوں کے پڑاؤ پر گولیاں چلا دیں۔ چینیوں نے بھی اس جاپانی حملہ کا جواب دیا اور طرفین کے کچھ سپاہی اس زد و بدل میں کام آ گئے۔

جاپان جو ہمیشہ چین کو دبانے کے بہانے سوچا کرتا تھا اس حادثہ پر کس طرح خاموش رہتا۔ ایک طرف اس نے چینی حکومت سے چینی سپاہیوں کی اس حرکت کا جواب مانگا، اور دوسری طرف اس نے چین میں مقیم اپنے کونسلوں کو یہ حکم بھیجا کہ شمالی چین کے جاپانی باشندوں کو ہدایت کی جائے کہ وہ فوراً شہر خالی کر دیں تاکہ لڑائی چھڑ جانے کی صورت میں انھیں نقصان نہ ہو۔ یہ ہدایتیں چین کے جاپانی باشندوں کو ۱۱ر جولائی کو دی گئیں۔ اس کے معنی یہ تھے کہ جاپان نے یہ طے کر لیا تھا کہ سرحد کے اس حادثہ کو وجہ بنا کر سارے شمالی چین پر قبضہ کر لے گا۔ بلکہ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ سرحد پر جو واقعہ ہوا، وہ بھی جاپان ہی کے اشارے سے ہوا تھا تاکہ شمالی چین پر قبضہ کرنے اور چیانگ کی حکومت پر کاری ضرب لگانے کے لئے جاپان کو ایک معقول عذر مل سکے۔ چنانچہ اس حکم کے ساتھ ہی اسی دن دو ہزار جاپانی سپاہیوں کا ایک دستہ ٹینٹسن پہونچ گیا۔ ایک طرف جاپان نے یہ فوجی تیاریاں شروع کر دیں اور دوسری طرف چینی افسروں سے رسمی گفت و شنید جاری رکھی۔ مقصد اس گفت و شنید کا صرف یہ تھا کہ جاپان کو اپنی فوجیں شمالی چین میں جمع کرنے کا موقع مل جائے۔ چنانچہ ۲۸ر جولائی کو جاپان کی علانیہ بد معاملگی سے یہ دکھاوے کی گفتگو ختم ہو گئی اور اسی تاریخ سونچکو کی طرف سے جاپان نے شمالی چین پر حملہ کر دیا۔

چین کے شمالی صوبے اس توقع میں تھے کہ جاپان حسب عادت اس دفعہ بھی اپنے کچھ مطالبات چینی حکومت سے تسلیم کرا لے گا اور جنگ کو ٹال جائے گا۔ اس لئے عام طور سے انھوں نے مدافعت کی مطلق تیاری نہیں کی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب تک انھیں یہ یقین ہو کہ فی الحقیقت چین اور جاپان میں جنگ چھڑ چکی ہے۔ اسوقت تک شمال کے دو صوبوں پر جاپانیوں کا تسلط ہو چکا تھا

اس موقع پر جو پائی اور جاپان کی خود مختار کونسل کے صدر جنرل "سنگ چوہونٹ" نے چیانگ کائی شک کی حکومت اور جاپان میں مصالحت کرا دینے کی کوشش بھی کی۔ لیکن چینیوں نے ان کوششوں پر کوئی توجہ نہیں دی اور پوری سرگرمی سے قومی جنگ کے لئے وسیع پیمانہ پر تیاریاں شروع کر دی تھیں۔

جاپان کو ابتدا میں یہ مغالطہ تھا کہ چینی ایک ہفتہ بھی ان کے آگے نہ ٹھہر سکیں گے اور فوراً جاپان کی شرائط پر صلح کر لیں گے۔ لیکن جاپان کا یہ اندازہ اب کے غلط ثابت ہوا چینی اب کے جاپان سے ایک فیصلہ کن مقابلہ کرنے کا عزم کر چکے تھے۔ چنانچہ جب شمالی چین کے دو صوبوں کو زیر کرنے کے بعد جاپانی اپنی پوزیشن مضبوط کرنے میں مصروف تھے اور جاپانی بحری بیڑے نے اپنی حکومت کے مشورہ کے بغیر شنگھائی پر حملہ کر دیا تو چینیوں نے اس قدر جی داری سے جسم کر جاپانیوں کا مقابلہ کیا کہ جاپانی بیڑہ کے پورے طور پر تباہ و برباد ہونے میں کوئی کسر باقی نہ رہی۔ چینیوں کی اسی زبردست مدافعت کے بعد جاپان کو یہ اندازہ ہوا کہ چین اب منہ کا نوالہ نہیں رہا۔ بلکہ اسے زیر کرنے کیلئے جاپان کو اپنی پوری قوت سے کام لینا پڑے گا۔ چنانچہ اگست میں جاپانیوں نے چین پر پوری قوت سے بحری اور فضائی حملے شروع کر دیئے اور اس وقت انھوں نے فوجی اور سویلین آبادی کی مطلق تمیز نہ رکھی۔ بلکہ فضائی حملوں کا رُخ جان بوجھ کر فوجیوں کی بجائے سویلین آبادی کی طرف رکھا تاکہ چین کے عام شہری بدحواس ہو جائیں اور اپنی حکومت کو مجبور کریں کہ وہ جاپان کی پیش کردہ شرطوں پر اس سے صلح کر لے۔

جاپان کا یہ اندازہ بھی غلط ثابت ہوا۔

جاپان کی اس حرکت نے چینیوں کو بدحواس کرنے کی بجائے ان میں ایک نیا احساس قومیت پیدا کر دیا، اور متحدہ قومیت کی تعمیر کے سلسلہ میں وہ کام

کیا جو چیانگ کائی شک بھی اتنے دنوں کی جدوجہد کے بعد کامیابی سے نہ کر سکا تھا۔
جاپان کے ان مسلسل حملوں کی مدافعت کے جوش میں چینیوں نے اپنے آپس کے سارے اختلافات بھلا دیے اور مادر وطن کی حفاظت کے لئے بلا کسی امتیاز کے ہر مذہب و عقیدے کے چینی چیانگ کائی شک کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوگئے۔ کمیونسٹ پارٹی بھی جو مدت سے چیانگ کی مخالف چلی آتی تھی۔ بلا شرط چیانگ کے ساتھ ہوگئی، اور اس نے اپنی مخصوص گوریلا وضع کی لڑائیوں میں جاپانی فوجوں کے دستے کے بھون ڈالے۔
جاپان نے چین پر تین طرف سے حملے جاری رکھے۔ شمال سے جاپان کی بڑی فوجیں آگے بڑھتی رہیں۔ دریائے یانگسی سے جاپانی بحری بیڑوں نے چین کے بڑے بڑے شہروں کو تہ و بالا کرنا شروع کر دیا اور فضائی حملوں سے چینی فوجوں اور چینی باشندوں میں ہلاکت ڈالی۔ جس وقت جاپان نے زبردست مقابلہ کے بعد شنگھائی فتح کیا تو جاپانی سمجھے کہ چیانگ کائی شک کی حکومت ٹوٹ جائے گی اور اس کو جاپانیوں سے مقابلہ کی ہمت باقی نہ رہے گی۔ لیکن جب اس کے بعد بھی چینی جاپانیوں کے مقابلہ میں ڈٹے رہے تو انھوں نے چیانگ کے پایہ تخت نانکن کی تسخیر کا ارادہ کیا۔ خیال یہ تھا کہ پایۂ تخت کی فتح کے ساتھ ہی ساتھ چیانگ کائی شک کی حکومت کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ اس لئے کہ جب پایہ تخت ہی نہ رہے گا تو حکومت کہاں قائم رہ سکتی ہے۔ چنانچہ جاپان کی شمالی فوجوں نے نانکن کی طرف کوچ کر دیا اور ایک مہینے کی جدوجہد کے بعد نانکن بھی فتح کر لیا۔
لیکن نانکن میں جاپانیوں کے داخلہ سے پہلے ہی چیانگ اپنی حکومت اور فوجی چھاؤنی ہانکاؤ میں منتقل کر چکا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نانکن فتح کرنے کے بعد بھی جاپانیوں نے یہ دیکھا کہ چیانگ کی حکومت بدستور قائم ہے۔ بلکہ پہلے سے بہت

زیادہ طاقتور صورت میں قائم ہے اور چینی عوام اور خواص بلا کسی اختلاف کے دل سے اس کے ساتھ ہیں۔

اس نوبت پر جاپانیوں کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا تھا کہ وہ چیانگ کے نئے پایۂ تخت پر حملہ کر دیں اور اس کی فوجوں کے زور کو توڑنے کی کوشش کریں۔ اب کے جاپان نے لڑائی کا مکمل نقشہ بنایا اور باقاعدہ اس نقشے پر لڑنا شروع کیا۔ ابتداءً جاپانیوں کی پیشقدمی نہایت کامیابی سے جاری رہی۔ جاپان کی شمالی فوجیں ننگھا ریلوے کی لائن سے ملی ملی مغرب کی طرف بڑھیں۔ اس کے بعد انھوں نے اپنا رُخ جنوب میں ہانکاؤ کی طرف پھیر دیا۔ دوسری طرف وسطی چین میں دریائے یانگٹسی کے کنارے کنارے جاپانیوں کے دوسرے کالم نے پیش قدمی شروع کر دی۔ اس کالم کی امداد کے لئے بحری بیڑہ بھی دریائے یانگٹسی میں چلتا رہا۔ چینی اس دو طرفہ دباؤ سے پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئے اور ان کی پوزیشن اسقدر نازک ہو گئی کہ ایک فیصلہ کن جنگ کے بعد ان کا سنبھلنا مشکل نظر آنے لگا۔ لیکن عین اس وقت قدرت نے چینیوں کی مدد کی بارش کی کثرت کے باعث دریائے زرد میں طغیانی آگئی اور دریا کے دونوں طرف کے بند جو پہلے ہی سے ناکارہ ہو رہے تھے وہ کچھ تو طغیانی کے زور سے ٹوٹ گئے اور جو باقی رہ گئے تھے، انھیں خود چینیوں نے توڑ دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سینکڑوں میل تک سیلاب آگیا۔ ہزاروں چینی کسان تباہ و برباد ہو گئے۔ لیکن اسی کے ساتھ جاپانیوں کی پیشقدمی ایک مدت کے لئے رُک گئی۔

جاپان نے یہ دیکھ کر کہ اس کی بری فوجیں سیلاب کے باعث پیشقدمی کرنے سے رُک گئی ہیں۔ دریائے یانگٹسی میں اپنا جنگی بیڑا ڈال دیا اور اس طرف

سے ہانکاؤ پر حملہ کرنے کا نقشہ بنایا۔ جاپانیوں کو دریا میں پیشقدمی کرنا اس لئے
بھی مفید نظر آیا کہ یہاں انھیں گوریلا حملہ کا خطرہ نہیں تھا۔ اور نہ یہ اندیشہ تھا
کہ چینی ان کے جہازوں کو بموں کے ذریعے اڑادیں گے۔ لیکن ابھی اس
اسکیم کے مطابق جاپانی بیڑہ حرکت میں نہیں آیا تھا کہ ٹوکیو میں انتہا پسندوں
کی جماعت نے حکومت کو مجبور کرنا شروع کیا کہ "کنٹن" پر حملہ کرکے پہلے اسے
فتح کیا جائے۔ تاکہ چیانگ کی حکومت کو اس بندرگاہ سے اسلحہ فراہم نہ ہوسکیں
لیکن چین میں مقیم جاپانی فوج اس کے خلاف تھی جاپانی کمانڈر انچیف کنٹن
کی فتح کے بعد جاپان کو اس علاقہ کی حفاظت کے لیئے ایک تیسری فوج بھی
بھیجنی پڑے گی، اور تین تین ڈویژنوں کی نگرانی گوریلا سرگرمیوں کے پیش نظر
مشکل ہوجائے گی۔ اسی کے ساتھ جاپان میں اعتدال پسند لیڈر بھی اس حملہ
کے مخالف تھے، انھیں یہ خیال تھا کہ برطانیہ اس حملہ کی مخالفت کرے گا، اور اگر
کہیں برطانیہ سے لڑائی ہوگئی تو جاپان کو ایک اور مصیبت کا سامنا کرنا پڑے گا
لیکن نوجوان جاپانیوں اور انتہا پسند فوجی پارٹی نے ان احتمالات کی پروا
نہیں کی، اور حکومت کو اس قدر دبایا کہ بالآخر وہ کنٹن پر حملہ کر دینے کا حکم
دینے پر مجبور ہوگئی۔ غالباً نوجوان جاپانیوں کی دلیل یہ تھی کہ اگر برطانیہ اور فرانس نے
چکوسلوویکیہ کی خاطر جنگ نہیں کی تو یہ دونوں جنوبی چین میں اپنے مفاد کی حفاظت
کی خاطر جاپان سے نہیں لڑیں گے۔ چنانچہ اسی اندازہ کے مطابق ۱۲۔ اکتوبر سنہ ۱۹۳۸ء
کو جاپان نے چالیس ہزار بحری سپاہی ہانگ کانگ کے شمال میں آتار دیئے اور
بحری بیڑے ان کی مدد کیلئے ساحل پر کھڑے رکھے۔ یہ ساحل صوبہ کونگ تنگ
کے علاقہ میں تھا اور یہاں جنرل پائی چونگ ہسی کی ماتحتی میں چینیوں کی
ایک بڑی تربیت یافتہ فوج جمع تھی اور چیانگ کو یقین تھا کہ جاپانیوں کو

یہ فوج پوری طرح تباہ وبرباد کرسکے گی۔ لیکن چینیوں کا خیال غلط نکلا۔ جاپانیوں کا اس حملہ میں ذرا بھی مقابلہ نہ ہوا اور وہ آسانی سے کنٹن پر قابض ہو گئے۔

کومنتانگ کے فوجی افسروں کی یہ بے پروائی تھی یا غداری کہ انھوں نے جاپانیوں کو بے مقابلہ کنٹن پر قبضہ دے دیا۔ لیکن چیانگ نے انھیں بخشا نہیں بلکہ کنٹن جاپانیوں کے ہاتھوں فتح ہو جانے کے بعد اس نے وہاں کے فوجی کمانڈروں کا کورٹ مارشل کر کے انھیں گولیوں سے اڑا دیا۔

چیانگ کائی شک نے اپنے غدار کمانڈروں کو یہ سزا تو ضرور دی لیکن کنٹن کی شکست کا ہانکاؤ کی پوزیشن پر بہت برا اثر پڑا اور چیانگ نے اس کے فوراً ہی بعد اپنا پایہ تخت ہانکاؤ سے مغرب کی طرف چونگ کنگ میں منتقل کر دیا۔

چین اور جاپان میں باقاعدہ جنگ چھڑنے کے بعد سے بظاہر ہر محاذ پر جاپانیوں کو فتح حاصل ہو رہی ہے اور جاپانی فوجیں بے دھڑک پیش قدمی بھی کرتی چلی جا رہی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود جاپان گھاٹے میں رہے۔

جنگ نے توقع سے زیادہ طول کھینچا اور چینیوں نے امید سے زیادہ جی داری سے جاپانیوں کا مقابلہ کیا۔ ان دونوں باتوں نے مل جل کر جاپان کو مالی حیثیت سے بہت نقصان پہونچایا اور اتلاف جان بھی اس کی طرف بہت ہوا۔ اسی کے ساتھ جاپان نے چین کا جو علاقہ فتح کیا وہاں اب تک اپنا اقتدار قائم نہ کر سکا۔

شہروں اور بڑے بڑے مرکزوں پر تو بیشک جاپان قبضہ کر لینے میں کامیاب ہو گیا، لیکن اندرون چین میں وہ اپنا اثر نہ ڈال سکا۔ اگرچہ اس نے

چیانگ کی حکومت کو بے اثر کرنے کیلئے شمالی اور وسطی چین کے جو علاقے فتح کر لئے تھے۔ ان میں اپنے زیر اقتدار عارضی چینی حکومتیں بھی قائم کر ڈالیں اور چینیوں میں دل کھول کر ان کا پروپیگنڈا بھی کیا اور اب تک برابر کر رہا ہے۔ لیکن اس کے باوجود دیہاتوں میں بدستور چیانگ کی حکومت ہے، اور کسان بڑی خوشی سے انھیں محاصل ادا کر رہے ہیں۔ اسی کے ساتھ چین کی کمیونسٹ فوجوں نے گوریلا انداز کی لڑائیوں سے ناطقہ بند کر رکھا ہے۔ شنگھائی اور پیکن کی فتح کو تین برس سے زیادہ ہو چکے ہیں۔ لیکن ان شہروں کے اطراف و جوانب میں کمیونسٹ فوجیں آج تک جب موقع ملتا ہے چھاپہ مار جاتی ہیں۔ بلکہ ان کا اس قدر زور ہے کہ جاپانی فوج کا کوئی دستہ اپنے کالم سے جدا ہو کر اگر اندرونی علاقہ میں پہونچ جاتا ہے تو پھر صحیح و سلامت واپس نہیں آتا۔ جاپانی ریلیں چین میں دور تک نہیں پہونچ سکتیں۔ پٹریاں توڑ دی جاتی ہیں یا ڈبوں کو بموں سے اڑا دیا جاتا ہے۔ غرض جاپان جس قدر چین میں آگے بڑھتا جاتا ہے، اسی قدر اسکی مشکلات بھی بڑھتی جاتی ہیں، اور ان مشکلات کے ساتھ چینیوں کے حوصلے بھی بڑھتے جاتے ہیں اور فی الحال اس کا کوئی علاج جاپان کے پاس معلوم نہیں ہوتا۔

چیانگ کائی شک نے جاپان سے جنگ چھڑتے ہی ایک طرف چین کے کمیونسٹوں سے صلح کر لی۔ دوسری طرف سویٹ روس سے معاہدہ کر لیا۔ اس معاہدہ سے چیانگ کو بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ سویٹ روس نے جنگی ہوائی جہازوں اور جنگی اسلحہ سے بھی چین کی مدد کی اور اپنے تجربہ کار افسر بھی چینی فوج کی تربیت کیلئے چین بھیج دیئے۔ روس کے ساتھ چین نے

برطانیہ، فرانس اور امریکہ کو بھی اپنی طرف متوجہ کر لیا چین میں ان سلطنتوں کے
بڑے بڑے کاروبار ہیں اور بہت کچھ رعاتیں انھیں حاصل ہیں۔ لیکن یہ رعائتیں
اسی وقت باقی رہ سکتی ہیں۔ جب تک چیانگ کی حکومت چین میں باقی ہے۔
جاپانی اقتدار چین میں قائم ہو جانے کے بعد ان کو ہرگز یہ توقع نہیں ہے کہ ان
چین میں اسقدر تجارتی آزادیاں حاصل رہ سکیں گی اسلئے قدرتاً یہ سلطنتیں چیانگ
کی ہوا خواہ ہوگئیں برطانیہ نے چیانگ کو قرض اسلحہ دینے منظور کر لئے اور امریکہ
نے چیانگ کیلئے ڈھائی کروڑ ڈالر کا قرضہ منظور کر لیا۔
برطانیہ کے علاوہ ہر مہینے چیانگ روس سے تقریباً چار کروڑ روبلس کے
اسلحہ قرض خریدتا ہے اور ۱۹۳۹ء سے اس کی مقدار دونی ہو گئی ہے۔ انہی
اسلحہ اور روپئے کی امداد سے چیانگ ابتک جاپان کے مقابلے میں ڈٹا ہوا
ہے، اور جاپان پوری قوت صرف کرنے کے بعد بھی ابتک چیانگ کو زیر
نہیں کر سکا ہے۔

جاپان کو سویٹ روس سے بڑی شکایت ہے کہ وہ چیانگ کائی
شک کی اس دھڑنے سے مدد کر رہا ہے۔ لیکن یہ شکایت بیکار ہے۔ اس لئے
کہ روس اور جاپان کے تعلقات مدت سے دوستانہ نہیں ہیں بلکہ جب سے
جاپان نے جرمنی اور اٹلی کے ساتھ اپنا سیاسی رشتہ جوڑا ہے اس وقت سے
روس اور جاپان کے تعلقات اور زیادہ خراب ہو گئے ہیں۔ چنانچہ جاپان نے
منچوریا کی سرحد پر جہاں منگولیا اور جاپان کی ساختہ پرداختہ سلطنت منچوکو کی
سرحدیں ملتی ہیں۔ تین لاکھ جاپانی سپاہی تعینات کر دیئے ہیں تاکہ اگر
چینی حالات سے فائدہ اٹھا کر روسی فوجیں منچوریا پر حملہ کرنا چاہیں تو کامیابی

سے ان کا مقابلہ کیا جا سکے۔

جاپان کو برطانیہ، فرانس اور امریکہ سے بھی شکایت ہے کہ یہ سلطنتیں چیانگ کو تقویت پہونچا رہی ہیں اور چین کی جنگ کو طول دیتی جا رہی ہیں۔ لیکن جاپان کی یہ شکایتیں بھی بیکار ہیں۔ دنیا میں اس وقت کوئی حکومت ایسی نہیں ہے جو محض دوستی کے لئے اپنے تجارتی مفاد سے دست بردار ہو جائے۔ چین ایک مدت سے مغربی اقوام کی تجارتی منڈی ہے اور نہ صرف تجارتی منڈی ہے بلکہ ایک ایسا مرکز ہے۔ جہاں قدم جما کر مغربی اقوام نے مشرق بعید کی سیاست میں دخل پیدا کر لیا ہے۔ ایسی صورت میں کیونکر ممکن ہے کہ یہ اقوام جاپان کو خوش کرنے کی خاطر اپنے تجارتی اور سیاسی مقصد کو چھوڑ دیں، اور جاپان کو صحیح معنوں میں مشرق بعید کا مختار مطلق تسلیم کر لیں۔ اس لئے کہ اگر مغربی اقوام کا اثر چین پر باقی نہیں رہتا تو مشرق بعید میں ایک بھی حکومت ایسی نہیں ہے جو جاپان کی فوجی قوت کو چیلنج کر سکے۔ خود جاپان نے بھی چین میں اسی لئے جنگ شروع کر رکھی ہے کہ چین سے غیر ملکی اثر و اقتدار کا خاتمہ کر دے چین کے ساتھ مشرقِ بعید کا مالک بن بیٹھے۔ ایسی صورت میں یہ ظاہر ہے کہ یہ جنگ نہ صرف چینی حکومت سے لڑی جا رہی ہے بلکہ یہ چین کے غیر ملکی اقتدار کے خلاف ایک مہم ہے جو جاپان نے یورپین حالات کا گہرا مطالعہ کرنے اور اپنا موقع دیکھنے کے بعد جاری کر رکھی ہے۔

اس میں شک نہیں جاپان بڑی حوصلہ مند قوم ثابت ہوئی ہے اور اس وقت یوروپین حالات بھی اس کے لئے سازگار ہو گئے ہیں۔ جن سے وہ پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ابھی قطعی طور پر یہ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کہ چین اور جاپان کی موجودہ جنگ کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ آیا

چین پر اور چین کے ساتھ مشرق بعید پر جاپان کا قبضہ ہو جائے گا یا جاپان کو اپنے اس مقصد میں ناکامی ہو گی۔ اور سیاسی حیثیت سے نقصان اٹھانا پڑے گا۔

جاپان کو چین کے خلاف مہم جاری رکھنے میں یورپ کی موجودہ متلاطم سیاست سے بہت مدد مل رہی ہے۔ یورپ کی دو بڑی قوتیں اٹلی اور جرمنی جن میں نیشنل سوشلزم کے عقیدے پر حکومت ہو رہی ہے۔ ابتداءً صرف سویٹ روس کی مخالفت پر متحد ہوئیں تھیں۔ لیکن آج ان کا رُخ روس کی بجائے یورپ کی طرف ہے اور ان کا اتحاد یورپ کی کئی چھوٹی چھوٹی حکومتوں کو اس وقت تک ہضم بھی کر چکا ہے اور جو باقی رہ گئی ہیں ان کا وجود بھی خطرے میں ہے۔ اسی کے ساتھ یورپ کی بڑی بڑی جمہوری قوتوں کے وقار پر بھی اس اتحاد سے ایسی کاری ضرب لگی ہے کہ اگر فوراً ہی اس کا کوئی مؤثر توڑ نہ کیا گیا تو اندیشہ پیدا ہو گیا ہے کہ قوتوں کا سیاسی اقتدار بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جائے گا۔

یورپ کی سیاست میں جارحانہ اقدام کی ابتدا جرمنی کی طرف سے ہوئی ہے۔ "سار" کا علاقہ جو جنگ عظیم کے بعد پندرہ برس کے لئے لیگ اقوام کی نگرانی میں دے دیا گیا تھا اس کی جرمنی میں واپسی اگرچہ اس مدت کے ختم ہونے کے بعد استصواب رائے عامہ سے ہوئی ہے۔ لیکن نازی حکومت نے استصواب رائے عامہ کے وقت اپنا جو انداز رکھا وہ ہرگز کسی با اصول حکومت کے شایان شان نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے بعد رائنی لینڈ کا نمبر آیا اور وہ علاقہ جو فرانس اور جرمنی کے درمیان غیر جانب دار حیثیت میں چھوڑ دیا گیا تھا اُس پر بغیر کسی گفت و شنید کے جرمنی نے قبضہ کر لیا۔

یورپ میں جرمنی کی ان سرگرمیوں کو دیکھ کر اٹلی نے افریقہ میں ہاتھ پیر

پھیلائے اور حبشہ کی قدیم سلطنت کو ختم کر کے اسے اٹلی کے زیر نگیں کر لیا۔ ان نازی اور
اور فاشست سرگرمیوں کو دیکھ کر یورپ کی چھوٹی بڑی حکومتوں کو اپنے متعلق
خطرے کا احساس ہوا اور انھوں نے مجلس اقوام میں اٹلی کے خلاف ایک متحدہ
محاذ قائم کرنا چاہا لیکن انھیں ناکامی ہوئی۔ اس ناکامی کے بعد فاشست حوصلے
بڑھے۔ اسپین کی جمہوری حکومت پر فاشست سیلاب امنڈنے لگا۔ اس
نوبت پر اٹلی اور جرمنی میں اتحاد ہوا اور روم اور برلن کا ایک محور قائم کیا
گیا تاکہ یورپ کی سیاست کو اس کے گرد گھومنے پر مجبور کیا جا سکے۔

اس اتحاد کے فوراً ہی بعد جرمنی نے خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر آسٹریا پر
قبضہ کر لیا اور مغربی یورپ کی سیاست کو تہ و بالا کر ڈالا۔ آسٹریا کی فتح
کے بعد یورپ کی جمہوری حکومتوں میں بے چینی بڑھی اور بعض حکومتوں
کی روس پر نظریں پڑنے لگیں۔ مطلب یہ تھا کہ روس کو اپنے ساتھ لیکر یورپ
میں اس امنڈتے ہوئے فاشست سیلاب کو روکا جائے۔ لیکن اس رائے
پر اتفاق نہ ہو سکا۔ سوویٹ روس جمہوری قوتوں کو اٹلی اور جرمنی سے زیادہ بے اصول
اور خطرناک نظر آیا جس سے ان کا اتحاد نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے روس سے اتحاد
کے بجائے اٹلی اور جرمنی میں تفرقہ ڈالنے کی تدبیریں اختیار کی گئیں۔ فاشست
حکومتوں نے بھی جمہوری قوتوں کی کمزوری کو بھانپا اور علیحدہ علیحدہ ان قوتوں
کو بیوقوف بنانا شروع کر دیا، اور جگہ جگہ سیاسی مراعات حاصل کرنے شروع
کر دیے۔ اسی دوران میں جاپان نے اپنے اقتدار کے لئے چین میں جنگ چھیڑ
دی، اور مشرق بعید میں یورپ کی جمہوری قوتوں کے سیاسی اور اقتصادی
مفاد سے دست و گریبان ہو گیا۔ فاشست قوتوں کو اس جاپانی حملہ میں
اپنا مفاد نظر آیا اور انھوں نے جاپان کو بھی اپنے محور میں شریک کر لیا۔

اس طرح روم، برلن اور ٹوکیو ایک رشتہ منسلک ہو گئے، اور انھوں نے یوروپ کی جمہوری حکومتوں کے سیاسی اقتدار کو مشرق اور مغرب میں مجروح کرنا شروع کر دیا۔ فاشسٹ اتحاد کے اس تیسرے سرے کے قیام کے جواب میں جمہوری حکومت نے امریکہ سے سیاسی اور اقتصادی رشتہ جوڑنے کی کوشش کی۔ لیکن ابھی یہ کوشش ہو ہی رہی تھی کہ جرمنی نے سوڈیٹن لینڈ کا مطالبہ کر دیا۔ جمہوری حکومتوں نے "لقمہ دوختہ" کے اصول پر چیکو سلوویکیہ کا یہ ٹکڑا اپنی خوشی سے جرمنی کے حوالے کر دیا۔ لیکن جرمنی کی نازی حکومت کو اپنی سلطنت وسیع کرنے کا چسکا پڑ چکا تھا۔ اس نے کچھ ہی دنوں بعد سارے معاہدوں کو بالائے طاق رکھ دیا اور چپ چاپ سارے کا سارا چیکو سلوویکیہ ہضم کر لیا۔ اس حرکت نے یورپ میں ایک ہنگامہ مچا دیا، امریکہ نے بھی خوب شور مچایا لیکن فاشسٹ کانوں پر جوں نہ رینگی۔ امریکہ دور تھا اور اس کو ضرورت نہیں تھی کہ یوروپ کے پھٹے میں پیر دے اور یوروپ کی جمہوری حکومتوں میں اتنی قوت نہیں تھی کہ متحدہ فاشسٹ قوت کا مقابلہ کر سکیں۔ ابھی جمہوری حکومتیں جرمنی کے اس حملے سے سنبھلنے بھی نہ پائی تھیں کہ اٹلی نے ایک خواہ مخواہ کا عذر تراش کے بے تکلف غریب البانیہ کو ہڑپ لیا۔ پے در پے ان تازہ حادثوں نے یوروپ کی ساری چھوٹی بڑی سلطنتوں کو فی الحقیقت بدحواس کر دیا اور انھیں اپنی عافیت اسی میں نظر آئی کہ جلد سے جلد اس فاشسٹ سیلاب کے مقابل میں متحد ہو جائیں۔ چنانچہ نہایت تیزی سے آپس میں معاہدے ہوئے اور سوویٹ روس سے بھی جسکو ابھی تک جمہوری حکومتوں نے نظر انداز کر دیا تھا، گفت و شنید شروع کر دی۔ اس دوران میں جرمن نے پھر ایک کروٹ لی اور پولینڈ سے کاریڈور اور ڈینزگ کا

مطالبہ کر دیا۔ لیکن اب کے جرمنی کو اس مطالبہ کا جواب جمہوری حکومتوں کی طرف سے جنگ کی دھمکی میں ملا۔

پولینڈ کے معاملہ میں جمہوری حکومتوں نے جو استقامت دکھائی تھی اس کا جواب فاشسٹ قوتوں کے تیسرے سرے جاپان کی طرف سے مشرق بعید میں ملا۔ چین کے مفتوحہ شہروں میں بسنے والے مٹھی بھر تجارت پیشہ انگریزوں اور ان کے چوکیدار فوجی دستوں کو جاپانیوں نے تنگ کرنا شروع کیا۔ اور بعض صورتوں میں ان کے ساتھ ایسا ذلت آمیز سلوک روا رکھا کہ اگر یورپ میں حالات اس درجہ بگڑے ہوئے نہ ہوتے تو برطانیہ اور جاپان کے درمیان باقاعدہ جنگ شروع ہونے میں کوئی کسر نہ تھی۔ برطانیہ کے علاوہ فرانس اور امریکہ کے باشندوں سے ساتھ بھی چین کے مفتوحہ شہروں میں بھی جاپان نے یہی سلوک روا رکھا اور یہ سمجھ کر ایسا سلوک کیا گیا کہ برطانیہ اور فرانس کو خواہ کتنا ہی اشتعال دلایا جائے۔ مشرق بعید میں ان کے مفاد پر کیسی ہی کاری ضرب لگائی جائے وہ اپنی توجہ جاپان کی طرف نہ پھیر سکیں گے اگر وہ اس طرف متوجہ ہوں گے تو شمالی یوروپ اور بحر روم میں انھیں جرمنی اور اٹلی کے ہاتھوں زک اٹھانی پڑے گی۔ اس لئے کہ یہ دونوں اسی تاک میں تھے کہ یورپ میں جمہوری حکومتیں ذرا بھی کمزور ہوں تو ہم حملہ کر بیٹھیں۔ بلکہ مشرق بعید میں جاپان کو برطانیہ اور فرانس کے خلاف اُکسایا ہی اس لئے گیا تھا کہ ان دونوں جمہوری حکومتوں کی توجہ بٹی رہے اور وہ یوروپ میں فاشسٹ قوتوں کے خلاف مؤثر محاذ تیار نہ کر سکیں۔

البتہ امریکہ کے متعلق جاپان کا نظریہ دوسرا تھا وہ گئے ہاتھوں برطانیہ اور

فرانس کے ساتھ اس کو بھی مرعوب تو کرنا چاہتا تھا لیکن اس سے بگاڑنے کے لئے تیار نہ تھا۔ کیونکہ امریکہ سے بگاڑنے میں اس کا سراسر نقصان تھا۔ اسی لئے جاپان نے امریکی باشندوں کے معاملہ میں احتساب کا وہ انداز نہ رکھا جو فرانسیسی اور برطانوی باشندوں کے ساتھ جائز رکھا تھا۔

نتیجہ اس کش مکش کا یہ نکلا کہ برطانیہ نے مصلحتاً دب کر جاپان کو راضی کر لیا لیکن امریکہ نے جاپان کے اس غیر شریفانہ طرز عمل کی یہ سزا دی کہ ۱۹۱۱ء میں جاپان اور امریکہ کے درمیان جو تجارتی معاہدہ ہوا تھا وہ اپنی طرف سے توڑ دیا۔ امریکہ کی طرف سے یہ بالکل غیر متوقع اقدام تھا جس نے جاپان کو چکرا دیا اور یورپ کی فاشسٹ قوتوں کو بھی بے مزا کر دیا۔ اس لئے کہ اس معاہدہ کی شکست کی زد براہ راست جاپانی مالیہ پر پڑتی تھی اور ایسی صورت میں جبکہ جاپان چین میں خلاف توقع ایک طویل جنگ میں پھنس کر معاشی حیثیت سے دیوالیہ ہو رہا تھا اس معاہدہ کی تنسیخ کا جاپانی اقتصادیات پر نہایت ناگوار اثر پڑنا لازمی تھا۔

امریکہ نے جاپان کے خلاف یہ حکمت عملی اختیار کر کے گویا جمہوری حکومتوں کی مشرق بعید میں رہنمائی کی، اس سے پہلے بھی وہ یوروپین معاملات میں امن پسند قوموں کی اسی طرح رہنمائی کر چکا تھا۔ جب اس نے ہٹلر اور مسولینی کو براہ راست مخاطب کر کے دنیا کے امن کو تباہ کرنے کی ذمہ داری ان کے کندھوں پر ڈالی تھی۔

. . .

یہ ذکر ہو چکا ہے کہ اٹلی کے البانیہ کو ہضم کر جانے کے بعد یوروپ کی چھوٹی بڑی وضع کی جمہوری سلطنتوں میں نہایت تیزی سے اتحاد ہو گیا

اور روس سے بھی اتحاد کی گفت و شنید شروع ہو گئی۔ سوئٹ روس اس وقت یوروپ کی اول درجہ کی طاقتوں میں سب سے زیادہ طاقتور اور آلات جدید سے مسلح سلطنت ہے اور قرینہ یہ ہے کہ یہ طاقت جس طرف بھی جھک جائیگی جنگ میں کامیابی اسی فریق کی ہو گی۔

سیاسی حیثیت سے روس اور فاشست قوتوں کا کوئی میل نہیں بلکہ یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد واقع ہوئی ہیں۔ البتہ سوئٹ اور یوروپ کی جمہوری حکومتوں کا ساتھ ہو سکتا تھا۔ لیکن جمہوری حکومتوں نے سوئٹ روس کے غیر معتدل طرز حکومت کو دیکھ کر کبھی اس سے اتحاد کی کوشش نہیں کی، اور ہمیشہ اس کو نظر انداز کیا۔ بلکہ اس کے برخلاف ان حکومتوں کی کوشش یہ رہی کہ کسی طرح فاشست قوتوں میں پھوٹ ڈالیں اور علیحدہ علیحدہ ان میں کی ہر قوت کے ساتھ سودا کر لیں۔ لیکن جب جمہوری حکومتوں کو اپنی اس پالیسی میں ناکامی ہوئی تو آخر مجبور ہو کر انھوں نے سوبیٹ روس ہی کو اپنی شرائط پر راضی کرنا چاہا لیکن سوبیٹ روس بھی جمہوری حکومتوں کی اس کمزوری اور غرض مندی سے ناواقف نہیں تھا۔ اس نے اپنا موقع دیکھا اور فوراً جمہوری حکومتوں کی شرائط پر فوجی اتحاد کرنیکی بجائے اس نے ایسے اتحاد کے لئے اپنی طویل اور بڑی کڑی شرطیں پیش کر دیں اور جمہوری حکومتوں سے مطالبہ کیا کہ حملہ کی صورت میں وہ روس کی ہمسایہ سلطنتوں اور اس کی اپنی سرحدوں کی حفاظت کی ذمہ داری لیں۔ مطالبہ سخت تھا۔ جمہوری قوتیں اسے فوراً منظور نہ کر سکیں، اس لئے گفت و شنید ختم ہو گئی۔

سوئیٹ روس کے یہ تیور دیکھ کر فاشست قوتوں نے روس پر ڈورے ڈالنے شروع کئے۔ نازی پولیس میں سوئٹ روس کے خلاف پروپیگنڈا

بند کر دیا گیا اور جرمنی نے سوویٹ روس سے تجارتی معاہدے کیلئے گفت و شنید شروع کر دی۔ دوسری طرف اس گفتگو کو مؤثر بنانے کے لئے فاشست قوتوں کے تیسرے سرے جاپان نے منچکو کی طرف سے روسی سرحد پر چھیڑ چھاڑ شروع کر دی جس میں رفتہ رفتہ معمولی فوجی دستوں کے علاوہ ٹینک مشین گن اور ہوائی جہازوں نے بھی حصّہ لینا شروع کر دیا۔ مقصد اس چھیڑ چھاڑ کا یہ تھا کہ سوئٹ روس جمہوری حکومتوں سے معاہدہ کرنے سے پہلے اچھی طرح سمجھ لے کہ وہ یورپ میں اپنی ساری قوت مجتمع نہ کر سکے گا۔ بلکہ اسے اپنی قوت کو ایشیا اور یورپ کی سرحدوں پر تقسیم کرنا ہوگا، اور ایسی صورت میں وہ جمہوری حکومتوں کے ساتھ ملکر کامیابی سے فاشست قوتوں کا مقابلہ نہ کر سکے گا۔

یورپ اور ایشیا کی بڑی بڑی قوتوں کے درمیان سیاسی داؤں گھاتوں کی اس تفصیل سے صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ چین اور جاپان کی موجودہ کش مکش صرف ایشیا کی ان ہی دو حکومتوں تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ جمہوری وضع کی قدیم یورپین حکومتوں اور جدید فاشست قوتوں کے درمیان اقتدار کی جنگ ہے، جس کی کڑیاں ایک طرف یورپ کے شمال مغرب سے اور دوسری طرف جنوب مغرب سے ملتی ہیں۔

اس اعتبار سے چین اکیلا جاپان سے نبرد آزما نہیں بلکہ روس، برطانیہ فرانس، اور امریکہ بھی اس کش مکش میں چین کے شریک ہیں۔

خصوصاً روس اس قضیہ میں سب سے زیادہ ملوث ہے، اس لئے کہ اگر چین پر جاپانی اقتدار قائم ہو جاتا ہے تو سوویٹ روس کے لئے اپنی تمام تر

توجہ اپنی ایشیائی سرحدوں کی طرف مرکوز رکھنی ضروری ہو جاتی ہے اور ایسی صورت میں یورپ میں اس کا وزن کم ہو جاتا ہے۔ اس لئے سوویٹ روس پوری کوشش کر رہا ہے کہ چین پر جاپانی اقتدار قائم نہ ہونے پائے اور اس کے لئے وہ مارشل چنگ کائی شک کی بیدریغ مدد کر رہا ہے۔ دوسرے منبر پر برطانیہ اور فرانس کے ایشیائی مقبوضات خطرہ میں گھر جاتے ہیں اور یوروپ میں مشغول یہ قوتیں آسانی کے ساتھ اس خطرے کی مدافعت نہیں کر سکتیں۔ یہ صورت حال ہے، جس سے مجبور ہو کر یوروپ کی یہ بڑی بڑی قوتیں چین کو امداد دے رہی ہیں، اور مارشل چیانگ اس موقع کو غنیمت سمجھ کر ان سلطنتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہا ہے، اور جاپانیوں کی راہ میں ایسی مشکلیں حائل کر رہا ہے جن پر وہ آسانی سے قابو نہیں پا سکتا۔

ابتدا میں یہ خیال تھا کہ جاپان طویل مدت تک جنگ نہیں کر سکتا۔ اگر ایک برس بھی چین نے استقامت دکھائی تو جاپان کو شکست ہو جائے گی لیکن اب اس خیال کو اہمیت حاصل نہیں ہے، اقتصادی حیثیت سے تو جاپان اس وقت قریب قریب دیوالیہ ہے لیکن فوجی حیثیت اسکی کافی قوی ہے، اور ملکی سیاست پر بھی فوجی پارٹی ہی کا قبضہ ہے جس کے بل پر یہ اتنک چین کے مقابلہ میں ڈٹا ہوا ہے، البتہ اس کا قرینہ موجود ہے کہ جاپان کے سیاسی حالات میں تبدیلی ہوگی۔ اقتصادی بے چینی بہت دنوں تک فوجی چالوں سے دبائی نہ جا سکے گی اور جاپان کے اعتدال پسند سیاسی رہنما جو اس وقت حکومت سے بے دخل ہیں یا جیلوں میں پڑے ہوئے ہیں ایک مرتبہ پھر برسر اقتدار آجائیں گے۔ اگر جلد ہی صورت حال میں یہ تبدیلی ہوئی تو جاپان کی فوجی پالیسی کو چین میں شکست فاش ہو جائیگی اور جمہوری حکومتوں

کا اقتدار بڑھ جائے گا۔ لیکن اگر مستقبل قریب میں یہ صورت پیدا نہ ہوئی تو قرینہ یہ ہے کہ اب زیادہ دنوں مارشل چیانگ کائی شک جاپانیوں کی مدافعت نہ کر سکے گا۔ اور چین کے ساتھ جمہوری حکومتوں کو بھی مشرق بعید میں اپنے تجارتی اور سیاسی مفاد سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔

اس نوبت پر جمہوری حکومتوں کے لئے دو ہی صورتیں ہیں یا تو عالمگیر جنگ چھیڑ دیں۔ یا پھر چپ چاپ فاشسٹ اقتدار کے آگے گردن ڈالدیں۔

یوروپ کی جمہوری حکومتوں نے پہلی صورت کو پسند کیا اور پولینڈ پر جرمنی کے حملہ کے ساتھ ہی جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ جرمنی نے پولینڈ پہ حملہ سے پہلے روس سے دس برس کے لئے ایک دوسرے پر حملہ نہ کرنے کا معاہدہ کر لیا تھا اور اسے یہ یقین دلایا تھا کہ پولینڈ کا وہ حصہ جو جنگ عظیم سے پہلے روس میں شامل تھا اسے واپس دیدیا جائے گا۔ چنانچہ جرمنی نے پولینڈ کو آسانی سے فتح کر لیا اور آدھا پولینڈ روس کے حوالے کر دیا۔ پولینڈ کا آدھا حصہ واپس لینے کے بعد روس بالٹک کے علاقہ میں اپنی پوزیشن مضبوط کرنے میں مصروف ہو گیا اور جب اس سے فارغ ہوا تو فن لینڈ کے قضیہ میں پھنس گیا۔ فن لینڈ سے جنگ کے دوران میں وہ مارشل چیانگ کی مدد جاری نہ رکھ سکا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مارشل کی فوجوں کو کئی جگہ بھاری شکستیں اٹھانی پڑیں۔ لیکن جب روس فن لینڈ کے قضیہ کو طے اور اپنی یوروپین سرحدوں کو ہر امکانی خطرے سے محفوظ کر کے مشرق بعید کی طرف متوجہ ہوا تو جاپان نے اپنی خارجہ پالیسی میں لچک پیدا کر لی۔ یوروپ میں جنگ چھڑتے ہی جاپان نے چین کے مفتوحہ علاقہ میں اپنے زیر اثر ایک مرکزی حکومت قائم کر ڈالی۔

اس چال سے اس کا مقصد یہ تھا کہ خود چینیوں کو آپس میں لڑا دیا جائے اور اس نئی مرکزی حکومت سے مارشل چیانگ کی حکومت کو زک پہونچائی جائے۔ دوسری طرف اس نے روس کو منانے کی تدبیریں کیں۔ پہلی تدبیر تجارتی معاہدہ ہے جو روس اور جاپان کے مابین طے ہو چکا ہے۔ دوسری تدبیر ایک دوسرے پر حملہ نہ کرنے کا میثاق ہے۔ جس پر جاپان اور روس دونوں ملکوں کے دستخط ہو چکے ہیں۔

کچھ دن پہلے یہ افواہ اُڑی تھی کہ ان میں آپس میں ایک دوسرے پر حملہ نہ کرنیکا میثاق ہو چکا ہے اس افواہ سے سب سے زیادہ امریکہ کو بے چینی ہوئی تھی اس لئے کہ اس سے امریکہ ہی کو سب سے زیادہ نقصان بھی تھا لیکن جب اس معاملہ کی حقیقت پر روشنی پڑی تو امریکہ کی بے چینی دور ہوگئی اور اس نوبت پر جب کہ جرمنی اور روس کی دوستی ختم ہو چکی ہے اور جرمنی بُری طرح روس کی جنگ میں الجھ چکا ہے، جاپان اور روس کے معاہدے کی وقعت برائے نام رہ گئی ہے بلکہ قرینہ یہ ہے کہ جاپان اٹلی کی طرح روس کی حالت دگرگوں دیکھکر معاہدے کی پروا کئے بغیر روس کے خلاف میدانِ جنگ میں کود پڑے گا۔ چنانچہ اس مہم کی تیاری کے لئے جاپان نے انڈو چائنا پر بھی قبضہ کر لیا ہے اور منچکو کی سرحد پر بھی اپنی دس لاکھ فوج پہنچا دی۔ جاپان کا یہ اقدام چین کے لئے مبارک ثابت ہوا، امریکہ، برطانیہ، چین اور ڈچ ایسٹ انڈیز کا ایک نیا اتحاد بحرالکاہل میں جاپان کے خلاف قائم ہو گیا۔ جاپان کو صرف روس اور چین سے نہیں بلکہ ان چاروں سے لڑنا پڑے گا۔

چیانگ کے سیاسی کارناموں اور موجودہ جنگ میں چین کی صحیح پوزیشن

معلوم کرنے کے بعد اس جگہ چیانگ کی نمایاں خصوصیات اور اس کی نجی زندگی کا سرسری تذکرہ بھی غالباً دلچسپی سے پڑھا جائیگا۔

چیانگ کائی شک نسل کے اعتبار سے تو چینی ضرور ہے۔ لیکن چینیوں کی کوئی نسلی خصوصیت اس میں نہیں پائی جاتی۔ وہ مفکر ضرور ہے۔ لیکن مفکر سے زیادہ عملی انسان ہے اور انتہائی مشقت پسند! وہ عموماً علی الصبح بیدار ہوتا ہے اور رات گئے تک کام کرتا رہتا ہے۔ البتہ دوپہر کے کھانے کے بعد کسی قدر سستانے کا عادی ہے اور سورج غروب ہونے سے پہلے ایک گھنٹہ وہ چہل قدمی بھی کرلیتا ہے

شراب اور تمباکو سے اسے عمر بھر پرہیز رہا بلکہ چائے اور کافی بھی بہت کم استعمال کرتا ہے وہ ذاتی طور پر تو مالدار نہیں ہے۔ لیکن میڈم چیانگ چین کی متمول ترین خاتون اسکی بیوی ہے، اس کے باوجود وہ انتہائی سادگی سے رہتا ہے اور کھانے پینے اور رہنے سہنے میں کسی قسم کا تکلف، اور امارت کو پسند نہیں کرتا۔

وہ انتہائی محتاط اور با اصول شخص ہے۔ ہر کام ایک نظم اور قاعدے کے اندر کرتا ہے۔ جب سے یہ چین میں برسر اقتدار آیا ہے۔ اس نے اپنا ایک روزنامچہ بنایا ہے جس میں یہ روزانہ کے واقعات بھی بالاختصار نوٹ کرتا ہے اور کسی مسئلہ میں اپنے حقیقی خیالات بھی لکھتا رہتا ہے۔ مشہور ہے کہ دسمبر ۱۹۳۶ء میں جب کمیونسٹوں نے اسے "سیانفو" میں گرفتار کر لیا تھا تو اسی روزنامچہ نے اسکی جان بچائی تھی۔ کیونکہ اس روزنامچے میں جگہ جگہ چیانگ نے جاپانیوں سے اظہار بیزاری کیا تھا۔ اور ایک جگہ یہ لکھ دیا تھا کہ چین جب متحد اور طاقتور ہو جائے گا۔ تو اسے ایک مرتبہ جم کر جاپانیوں کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔

وہ بہت حساس اور خشک طبیعت انسان ہے۔ بہت کم کسی سے ملتا ہے۔ اور عام مظاہروں میں مشکل سے شریک ہوتا ہے۔ جذباتی ہنگاموں سے اسے نفرت ہے اور اپنی اس نفرت کو وہ خاص خاص موقعوں پر بھی چھپانے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ لیکن جب کبھی مارشل چیانگ کسی غیر ملکی افسر یا سیاح سے ملنے پر مجبور ہوتا ہے تو اس کا اخلاق بے داغ اور آداب مجلس بہت مسحور کن ہوتا ہے۔ اس معاملہ میں دراصل میڈم چیانگ اس کی رہنمائی کرتی ہے۔

وہ نہایت سخت گیر حاکم اور مطلق العنان ڈکٹیٹر ہے۔ سنہ ۱۹۲۷ء کے انقلاب میں اس نے ہزاروں کمیونسٹوں کو بیدریغ قتل کرا دیا اور جس نے اس کے اصول حکومت سے اختلاف کیا، اس کو سخت سے سخت سزا دینے میں اس نے کبھی پس و پیش نہیں کیا۔ لیکن اسی کے ساتھ ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ اس نے اپنے بدترین دشمن کو بھی معاف کر دیا، اور اس سے سمجھوتہ کر لیا۔

وہ نہایت ضدی اور خودسر انسان ہے۔ جس کام کی دھن اس پر سوار ہو جاتی ہے وہ اسے پورا کئے بغیر نہیں چھوڑتا اور جب وہ کوئی بات اپنے طور پر طے کر لیتا ہے تو پھر اس سے کسی قیمت دستبردار نہیں ہوتا۔

سنہ ۱۹۳۶ء میں جب باغیوں نے اس کو گرفتار کر کے قید کر دیا تھا اور ہر منٹ اس کی جان خطرے میں تھی اس وقت بھی اس کی خودسری نے اس کا ساتھ نہ چھوڑا۔ نہ وہ اپنی جان کے خوف سے اپنی ضد سے باز آیا، اور نہ باغیوں سے کسی قیمت پر سمجھوتہ کرنے پر تیار ہوا۔ اسی قید کے عالم میں اس نے میڈم کو ایک طویل اور اپنی دانست میں آخری خط لکھا تھا وہ لکھتا ہے:-

"میں نے یہ طے کر لیا ہے کہ اگر ضرورت ہوئی تو اپنی جان تک اپنے ملک پر نثار کر دوں، تم میرے لئے ملول نہ ہونا۔ میں کوئی بات ایسی نہ کرونگا"

جو میری بیوی کو شرمسار رکھے یا ڈاکٹر سن یات سن کے ایک سچے پیرو کے شایان شان نہ قرار پاسکے، میں مشیت کی طرف سے انقلاب پیدا کرنے کیلئے دُنیا میں آیا ہوں اور اسی مقصد کے لئے اپنی جان دیدونگا۔

وہ نہایت خودرائے اور خود اعتماد انسان ہے۔ اس کو اپنی سیاسی حکمت عملی پر اس درجہ یقین رہتا ہے کہ وہ اپنے مخالفین تک سے اسے منوانے کی جلدی نہیں کرتا، بلکہ جانتا ہے کہ یہ لوگ جلد یا بدیر اپنی غلطی محسوس کرینگے، اور اس کے ہم رائے ہو جائیں گے۔

ضبط اور تحمل اس میں بہت ہے۔ جلدی میں یا بے سوچے سمجھے کوئی اقدام نہیں کرتا، بلکہ اس وقت تک طرح دیتا ہے، جب تک وہ اقدام کیلئے مجبور نہیں ہوتا۔

نہایت ذہین اور چوکنا انسان ہے، بات کرنے میں ہمیشہ اس کی تہہ کو پہونچ جاتا ہے، اور جواب دینے میں ہمیشہ اختصار سے کام لیتا ہے۔ ہر وقت چوکنا رہتا ہے۔ اپنے خاص خاص افسروں پر بھی کم بھروسہ کرتا ہے۔

وہ سستی شہرت اور ہر دلعزیزی کو پسند نہیں کرتا۔ یوروپ کے ڈکٹیٹر ہٹلر اور مسولینی کی طرح اس کی تصویریں اخباروں میں نہیں چھپتیں اور نہ وہ کسی سوسائٹی کے جلسے میں شریک ہوتا ہے۔ اپنا سارا وقت یا تو دفتر میں یا میڈم کے ساتھ گذارتا ہے جو اس کی بیوی بھی ہے اور سلطنت کے معاملات میں اس کی مشیر بھی ہے۔

چیانگ ڈاکٹر سن کے بعد قومی فوجوں کا سپہ سالار ہوا، اور آج چین کا

ڈکٹیٹر ہے۔ لیکن تنخواہ وہ اب تک صرف ایک ہزار چینی ڈالر ماہوار لیتا ہے۔
جو ہندوستانی روپیہ کے حساب سے ڈھائی سو کے قریب ہوتے ہیں۔
اور اسی میں اپنی گذر کرتا ہے۔ ایک فوجی گارڈ ہمیشہ اس کی حفاظت کے لئے
ساتھ ہوتا ہے۔ لیکن اکثر اوقات وہ معمولی لباس میں بازاروں میں بھی گھومتا
پھرتا نظر آتا ہے اور خدوخال میں اس کے چونکہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے
اس لئے چینی اکثر اس کو پہچان بھی نہیں سکتے۔ اس کی موٹر کے شیشے
ایک انچہ دبیز اور پستول یا بندوق کی گولی کے لئے بے اثر ہوتے ہیں۔
چیانگ کا یہ معمول ہے کہ وہ ہر دوشنبہ کی صبح کو چاہے وہ کہیں ہو۔ چھ سو چینی
معززین کا اجتماع کرتا ہے اور اس اجتماع کے سامنے نہایت عقیدت اور احترام
کے ساتھ ڈاکٹر سن یات سن کے مقرر کردہ اصول سیاست پر ایک خطبہ
دیتا ہے۔ یہ تقریب اس طرح ادا کی جاتی ہے کہ چھ سو معزز چینی ایک کھلے مقام
پر جمع ہوتے ہیں۔ فوجی دستے جنگی ترانہ بجاتے ہوئے۔ ان معززین کے آگے
سے چیانگ کو سلامی دیتے ہوئے گذرتے ہیں۔ ان فوجی دستوں کے گذرنے
کے بعد چیانگ ڈاکٹر سن یات سن کی تصویر کی نقاب کشائی کرتا ہے۔ اور
سب چینی نہایت ادب کے ساتھ تین دفعہ اس تصویر کے آگے سر جھکاتے ہیں۔
اس کے بعد چیانگ ڈاکٹر سن یات سن کے مقرر کردہ اصول سیاست
انھیں سناتا ہے۔ بالکل اس طرح جیسے صحیفہ آسمانی سنایا جاتا ہو۔ چینی
نہایت خاموشی اور عقیدت کے ساتھ یہ بیان سنتے ہیں۔ اس کے بعد چیانگ
حالات حاضرہ پر ایک طویل خطبہ دیتا ہے، اور خطبہ کے بعد یہ تقریب ختم
ہو جاتی ہے۔

چیانگ تنہائی پسند اور خاموش انسان ہے۔ جب امور سلطنت سے فرصت پاتا ہے تو یا تو میڈم کے ساتھ وقت گذارتا ہے۔ یا کتابوں کے مطالعہ میں مصروف رہتا ہے پرانے چینی لٹریچر سے اسے بڑا شغف ہے اور اکثر اوقات وہ انہی کے مطالعہ میں مصروف رہتا ہے۔ چین کے مشہور فلسفی کنفیوشس کی کتاب سے اسے گویا عشق سا ہے اور اس کتاب کا یہ ٹکڑا اس کے زبان زد ہے۔ جس کو وہ ہمیشہ پڑھتا رہتا ہے:۔

"ملک پر حکومت کرنے سے پہلے اپنے خاندان پر حکومت کرنی چاہیئے۔ اور خاندان پر حکومت کرنے کیلئے پہلے اپنے جسم پر حکومت کرنی چاہیئے، اور جسم پر حکومت کرنے کے لئے پہلے اپنے دل پر حکومت کرنی چاہیئے اور دل پر حکومت کرنے کے لئے پہلے اپنے عزم و ارادہ میں اخلاص پیدا کرنا چاہیئے اور عزم و ارادے میں اخلاص پیدا کرنے کے لئے پہلے اپنے علم اور تجربہ کو بڑھانا چاہیئے۔

چیانگ کی پہلی شادی اس کے والدین نے کی تھی اور اس وقت کی تھی، جب اس کی عمر صرف پندرہ برس کی تھی۔ یہ بہت غریب خاندان اور پرانے طرز کی خاتون تھی۔ اس سے چیانگ کے ایک لڑکا بھی ہوا تھا جس کا نام "چنگ کو" ہے اور اس وقت اس کی عمر تیس برس کی ہے۔ ۱۹۲۱ء میں چیانگ نے اس خاتون کو طلاق دیدی اور ہمہ تن سیاسی کاموں میں مصروف ہو گیا اسی دوران میں چین کے مشہور اور متموّل ترین خاندان "سونگ" سے اس کا ارتباط بڑھا۔ اس خاندان کی بڑی لڑکی چین کے وزیر اعظم "ڈاکٹر کنگ" سے بیاہی ہوئی تھی۔ منجھلی ڈاکٹر سن یات سن کی بیوہ تھی، تیسری اور سب سے

چھوٹی لڑکی" مائی لنگ" اس وقت تک کنواری تھی۔ لیکن جودت اور ذہانت میں یہ اپنی سب بہنوں پر فوقیت رکھتی تھی۔

چیانگ "مائی لنگ" کی طرف کھچنے لگا۔ اور کچھ دنوں بعد اس سے شادی کا پیغام بھی دے دیا۔ لیکن یہ پیغام منظور نہ ہوا۔ سونگ خاندان اوّل تو عیسائی تھا۔ دوسرے چین میں بہت معزز اور نامور سمجھا جاتا ہے۔ ایک گمنام فوجی سپاہی سے اس خاندان کی لڑکی نہیں بیاہی جا سکتی تھی۔ لیکن اس انکار سے چیانگ بد دل نہیں ہوا۔ اور نہ "مائی لنگ" کو بھولا بلکہ برابر یہ کوشش کرتا رہا کہ کسی طرح وہ "مائی لنگ" کو بیاہ لانے میں کامیاب ہو جائے۔

۱۹۲۷ء میں جب چیانگ نے ہانکاؤ کی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا اور نانکن میں اپنی حکومت علیٰحدہ قائم کر لی۔ اس وقت جا کر کہیں اس کی شادی کا مسئلہ حل ہوا۔ غالباً اس لئے کہ اب چیانگ گمنام سپاہی نہ رہا تھا۔ بلکہ ایک حکومت کا بانی تھا۔ چنانچہ یکم دسمبر ۱۹۲۷ء کو اس نے عیسائی رسوم کے مطابق "مائی لنگ" سے شادی کر لی۔ شادی کے موقع پر اس نے اخبار والوں کو یہ دلچسپ بیان دیا تھا۔

"اب چینی انقلاب نہایت تیزی سے تکمیل کو پہونچ سکے گا۔ اسلئے کہ اب میں یکسو ہو کر اس کی تکمیل کی کوشش کروں گا۔"

شادی کے تین برس بعد چیانگ نے عیسائی مذہب قبول کر لیا۔ ابتدا میں جب چیانگ نے مائی لنگ سے شادی کی درخواست کی تھی تو "مائی لنگ" کی ماں نے یہ شرط کی تھی کہ چیانگ عیسائی ہو جائے۔ لیکن ضدی چیانگ نے اس وقت اسے منظور نہیں کیا تھا اور یہ جواب دیا تھا کہ اگر میں شادی کی

خاطر اپنا مذہب تبدیل کرونگا تو خود اپنی اور تمہاری دونوں کی نظروں میں حقیر ہو جاؤنگا۔ البتہ میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ شادی کے بعد میں عیسائی مذہب کی کتابوں کا مطالعہ کروں گا اور اگر میرا دل اس مذہب پر جھک گیا تو پھر میں بے تکلف عیسائی ہو جاؤنگا۔ چنانچہ اس نے یہی کیا۔ شادی کے بعد میڈم کی مدد سے اس نے عیسائی لٹریچر کا مطالعہ کیا اور ۲۳ر اکتوبر ۱۹۳۰ء کو بپتسمہ لے لیا۔

میڈم چیانگ نہایت خوبصورت، بہت ذہین اور سیاسی معاملات میں پوری پوری بصیرت رکھتی ہے اور چیانگ کے برخلاف یہ چینیوں میں بہت ہر دلعزیز بھی ہے۔ چینی اسے محبت اور احترام کے ساتھ صرف میڈم کہتے ہیں اور ملک میں چیانگ کے بعد سب سے زیادہ اسی کی عزت کرتے ہیں۔

چیانگ کو میڈم سے محبت ہی نہیں عشق ہے اور خود میڈم کو بھی چیانگ اور اس کے مقصد سے پوری پوری ہمدردی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ چیانگ کی نجی زندگی صحیح معنوں میں پُرمسرت زندگی ہے۔

چین کا ڈکٹیٹر تو بیشک چیانگ ہے، لیکن حکومت میں میڈم برابر کی دخیل ہے۔ وہ چیانگ کے دوش بدوش ہر جگہ پہونچ جاتی ہے اور بعض دفعہ وہ کام کر جاتی ہے جو خود چیانگ سے نہیں ہو سکتا۔

چین اور جاپان کی موجودہ کشمکش میں عوام کو چیانگ سے زیادہ میڈم نے تیار کیا۔ اس کی جوشیلی تقریریں جن چینیوں کے کانوں میں پہونچیں انھیں بے خود بنا دیا، اور جگہ جگہ دورہ کرکے میڈم نے اپنے وطن کی خاطر چینیوں کو اپنے خون کا آخری قطرہ بھی بہا دینے پر آمادہ کر لیا۔

نانکن کی حکومت کے قیام کے بعد چیانگ نے جو اصلاحات نافذ کیں ان میں میڈم کا ہاتھ تھا اور کمیونسٹوں کے ساتھ آخر میں جو چیانگ کی مصالحت ہوئی وہ بھی میڈم ہی کا کارنامہ تھا۔

غرض چین میں اس وقت چیانگ اور میڈم کو عام طور پر فوق الفطرت ہستیوں کا درجہ حاصل ہے۔ چینی ان سے محبت بھی کرتے ہیں۔ ان سے ڈرتے بھی ہیں۔ انھیں اپنا سیاسی رہنما بھی مانتے ہیں اور اوتاروں کی طرح ان سے عقیدت بھی رکھتے ہیں۔

چیانگ اور میڈم متحدہ چینی قومیت کا نشان سمجھتے ہیں۔ وہ بات جو صدیوں سے چین کو حاصل نہیں ہوئی تھی۔ آج ان دونوں کی قیادت میں اسے حاصل ہے۔ آپس کے تفرقوں اور اختلافوں کو مٹا کر چینی آج بے تکلف ان کے جھنڈے کے نیچے جمع ہیں اور اپنے وطن عزیز کو جاپانی درندوں کے پنجے سے بچانے کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ بھی بہانے کو تیار ہیں۔

موجودہ جنگ کا نتیجہ چاہے کچھ ہی نکلے لیکن جو روح چیانگ نے چینیوں میں پھونک دی ہے اس نے فی الحقیقت چینیوں میں نئے حوصلے اور نئی امنگیں پیدا کر دی ہیں اور جس قوم میں یہ بات پیدا ہو جاتی ہے وہ قوم نہ پھر منتشر رہتی ہے اور نہ غیروں کی محکوم۔ چینیوں کو چیانگ نے یہ ایسی نعمت بخشدی ہے کہ جب تک چینی زندہ ہیں۔ چیانگ کا نام زندۂ جاوید ہے۔

اعلیٰ حضرت رضا شاہ پہلوی

ایران کا وہ دلیر اور منچلا سپاہی، جس نے اپنی خدا داد قوتوں سے ایران قدیم کے کہنہ اور فرسودہ قصر حکومت کو ڈھایا اور اپنی فطری صلاحیتوں کی مدد سے انہی کھنڈروں پر پہلے سے زیادہ عظیم الشان اور رفیع المرتبت ایران جدید کی بنیاد ڈالی۔

قدرت نے رضا شاہ میں بڑی بڑی صلاحیتیں ودیعت کی ہیں۔ وہ سپاہی بھی ہے اور بالغ نظر اور مصلحت اندیش سیاسی مدبر بھی ہے، وہ بیدار مغز حاکم اور مطلق العنان قسم کا آمر بھی ہے اور قوم کا نبض شناس اور نہایت ہی روشن دماغ ریفارمر بھی ہے۔

سیاسی اور معاشی حیثیت سے پامال ایران کو وہ خاک سے اٹھاتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے اسے سُرمۂ چشم حسود بنا دیتا ہے، تھکے ہوئے حوصلہ ہارے ہوئے اور اخلاقی حیثیت سے پست اور بے حس ایرانیوں کی قیادت کرتا ہے اور ان میں نئی زندگی، نئی اُمنگ اور نیا حوصلہ پیدا کر دیتا ہے! دُنیا ایک اَن پڑھ سپاہی کی کامیابی پر مبہوت ہے اور ایران مسرور ہے کہ صدیوں بعد اُسے ایسا رہنما ملا جو دُنیا کو ایران کی عظمتِ رفتہ کا بھولا ہوا افسانہ پھر یاد دلا رہا ہے۔

رضا خاں کے خاندان اور اس کے ابتدائی حالات کے متعلق اس کے

وقائع نگاروں میں اختلاف ہے۔ بعض اس کو امرائے ایران میں سے بتاتے ہیں اور بعض اس کا سلسلۂ نسب ایران کے قدیم شاہی خاندان سے ملا دیتے ہیں۔ لیکن اکثر ثقہ قسم کے وقائع نگاروں کا اس پر اتفاق ہے کہ رضا خان صوبۂ ماژندران کے ایک گمنام کسان خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور یہی ہماری رائے میں درست بھی ہے۔

مشہور ہے کہ رضا خان پندرہ برس کی عمر میں گھر سے نکلا اور تلاش معاش میں طہران آیا۔ ابتداً اسے وزیر فوج کے اصطبل میں جگہ ملی مگر اس واقعے کے پانچ برس بعد یہ کاسک بریگیڈ میں سپاہی کی حیثیت سے بھرتی ہو گیا۔

رضا خاں نہایت قوی ہیکل، بہادر اور منچلا نوجوان تھا، اور فوجی ملازمت سے چونکہ اس کو طبعاً مناسبت تھی اس لئے یہ سپاہی سے بہت جلد ترقی کرکے پہلے لفٹننٹ اور بعد میں اسی بریگیڈ کا کپتان ہو گیا۔ ۱۹۱۹ء میں کپتان رضا خاں نے سرحدی باغیوں کے مقابلہ میں غیر معمولی شجاعت اور جنگی قابلیت کا مظاہرہ کیا، جس کے باعث ایران کی صف اول کے تربیت یافتہ فوجی افسروں میں اس کا شمار ہونے لگا۔

۱۹۲۰ء میں آذربائیجان کے اشتراکی جمہوریت پسندوں سے ایرانی فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ کاسک بریگیڈ بھی اس مقابلہ میں شریک تھا، ایرانیوں کو شکست ہوئی۔ رضا خاں نے اپنی بریگیڈ کے منتشر شیرازے کو دوبارہ ترتیب دے کر دشمن کے مقابل ہونے میں بڑی قابلیت اور فنی مہارت دکھائی۔ جس کے صلہ میں کپتان رضا خان کو کاسک بریگیڈ کا کرنل بنا دیا گیا۔ اس عہدہ پر پہونچ کر کرنل رضا خاں نے ملک کی سیاست میں براہ راست حصّہ لیا اور حکومت ایران کو اس کی خداداد صلاحیتوں سے بہرہ اندوز ہونے کا موقع ملا۔

رضا خان کی ابتدائی سیاسی سرگرمیوں کو سمجھنے کے لیے اس وقت کے ایرانی ماحول کا مطالعہ بہت ضروری ہے تاکہ ان حالات کا آسانی سے اندازہ ہو سکے جن کے ماتحت ایک فوج کا کرنل ایران جیسی با جبروت سلطنت کا شہنشاہ ہو گیا۔

اصل میں رضا خاں ایران میں جس انقلاب کا بانی ہوا ہے اس کی ابتدا ناصر الدین شاہ قاچاری کے زمانہ میں پڑ چکی تھی۔

ناصر الدین جو خاندان قاچار کے آخری دور کے فرمانرواؤں میں تھا بے انتہا عیاش، فضول خرچ، مغرور اور ملک کے نظم و نسق سے بے پروا بادشاہ تھا۔ اسی کے زمانہ میں ایران غیر ملکی اقتدار کی کشمکش کا اکھاڑا بنا اور مغربی اقوام کے لیے زرخیز چراگاہ ثابت ہوا۔ امور مملکت کی طرف سے ناصر الدین کو اس درجہ بے پروا پاکر ایرانیوں میں بے چینی پیدا ہوئی، اور بابی تحریک نے جس نے اسی زمانہ میں ایران میں جنم لیا تھا، اپنا رخ ناصر الدین کی ذات کی طرف پھیر دیا۔ ناصر الدین کو یہ کب گوارا ہو تا کہ خود اس کے ملک کی ایک جماعت اس کے اعمال پر نکتہ چینی کرے۔ اس نے بابی تحریک کے خلاف فوجی کارروائی کی اور اس تحریک کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ ڈالا۔ لیکن ناصر الدین کی اس کارروائی سے ملک میں اس کے خلاف اور شدت سے جوش پھیلا اور جگہ جگہ حکومت کی مخالفت میں خفیہ جماعتیں عالم وجود میں آگئیں۔ اسی زمانہ میں ناصر الدین کو یورپ جانے کی سوجھی خزانہ میں روپیہ نہیں تھا۔ روس اور برطانیہ سے روپیہ قرض لیا۔ اور اس کے عوض ایران کی تجارت میں ان کو خاطر خواہ مراعات دیدیں۔

تجارت میں مراعات دینا برائے نام تھا۔ ایران کے ہر شعبے میں

اصلاح کے نام سے روسی، فرانسیسی اور انگریز قابض ہو گئے اور غریب ایرانیوں کے لئے سوائے زراعت کے اور کوئی وسیلۂ معاش باقی نہ رہا۔ ملک شاہ کے عائد کردہ ناواجبی ٹیکسوں سے گراں بار تھا، نظم و نسق حکومت کا دوسری قوموں کے ہاتھ میں تھا۔ جو ہر طرح ایرانیوں کو پست و ذلیل رکھنے میں کوشاں تھے۔ ملک میں عام طور پر بدنظمی اور ناصر الدین کے عہد سے بددلی پیدا ہونے لگی۔ اسی زمانہ میں سید جمال الدین افغانی ایران سفر پر پہنچے۔ گئے تو تھے بہ ناصر الدین کے مہمان ہو کر لیکن ایران میں اُنھوں نے جو صورت حال دیکھی اس سے انھیں بہت دُکھ پہنچا۔ اُنھوں نے پہلے تو ناصر الدین کو ملک کی اس زبوں حالی کی طرف متوجہ کرنا چاہا۔ لیکن جب اس میں انھیں کامیابی نہ ہوئی تو انھوں نے علانیہ حکومت کی مخالفت شروع کر دی، اور اپنے شاگردوں میں ایران کے غیر ملکی اقتدار سے جہاد کا جوش پیدا کر دیا۔ اس نوبت پر ناصر الدین نے سید جمال الدین افغانی کو فوراً ایران سے نکال دیا۔ لیکن یہ تدبیر بعد از وقت تھی عوام میں اب کافی بیداری پیدا ہو چکی تھی، مذہبی مولوی جو سید جمال الدین سے استفادہ کر چکے تھے، میدان میں اُتر آئے، اور اُنھوں نے ناصر الدین کی حکومت اور ایران کے غیر ملکی اقتدار کے خلاف ایک زبردست محاذ تیار کر لیا۔

ناصر الدین اس محاذ سے بھی مقابلہ کے لئے آمادہ ہو گیا۔ لیکن اس کی یہ حسرت نکلنے نہ پائی۔ ایک ایرانی نوجوان نے جان پر کھیل کر اسے قتل کر دیا۔ تحقیقات سے پتہ چلا کہ یہ جوان سید جمال الدین افغانی کے شاگردوں میں تھا۔

ناصر الدین کے بعد مظفر الدین تخت نشین ہوا۔ یہ بہت ہی کمزور آدمی تھا۔ اس کی کمزوری سے روسیوں اور انگریزوں نے بہت فائدہ اُٹھایا لیکن اس کے ساتھ قوم پرستوں کو بھی اس کے عہد میں خوب پھلنے پھولنے

کا موقع مل گیا۔ اور بالآخر ان کی قوت اتنی بڑھ گئی کہ انھوں نے حکومت سے ایک پارلیمنٹ کے قیام کا مطالبہ کر ڈالا۔ منظفر الدین نے پہلے تو اس مطالبہ کو تسلیم کرنے میں کچھ تامل کیا۔ لیکن جب عوام نے پایہ تخت چھوڑ کر دُور دراز کے شہروں میں اٹھ جانے کی دھمکی دی تو منظفر الدین نے اس مطالبہ کو منظور کر لیا چنانچہ ۵ راگست ۱۹۰۶ء کو ایرانی پارلیمنٹ کا سنگ بنیاد رکھا گیا اور ۷ر اکتوبر ۱۹۰۶ء کو اس پارلیمنٹ کا پہلا اجلاس ہوا۔ لیکن پارلیمنٹ کے قیام کے دوسرے ہی برس منظفر الدین کا انتقال ہو گیا۔ منظفر الدین کے بعد محمد علی تخت نشین ہوا۔ محمد علی بے انتہا غیور اور خود رائے بادشاہ تھا اس نے تخت نشین ہوتے ہی مجلس کو توڑ دینا چاہا اور اسکے لئے اس نے مختلف تدبیریں کیں۔ لیکن جب ان تدبیروں میں سے کامیابی نہ ہوئی تو اس نے روس سے یارانہ گانٹھا۔ اور روس کی مدد سے پارلیمنٹ کو توڑنا چاہا۔ ملک کو جب بادشاہ کے اس ارادے کا علم ہوا تو بادشاہ اور اس کے مشیروں کے خلاف عام طور پر بڑی برہمی پھیلی بادشاہ نے پایۂ تخت چھوڑ دیا، اور روس کی حفاظت میں شہر کے باہر ایک باغ میں فروکش ہو گیا۔ وہیں سے موقع دیکھ کر ایک دن روسیوں کی مدد سے طہران کا محاصرہ کر لیا۔ شہر میں بادشاہ سے مقابلہ کا بوتا نہیں تھا۔ بادشاہ کو فتح ہوئی۔ شاہی فوجیں شہر میں در آئیں۔ مجلس کی عمارت کو انھوں نے منہدم کر دیا۔ ارکانِ مجلس کو گرفتار کر کے یا تو قتل کروا دیا، یا جیل بھیج دیا۔ کاسک بریگیڈ اس وقت بادشاہ کی حمایت میں تھا۔

لیکن اس فتح کے بعد بادشاہ کو بہت دنوں چین نصیب نہ ہوا، قوم پرستوں کی فوجیں جو دُور دراز صوبوں میں قوت حاصل کرتی جا رہی تھیں بالآخر طہران کی طرف بڑھیں، اور کاسک بریگیڈ بھی جو پہلے بادشاہ کی طرف تھا قوم پرستوں سے مل گیا۔ بادشاہ کو شکست ہوئی۔ ملک کے امراء اور رؤسا نے جمع ہو کر محمد علی

کو معزول کر دیا، اور اس کے بجائے اس کے لڑکے احمد شاہ کو تخت نشین کر دیا۔
مجلس پھر سے قائم ہو گئی اور ملک میں ایک مرتبہ پھر دستوری حکومت کا سکہ چلنے لگا۔
مجلس نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ محمد علی نے ملک پر جو ناواجبی ٹیکس لگا دیئے تھے، ان کو دور کرنے کی کوشش کی اور اپنی مدد کے لئے امریکہ سے ایک ماہر فنانس کو ایران طلب کیا۔ امریکن ماہر فنانس نے ایرانیوں پر سے ٹیکس ہٹا دیئے، اور آمدنی کی کمی کو پوری کرنے کے لئے روس اور برطانیہ کی تجارت پر جو اس وقت تک آزاد تھی ٹیکس لگا دیئے۔ روس اور برطانیہ ان تجارتی ٹیکسوں کو گوارا نہ کر سکے۔ انھوں نے ایسی تدبیریں اختیار کرنی شروع کیں کہ امریکن ماہر ایران سے نکال دیا جائے، اور مجلس میں روس اور برطانیہ کے ہوا خواہوں کی اکثریت ہو جائے تاکہ بیرونی تجارت پر ایران کی طرف سے جو ٹیکس لگا دیئے گئے تھے۔ وہ واپس لے لئے جائیں۔ روس اور برطانیہ کو اپنی ان چالوں میں کامیابی ہوئی۔ .... امریکن ماہر ایران سے نکال دیا گیا اور مجلس نے تجارتی ٹیکس بھی منسوخ کر دیئے۔ ملک میں پھر وہی بدنظمی اور بدظنی کا دور دورہ ہو گیا۔ یہ حالات تھے، جن میں رضا خاں اسٹیج پر نمودار ہوا۔

ملک کی بدنظمی کا اثر کاسک بریگیڈ پر بھی پڑا۔ مسعود خاں اس فوج کا کمانڈر تھا۔ اس نے حکومت سے سرتابی کی۔ فوج میں بدامنی کا اندیشہ پیدا ہو گیا۔ حکومت نے مسعود خاں کو معزول کر کے رضا خاں کو کاسک بریگیڈ کا کمانڈر مقرر کر دیا۔ اور رضا خاں نے فوجی بے چینی کا بڑھنے سے پہلے ہی خاتمہ کر دیا۔

لیکن خود رضا خاں مجلس سے مطمئن نہیں تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ مجلس میں

اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جنھیں اپنے ملکی مفاد سے زیادہ غیر ملکی اقتدار کو اپنے سے راضی رکھنے کا خیال ہے۔ اس زمانہ میں روس میں انقلاب ہو گیا تھا اس لئے ایران سے روس کی دلچسپی کم ہو گئی تھی۔ لیکن برطانوی اقتدار ملک کے ہر شعبے میں بڑھ گیا تھا۔ ہر قسم کی تجارتی مراعات بھی اس کو حاصل تھیں اور تجارتی کوٹھیوں کی حفاظت کے نام سے برطانیہ کی ایک چھوٹی سی فوج بھی ایران میں موجود تھی۔ رضا خاں کو ایران میں برطانیہ کا یہ بڑھتا ہوا اقتدار ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ لیکن حالات سے مجبور تھا۔ اسے وقت کا انتظار تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اسے موقع ملے اور وہ ایک ہی ضرب میں مجلس کی بے عنوانیوں کو بھی دور کر دے اور غیر ملکی اقتدار کو بھی ایران میں ختم کر ڈالے۔ اتفاق سے یہ موقع جلد ہی مل گیا۔ اس زمانہ میں مجلس نے ایران کے تیل کے چشموں کا اجارہ بہت ہی معمولی شرائط پر ایک برطانوی کمپنی کو دے دیا۔ مجلس کی اس حرکت سے ایران کے تعلیم یافتہ افراد میں بڑی برہمی پھیل گئی، اور اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان ایرانیوں نے جن میں فوجی افسر بھی شامل تھے، مجلس سے مقابلہ کے لئے ایک سیاسی جماعت بنائی۔ اس جماعت کا لیڈر سید ضیاء الدین تھا اور رضا خاں بھی اس جماعت میں شریک تھا۔ سید ضیاء الدین یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح سپہدار اعظم کی حکومت کو توڑ ڈالے کہ یہی حکومت ایران میں غیر ملکی اقتدار کو تقویت دینے کا باعث ہو رہی تھی، چنانچہ اپنی تیاریاں مکمل کر کے اس جماعت نے ۲۰-۲۱ فروری ۱۹۲۱ء کی رات کو حکومت کے دفاتر پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور اس فیصلہ کی تعمیل پر رضا خاں کو مامور کیا۔ رضا خاں نے جماعت کے اس فیصلہ کو بلا حیل و حجت تسلیم کر لیا۔ اور وقت مقررہ پر ڈھائی ہزار کاسک سواروں کے ساتھ قزدین کے راستہ طہران میں داخل ہوا اور صبح ہوتے سے

پہلے پہلے اس نے حکومت کے جملہ دفاتر پر قبضہ کرلیا۔
یہ سب کارروائی اس قدر سکون اور خاموشی سے عمل میں آئی کہ صبح نو بجے تک حکومت کے ذمہ دار افسروں کو یہ پتہ بھی نہیں چلا کہ ایران میں کوئی انقلاب ہوگیا ہے۔
دفاتر پر قبضہ کرنے کے بعد سپہدار اعظم کی حکومت مستعفی ہوگئی۔ سید ضیاء الدین نے وزارت ترتیب دی اور رضا خاں افواج ایران کا کمانڈر انچیف یا سردار سپاہ مقرر ہوا۔

سید ضیاء الدین نے رضا خاں کو اپنی حکومت کا آلہ بنانا چاہا تھا لیکن سردار سپاہ کے جلیل القدر عہدے پر پہونچکر رضا خاں کو اپنی طاقت کا اندازہ ہوچکا تھا، اور اب وہ ضیاء الدین سے اس بات کا متمنی تھا کہ حکومت کے تمام امور اس کے مشورہ سے طے پائیں۔
رضا خاں نے سردار سپاہ ہوتے ہی فوج کی تعداد بڑھائی اور جدید فوجی اصولوں پر انھیں مسلح و منظم کرنے کے لئے حکومت سے روپیہ طلب کیا۔ ضیاء الدین کی حکومت رضا خاں کا یہ مطالبہ فی الفور منظور نہیں کرسکتی تھی اس لئے کہ اس کے خزانے خالی تھے، اور ایران کے امراء اور رؤسا نے برسوں سے حکومت کے مقرر کردہ ٹیکس ادا نہیں کئے تھے، سردار سپاہ نے امرائے ایران سے ٹیکس وصول کرنے کی خود ذمہ داری لی، اور چھوٹتے ہی چند امرائے ایران کو جن میں شہزادہ فیروز اینگلو پرشین کمپنی کے رکن اور ان کے والد بھی شامل تھے گرفتار کر لیا۔ ان کے بعد ایران کے معززین کی باری آئی جنھوں نے حکومت کو فوراً ٹیکس ادا کردیا، وہ چھوڑ دیئے گئے۔ جنھوں نے

جیل بجت کی وہ جیل بھیج دیئے گئے اور ان کی جائدادیں ضبط کر لی گئیں۔
سردار سپاہ کی اس کارروائی سے امراء اور معززین ایران کے ہوش اڑ گئے۔ جس پر حکومت کا جو ٹیکس باقی تھا وہ اس نے بلا جیل و حجت حکومت کے خزانہ میں داخل کر کے اپنی گلو خلاصی کر لی۔ حکومت کا خزانہ معمور ہو گیا۔ فوجی مصارف اور رفاہِ عام کے کاموں کے لئے ایرانی حکومت کو روپے کی کمی نہیں رہی۔

ٹیکسوں کے مسئلے کو سلجھا کر سردار سپاہ نے دفاتر حکومت کی اصلاح کی طرف قدم اٹھایا۔ حکومت کے دفاتر میں رشوت عام تھی اور علانیہ لی جاتی تھی۔ سرکاری رقموں میں غبن تھا نظم و نسق میں ابتری تھی۔ سردار سپاہ نے ایک ایک کر کے راشی افسروں کو جیل بھیجنا شروع کر دیا اور جن پر غبن ثابت ہوا ان کے لئے لمبی لمبی سزائیں تجویز کیں۔ اسی لپیٹ میں شاہ ایران کے چند قریبی رشتہ دار بھی آ گئے رضا خاں نے انھیں بھی نہ بخشا اور بغیر کسی لحاظ کے انھیں جیل بھیج دیا۔ احمد شاہ رضا خاں کی اس حرکت سے بہت ناراض ہوا، اور خود سید ضیاء الدین بھی جو رضا خاں کے عروج کا بانی ہوا تھا اس کی ان مطلق العنانیوں سے پریشان رہنے لگا۔ ضیاء الدین وزیر اعظم تھا اور چاہتا تھا کہ حکومت کے سارے کام صرف اسی کے حکم سے ہوا کریں، لیکن اب اسے معلوم ہوا کہ رضا خاں بھی اس حکومت میں شریک ہے، اور جب تک یہ برسر اقتدار ہے ضیاء الدین اپنا اثر حکومت پر نہیں ڈال سکتا۔ رضا خاں اور ضیاء الدین میں یہ بدمزگی کی ابتدا ہو گئی جو رفتہ رفتہ اتنی بڑھی کہ دونوں میں سے ایک کا مستعفی ہونا ضروری ہو گیا۔

رضا خاں بہت طاقتور تھا اتنے ہی دنوں میں اس نے ملک اور فوج میں اپنا بڑا اثر پیدا کر لیا تھا۔ امراء اور رؤساء کی ایک جماعت بھی اس کے زیر اثر

تھی۔ چنانچہ اس لڑائی میں اس نے ان سب اثرات سے کام لیا۔ اور ضیاء الدین کو مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا۔

۳۔ اپریل ۱۹۲۱ء کو ضیاء الدین مستعفی ہو گیا۔ اسی دن رضا خاں نے قوام السلطنت کو وزیر اعظم بنا دیا، اور ایک نئی کابینہ ترتیب دے کر خود وزیر جنگ بن گیا۔ وزیر جنگ کی حیثیت سے رضا خاں نے ملک کے باغی قبائل کی گوشمالی اور خود سر صوبجات کو زیر کرنے میں بڑی قابلیت دکھائی۔ اب اس کے زیر نگیں چالیس ہزار آلات جدید سے مسلح فوج تھی۔ جو سرحد کے باغی قبائل کی ہلکی سے ہلکی سرتابی اور نافرمانی پر بے تکلف حرکت میں آجایا کرتی تھی۔

اندرون ملک میں اپنا اثر و اقتدار بڑھانے کے ساتھ ساتھ رضا خاں نے طہران کے محکموں میں رسوخ حاصل کیا اور حکومت کے ہر شعبے کی نگرانی اور انتظام کو رفتہ رفتہ اپنے ہاتھ میں لیتا گیا۔ تا آنکہ ۱۹۲۲ء کے آخر میں اسے کسی دوسرے کی وساطت سے حکومت کرنا بے معنی معلوم ہونے لگا۔ چنانچہ قوام السلطنت کو بھی اس نے مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا، اور خود ہی وزیر اعظم ایران کی حیثیت سے اپنی جدید کابینہ بنالی۔ اب رضا خاں ایران کا وزیر اعظم تھا۔ وزیر جنگ تھا، اور سردار سپاہ تھا بلکہ صحیح معنوں میں وہ ایران کا مختار مطلق تھا اس لئے کہ ان شعبوں کے علاوہ جو برائے نام اس کے ماتحت تھے وہ ایران کے ہر شعبہ میں دخل رکھتا تھا، اور ہر معاملہ میں صرف اسی کا حکم ناطق سمجھا جاتا تھا۔

رضا خاں کی ان سرگرمیوں کے تذکرہ میں یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ کسی نوبت پر بھی رضا خاں کے ساتھ شاہ ایران کا ذکر نہیں آتا۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ احمد شاہ کو اس وقت سے جب سے کہ رضا خاں سردار سپاہ کی

حیثیت سے ملکی معاملات میں دخیل ہوا ہے، حکومت سے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی تھی۔ کیونکہ اس زمانہ میں احمد شاہ حکومت کا انتظام وزیر اعظم اور مجلس کے سپرد کر کے سیر و تفریح کی غرض سے یورپ چلا گیا اور ایسا گیا کہ طہران کے بجائے پیرس ہی میں اس نے اپنی مستقل عشرت گاہ بنالی۔ اگرچہ وہ ہر برس دو برس بعد ایران بھی کچھ دنوں کے لئے آجایا کرتا تھا۔ لیکن ایران کے نظم و نسق سے مطلق سروکار نہ رکھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ایرانی احمد شاہ کو بھولتے اور رضا خاں کی شخصیت سے مانوس ہوتے جا رہے تھے۔

جب رضا خاں وزیر اعظم بن گیا تو احمد شاہ بھی پیرس سے طہران آیا۔ لیکن صرف چند دنوں کے لئے۔ ایک سرسری نظر اس نے حکومت کے انتظامات پر ڈالی اور پیرس واپس چلا گیا، اور اس دفعہ ایسا گیا کہ پھر اس کو ایران آنا نصیب نہ ہوا قلمدان وزارت سنبھالنے کے بعد رضا خان نے ملک کے نظم و نسق میں اصلاح کی طرف توجہ کی اور اس معاملہ میں امریکن وفد مالیات نے جو رضا خان کی درخواست پر واشنگٹن سے طہران آیا تھا۔ رضا خاں کی بہت مدد کی۔

ادھر تو رضا خان حکومت کے نظم و نسق کی درستی میں مصروف اُدھر شیخ محمرہ نے جس نے انگریزوں کی حمایت میں ایران کے جنوب مغربی ساحل پر اپنی ایک آزاد حکومت قائم کر لی تھی۔ بختیاری اور کاشغائی قبائل کو ابھار کر رضا خاں کے خلاف بغاوت کرادی، اور یہ فتنہ دیکھتے ہی دیکھتے اتنا بڑھا کہ سارا جنوبی ایران اس سے متاثر نظر آنے لگا۔

اس موقع پر ایران میں عام خیال یہ تھا کہ شیخ محمرہ نے برطانیہ کے اشارے سے حکومت ایران کے خلاف بغاوت کرائی ہے۔ اب اگر اس بغاوت کو فوجی کارروائی سے فرو کیا گیا تو برطانیہ اس میں ضرور مداخلت کرے گا۔ لیکن رضا خاں

نے ان اندیشوں کی مطلق پرواہ نہیں کی۔
شیخ محمرہ نے ایران سے بغاوت کی اور دوسرے قبائل کو بغاوت پر ابھارا۔ رضا خاں کے نزدیک شیخ کو قصوروار ٹھیرانے کے لئے یہ الزام کافی تھا اسی کو وجہ بنا کر اس نے شیخ کی گوشمالی کے لئے ایرانی فوجیں بھیجدیں۔ ایرانی فوجوں نے بختیاروں کو گھیر لیا۔ اور شیخ کے کیمپ پر حملہ کر دیا۔ بختیاروں نے فوراً ہتھیار ڈال دیئے اور شیخ محمرہ نے بھی رضا خاں کے آگے سر اطاعت خم کر دیا اور تار کے ذریعہ رضا خاں سے عفو کا طالب ہوا۔ لیکن رضا خاں نے شیخ محمرہ کو معاف کرنے سے انکار کر دیا اور اپنی فوج کے نام حکم بھیجا کہ اس کو زیر حراست رکھے۔ اور خود شیراز سے بوشہر آیا اور بوشہر سے محمرہ پہونچا۔ یہاں کے خوفزدہ لوگوں نے بڑے تپاک سے اس کا خیر مقدم کیا، اور شیخ نے غیر مشروط طریقے پر رضا خاں کی اطاعت کا عہد کیا اور محمرہ کا سارا علاقہ رضا خاں کی نذر کر دیا۔ رضا خاں کو اس علاقہ کی سخت ضرورت تھی۔ اس لئے کہ اس علاقہ میں ٹیکسوں کی آمدنی کا اندازہ جو امریکہ کے وفد مالیات نے لگایا تھا۔ وہ ایک کروڑ کے قریب تھا اور یہ ایسی خطیر رقم تھی کہ رضا خاں اس کو ہاتھ سے دینا نہ چاہتا تھا۔ چنانچہ اس رقم کی ادائیگی کا شیخ سے عہد نامہ لکھوایا اور محمرہ کو ایران کی نگرانی میں دے کر اور شیخ کو ساتھ لے کر رضا خاں طہران واپس ہوا۔
محمرہ کی تسخیر نے رضا خاں کی شہرت اور ہر دل عزیزی میں چار چاند لگا دیئے اور سارا ایران اس کی ثنا و صفت میں یکزباں نظر آنے لگا۔
جنوری ۱۹۲۵ء میں رضا خاں محمرہ کی تسخیر کے بعد طہران واپس آیا۔ اس موقع پر طہران نے اس قدر جوش و خروش اور ایسے تزک و احتشام سے اس کا

استقبال کیا جس طرح ایک زبردست فاتح کا کیا جاتا ہے۔
رضا خاں کے اس کارنامہ کے بعد ہی سے علانیہ احمد شاہ کی معزولی کا ملک میں چرچا ہونے لگا اور یہ بحث چھڑ گئی کہ احمد شاہ کا جانشین کس کو بنایا جائے۔ اگرچہ احمد شاہ کا قانونی جانشین اس وقت طہران میں موجود تھا۔ لیکن ایرانی احمد شاہ کی عیش پرستیوں اور بے پروائیوں سے اس قدر دل برداشتہ ہو رہے تھے کہ اب وہ خاندان قاچار کے کسی فرد کو تخت نشین نہیں کرنا چاہتے تھے، اور رضا خاں کو اپنا بادشاہ بنانے پر تلے ہوئے تھے۔ لیکن با اثر مذہبی مجتہد اس کے خلاف تھے، ان کی دلیل تھی کہ شاہ ایران شاہوں کا شاہ ظل اللہ اور خلیفۃ اللہ ہے، اس لئے یہ منصب آسانی سے دوسرے خاندان میں منتقل نہیں کیا جا سکتا۔ ان مجتہدین کے جواب میں کچھ مجتہد ایسے بھی پیدا ہوئے جنہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ نا اہل اور نالائق بادشاہ کو معزول کر کے جمہوریت قائم کر دینا بہتر ہے تاکہ ملک تباہی اور بربادی سے بچ جائے۔
طرفین سے ایک مدت تک یہ دلیل آرائیاں جاری رہیں اور یہ محسوس ہونے لگا کہ ملک عام طور پر آہستہ آہستہ رضا شاہ کی طرف کھنچتا جا رہا ہے۔ آخر کار ۳۱۔ اکتوبر ۱۹۲۵ء کو ایرانی پارلیمنٹ میں احمد شاہ کی معزولی کا مسئلہ پیش ہوا۔ اور مجلس نے اس کی عشرت پسندی اور نا اہلی کو وجہ بنا کر اس کو شاہی سے معزول کر دیا۔ لیکن اس کی جگہ پھر بھی بادشاہ کسی کو منتخب نہیں کیا اور نہ جمہوریت کا اعلان ہوا بلکہ حکومت عارضی طور پر رضا خاں کے سپرد کر دی۔ اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ طرز حکومت کا انتخاب رائے عامہ پر کیا جائے گا۔
رضا خاں نے مجلس کے اس فیصلہ کے بعد شہزادہ ولی عہد اور ان کے خاندان کو طہران سے باہر نکال دیا، اور ایک مجلس انتخاب منعقد کر کے یہ

مسئلہ اس کے سپرد کر دیا۔ اس مجلس نے کئی دن کے غور و خوض کے بعد ۱۲ دسمبر
۱۹۲۵ء کو قیام جمہوریت کے خلاف فیصلہ دیا اور یہ اعلان کیا کہ رضا خاں
کو ان کی فوجی خدمات کے صلے میں ملک نے اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا۔ جس وقت
مجلس انتخاب نے یہ اعلان کیا اس وقت غریب احمد شاہ پیرس کے امریکن
ہسپتال میں صاحب فراش پڑا اپنی غیر معتدل عیاشی کی بدولت موت
کی گھڑیاں گن رہا تھا۔

رضا خاں کے بادشاہ منتخب ہونے کے بعد ۲۶۔ اپریل ۱۹۲۶ء کو
جشن تاجپوشی منایا گیا، اور رضا خاں نے نہایت تزک و احتشام کے ساتھ
"رضا شاہ پہلوی" کے نام سے تخت نادری پر جلوس فرمایا۔

شہنشاہ ہوتے ہی رضا شاہ نے پھر ایک مرتبہ کابینہ وزارت کو تبدیل
کر دیا، اور متوفی الممالک کی وزارت میں نئی کابینہ مرتب کرنے کا حکم دیا
اس کے بعد رضا شاہ نے ملک کی اصلاح کی طرف توجہ کی۔ ایران کے
دُور دراز صوبوں میں ڈاکوؤں کا زور تھا۔ شاہ نے ان کے استیصال پر پوری
توجہ دی اور تھوڑے ہی دنوں میں ان کا بالکل ہی قلع قمع کر ڈالا۔
ایران میں سڑکیں اور ریلیں نہیں تھیں جس کے باعث رسل و رسائل
میں دقتیں ہوا کرتی تھیں۔ شاہ نے ریلوں اور سڑکوں کی ایک زبردست
اسکیم تیار کی، اور روسی انجینیروں کی نگرانی میں ان کی تیاری شروع کر دی۔
فوج پر نئے سرے سے توجہ دی۔ فوجی اسکول قائم کیا۔ آلات جدیدہ سے
فوجوں کو مسلح کیا۔ فضائی بیڑہ بھی تیار کرنا شروع کر دیا اور بحری جہازوں
کی خریداری کی طرف توجہ کی۔ ملک کے نظم و نسق کو نئے سرے سے

درست کیا۔ راشی اور نکمے اہلکاران کو سرکاری محکموں سے نکال باہر کیا اور محنتی اور قابل افراد کو بلا کسی امتیاز کے ترقیاں دیں۔ ٹیکسوں کو کم کیا اور غیر ملکی مصنوعات کی درآمد پر ٹیکس بڑھا کر ملک کی آمدنی کو پورا کیا۔

ایران کے تجارتی تعلقات شمال میں روس اور جنوب میں برطانیہ کے ساتھ ہیں، اور رضا شاہ ان دونوں حکومتوں سے خوش گوار تعلقات رکھتے تھے۔ لیکن ایران پر ان میں سے کسی کا اقتدار تسلیم کرنے کے روادار نہیں تھے۔ عام خیال یہ تھا کہ رضا شاہ پر برطانیہ کا اثر ہے اور وہ کسی نوبت پر بھی اس کی مخالفت نہ کریں گے۔ لیکن یہ خیال برطانوی تیل کا ٹھیکہ منسوخ اور انگریزی فوجوں کو ایرانی بندرگاہوں سے نکال دینے کے بعد جاتا رہا۔

ایران کے تیل کا اجارہ سب سے پہلے ایک آسٹریلین تاجر ولیم ناکس نے سن ۱۹۰۱ء میں حکومت ایران سے صرف چار ہزار پونڈ کے معاوضہ میں ساٹھ سال کی مدت کے لئے حاصل کیا تھا۔ اس کے بعد برما آئل کمپنی نے یہ اجارہ ولیم ناکس سے خرید لیا اور اس کے انتظام کے لئے اینگلو پرشین آئل کمپنی بنائی جس میں کچھ ایرانی بھی شریک تھے۔ لیکن زیادہ حصہ انگریز سرمایہ داروں کا تھا۔ اس کمپنی نے اپنے خالص منافع کا سولہواں حصہ حکومت ایران کو دینا منظور کیا بعد میں یہ اجارہ اینگلو پرشین کمپنی سے انہی شرائط پر حکومت برطانیہ نے خرید لیا تاکہ حکومت برطانیہ کے بحری بیڑے کے لئے تیل کی فراہمی میں آسانی رہے سنہ ۱۹۳۲ء تک کام ٹھیک اور طے شدہ شرائط کے ماتحت چلتا رہا۔ لیکن ۲۷۔ نومبر ۱۹۳۲ء کو رضا شاہ نے بغیر کسی نوٹس کے یکایک برطانیہ کے اس اجارہ کو منسوخ کر دیا۔ اس وقت صورت حال یہ تھی کہ پچھلے تیس برس میں کمپنی اور حکومت برطانیہ ایک کروڑ دس لاکھ پونڈ کی رقم تو حکومت ایران

کو رائلٹی کی صورت میں ادا کر چکی تھی اور تقریباً بائیس کروڑ پونڈ کا سرمایہ اس نے ایران کے حدود میں لگا دیا تھا۔ اتنی بڑی رقم حکومت برطانیہ آسانی سے نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ اس نے شاہ کے اس فیصلہ کے خلاف احتجاج کیا۔ اخباروں میں سخت پروپیگنڈا کیا۔ سیاسی تعلقات توڑ دینے کی دھمکی دی اور بالآخر مجبور ہو کر یہ قضیہ لیگ اقوام میں پیش کر دیا۔ رضا شاہ برطانیہ کی کسی چال سے نہ دبا۔ لیگ اقوام میں حکومت برطانیہ نے ایران کی جو شکایت پیش کی تھی اس کے جواب میں رضا شاہ نے اپنی طرف سے برطانیہ پر الزامات کی ایک لمبی فہرست پیش کر ڈالی۔ اس میں رضا شاہ نے یہ ثابت کیا کہ یہ اجارہ کمپنی نے دباؤ سے حاصل کیا تھا۔ رائلٹی جو حکومت ایران کو دی جا رہی ہے اس کا حساب مشتبہ ہے۔ کمپنی ایران کی سرحد میں لاکھوں پونڈ سالانہ کماتی ہے۔ لیکن حکومت ایران کو انکم ٹیکس نہیں دیتی اور یہ کہ خود ایران میں تیل کے دام بہت زیادہ کر رکھے ہیں۔ حکومت برطانیہ نے ان الزامات کی تردید کی لیکن لیگ کو مطمئن نہ کر سکی۔ چھ مہینے کی لگاتار کوششوں کے بعد آخر کو تھک کر حکومت برطانیہ نے پھر رضا شاہ کی طرف اس مسئلہ کو رجوع کیا اور ۲۵۔ اپریل سنہ ۱۹۳۳ء کو رضا شاہ کی حکومت اور حکومت برطانیہ کے درمیان یہ طے پایا کہ خالص منافع سے حکومت ایران کو رائلٹی دینے کے بجائے فی ٹن تیل پر رائلٹی دی جائے اس شرط کے ماتحت کہ رائلٹی کی رقم ساڑھے سات لاکھ سے کسی طرح کم نہ ہونے پائے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی طے ہوا کہ ہر سال کمپنی کے حصہ داروں کو منافع کی تقسیم کے بعد جو رقم بچے اس میں سے بیس فیصدی رقم حکومت برطانیہ کو اور دی جائے اور ساٹھ برس بعد جب کمپنی کا اجارہ ختم ہو تو کمپنی کا سارا اسٹاک اور ساری جائداد حکومت ایران کی ملکیت قرار پائے۔

حکومت برطانیہ کے ساتھ اس نئے معاہدے کے بعد حکومت ایران کی

آمدنی میں زبردست اضافہ ہوگیا۔ مثلاً ۱۹۳۱ء میں ایران کو کمپنی نے تین لاکھ پونڈ بطور رائلٹی دیئے تھے۔ لیکن نئے معاہدے کے بعد ۱۹۳۷ء میں یہ رقم بڑھ کر بیس لاکھ پونڈ ہوگئی

برطانیہ پر رضا شاہ کی یہ اتنی زبردست فتح تھی کہ اس سے نہ صرف ایران کی مالی حالت سدھر گئی بلکہ یورپ اور ایشیا میں "ایران جدید" ایک طاقت تسلیم کی جانے لگی۔

بادشاہ ہونے کے بعد رضا شاہ کا دوسرا زبردست کارنامہ ایک ہزار میل لمبی ریلوے کی تعمیر ہے۔ ایران میں اس سے پہلے ریلیں نہیں تھیں۔ رسل و رسائل میں بڑی دشواریاں ہوتی تھیں۔ شاہ نے ان دشواریوں کو دور کرنے کیلئے جب ریلوے لائن تعمیر کرنے کا ارادہ کیا تو روسیوں نے شاہ پر زور دیا کہ بحیرۂ قزوین سے طہران تک ریلوے تعمیر کی جائے اور برطانیہ نے شاہ پر اثر ڈالا کہ بغداد سے ہندوستان کی سرحد تک ریلوے بنائی جائے۔ لیکن شاہ نے ان دونوں غرض مند مشیروں کو ٹال دیا اور ایک ایسی ریلوے لائن کا نقشہ بنوایا جو بالکل ایرانی ہو اور شمال مشرق سے جنوب مغرب کے ایرانی بندرگاہ شاہ پور پر ختم ہو جائے۔ اس راستے میں دو زبردست پہاڑ بھی آتے ہیں۔ جن میں ایک کا رقبہ ایک سو بیس میل اور دوسرے کا ساٹھ میل ہے۔ ان پہاڑوں کو تراش کر اور ان میں سرنگیں تعمیر کر کے ریلوے لائن ڈالی جائے گی۔

اس ریلوے کی تعمیر پر تین کروڑ پونڈ خرچ کا اندازہ ہے۔ یہ سارا روپیہ ایران نے خود ادا کیا۔ کسی غیر ملک سے اس سلسلہ میں اس نے کوئی قرض

نہیں لیا۔ اس ریلوے کا ایک حصہ ۱۹۳۷ء میں مکمل ہو چکا اور دوسرا حصہ ۱۹۴۰ء کے آخر میں تکمیل کو پہونچ گیا ہے۔ اس کی تکمیل کے بعد اندازہ یہ ہے کہ ایران کی تجارت دس گنا زیادہ ہو جائے گی اور اسی کے ساتھ ملک کی آمدنی بھی کئی گنا بڑھ جائیگی۔

اس ریلوے کا ٹھیکہ شاہ نے پہلے ایک امریکن کمپنی کو دیا تھا اس کے بعد ۱۹۳۳ء میں ایک ڈچ اور سوکس کمپنی کو دیا گیا۔ وہی کمپنی اس وقت ریلوے کی تکمیل کا کام کر رہی ہے۔

ریلوے کے علاوہ شاہ نے ملک میں صنعتی ادارے قائم کرنے میں بھی پوری پوری دلچسپی لی۔ ایران کے مختلف بڑے بڑے شہروں میں اس وقت کپڑا بننے کی سات مشینیں کام کر رہی ہیں۔ اگرچہ ان مشینوں کے بنے ہوئے کپڑوں میں وہ صفائی نہیں پائی جاتی جو لنکاشائر کے کپڑوں میں ہوتی ہے۔ لیکن ملک کی دیہاتی آبادی کی ضرورت کو یہ مشینیں بڑی خوبی سے پورا کر رہی ہیں۔

کپڑا بننے کی مشینوں کے ساتھ شکر بنانے کی آٹھ فیکٹریاں بھی مختلف شہروں میں قائم ہوئیں اور ملک کی ضرورت کے مطابق مال تیار کر رہی ہیں۔ ایک سمینٹ فیکٹری بھی طہران میں کام کر رہی ہے اور دوسری فیکٹری زیستان میں تیار ہو رہی ہے۔

ملک کی ان مصنوعات کے ساتھ ساتھ کثرت سے چھوٹی چھوٹی صنعتیں بھی بازار میں نظر آنے لگی ہیں خصوصاً خوشبودار صابون سازی کی صنعت کو ایران میں اس قدر کامیابی ہوئی ہے کہ ایرانی صابون کے مقابلہ میں اب باہر کے صابن کی مانگ باقی نہیں رہی۔

معاشی اصلاحات کے دوش بدوش رضا شاہ نے ایران میں سماجی اصلاحات بھی نافذ کیں اور یہ اصلاحات اس نوعیت کی تھیں کہ دیکھتے ہی دیکھتے ایران بالکل منقلب ہو کر رہ گیا۔

رضا شاہ کے متعلق عام طور پر یہ مشہور ہے کہ وہ اَن پڑھ جاہل ہیں۔ یہ روایت صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ رضا شاہ کا بیشک کسی مدرسہ یا یونیورسٹی میں باقاعدہ تعلیم حاصل کرنا ثابت نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود قرائن اس خیال کی تردید کرتے ہیں کہ وہ ابتک لکھنے پڑھنے سے عاری محض ہے۔ اگر ابتدائی عمر میں رضا شاہ نے تعلیم کی طرف توجہ نہیں دی تو اس سے یقیناً یہ لازم نہیں آتا کہ بعد میں بھی بطور خود اُنھوں نے علم حاصل کرنے کی کوشش نہ کی ہو۔

ایک بے لکھا پڑھا شخص سلطنت کے ذمہ دار عہدوں پر کام نہیں کر سکتا۔ اور نہ کامیابی کے ساتھ امورِ سلطنت انجام دے سکتا ہے، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کسی جاہل محض سے وہ روشن خیالی ظاہر نہیں ہو سکتی۔ جو ملک کی معاشی اور معاشرتی اصلاح کے سلسلہ میں رضا شاہ سے ظاہر ہوئی۔ رضا شاہ نے اپنے ملک کی سماجی اصلاح میں کمال اتاترک کو سامنے رکھا ہے، اور وُہی پروگرام ایک ذرا سے تغیر کے ساتھ قبول کر لیا ہے جو اتاترک نے ترکی میں نافذ کیا تھا۔

ترکی کے اصلاحی پروگرام کو ایران میں نافذ کر دینا رضا شاہ کی ایک ایسی حیرت انگیز جسارت ہے جس کا فی الحقیقت کوئی جواب نہیں ہو سکتا اور یہ جسارت بھی ایسے وقت میں رضا شاہ نے دکھائی جب ایران کی ہمسایہ سلطنت افغانستان میں اسی وضع کی اصلاحات قطعاً ناکام رہی تھیں، اور امان اللہ خاں کو اپنی اصلاحات کی بدولت اپنا موروثی تخت چھوڑ دینا پڑا تھا۔

ایران، ترکی اور افغانستان سے بالکل مختلف ملک ہے۔ ترکی پر مدت

سے مغربی اثر تھا۔ اس میں اگر کچھ مشرقیت پائی بھی جاتی تھی تو محض اس لئے کہ اسلام کے مقامات مقدسہ سے اسے واسطہ تھا اور خلیفۃ المسلمین کے زیر نگیں سمجھا جاتا تھا لیکن جب مقاماتِ مقدسہ سے اس کا تعلق منقطع ہو چکا اور خلیفۃ المسلمین کا جُوا بھی ترکی نے اپنے کندھوں سے اُتار پھینکا۔ تو ظاہر ہے کہ رہا سہا مشرقی دباؤ بھی ترکی پر سے جاتا رہا، اور روایاتِ اسلامی کے تحفظ کی ذمہ داری سے اسے برأت مل گئی۔ اس طرح مشرقی اثرات سے آزاد ہو کر محض سیاسی اور جغرافیائی مصالح کی بنا پر ترکی نے جس قسم کی انقلابی اصلاحات چاہیں۔ قبول کر لیں کسی کو اس پر اعتراض کا حق باقی نہ رہا۔

لیکن ایران میں یہ صورت نہیں ہے۔ ایران قدیم مشرقی تہذیب کا گہوارہ ہے، اور اسلامی مقامات مقدسہ کا مرکز ہے۔ قدیم ترین مشرقی خصوصیات اس کی میراث ہیں، اور صدیوں سے مشرق اور صرف مشرق سے اس کا واسطہ چلا آرہا ہے۔ ایسے ملک سے جسے اپنے کلچر سے اس قدر گہرا تعلق ہی نہیں بلکہ تعصب ہو اس کا پُر عظمت ماضی اس سے جدا کر دینا اور قدیم مشرقی روایات سے یک لخت اس کا رشتہ توڑ دینا یقیناً آسان نہیں۔ لیکن رضا شاہ نے اس مشکل کو بھی آسان کر دکھایا، اور ایسی حالت میں کہ اس کا ملک افغانستان جو ترکی اور ایران کے مقابلے میں قدیم مشرقی روایات کا مورث نہیں قرار پا سکتا اور نہ اپنی کلچرل خصوصیات میں ان کا ہم پلہ کہا جا سکتا ہے اس معاملہ میں قطعاً ناکام رہا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اصلاحات کے معاملہ میں رضا شاہ نے امان اللہ کی ناکامی سے سبق لیا اور ترکی کی کامیابی کو پیشِ نظر رکھا ہے سماجی اصلاحات صحیح معنوں میں اس وقت ایران میں شروع ہوئیں جب امان اللہ خاں افغانستان

میں انہی اصلاحات کی بھینٹ چڑھ چکا تھا۔ ایران انقلابی اصلاحات میں زور اس وقت پیدا ہوا جب رضا شاہ ۱۹۳۴ء میں کمال اتاترک سے ملاقات کر کے ایران واپس ہوئے ہیں۔

ایران میں شاہ نے سماجی اصلاحات کی ابتدا تعلیم گاہوں کی توسیع سے کی۔ گاؤں گاؤں قریہ قریہ شاہ نے نئے نصاب کے ساتھ ابتدائی مدارس قائم کئے اور انہی مدارس میں تعلیم بالغان کا بھی انتظام کیا۔

اس کے بعد رضا شاہ نے ایران کا دیوانی اور فوجداری قانون بدل ڈالا۔ اور مغربی ممالک میں جو قوانین رائج ہیں۔ ان میں اپنی ضروریات کے مطابق اصلاح کر کے ملک میں نافذ کر دیا۔

ملک کے قدامت پسند اور مذہبی طبقہ کی طرف سے اس اصلاح کی شدید مخالفت ہوئی۔ اس لئے کہ ایران کے قدیم قوانین کی بنیاد فقہ اسلامی پر تھی اور ان جدید قوانین میں ان کا لحاظ نہیں رکھا گیا تھا۔ رضا شاہ افغانستان میں امان اللہ خان کا حشر دیکھ چکا تھا۔ اس نے قدامت پسند طبقے کے دبانے میں مطلق ڈھیل نہیں دی اور اس فتنہ کو ابھرنے سے پہلے ہی کچل کر رکھ دیا۔

اس کے کچھ دنوں بعد شاہ نے قدیم ایرانی خطابات اور جاگیروں کی ضبطی کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان نے امرائے ایران کو بدحواس کر دیا۔ لیکن اب اس طبقے کی بدحواسی محض بے اثر تھی۔ پڑھے لکھے عوام اب رضا شاہ کے ساتھ تھے اور ایران میں ایک جماعت ایسی تیار ہو گئی تھی جو رضا شاہ کے اصلاحی پروگرام کو ملک میں مقبول بنانے میں پوری سرگرمی دکھا رہی تھی۔

خطابات اور جاگیروں کی ضبطی کے بعد ایران کے قومی لباس کا نمبر آیا۔ ایران کا پڑھا لکھا طبقہ دوسرے ممالک کی طرح مدت سے مغربی لباس اختیار کر چکا تھا لیکن

عوام کو ابھی تک اپنے قدیم لباس سے گہری دلچسپی تھی۔ رضا شاہ نے پہلے اس کی تبدیلی کا اختیار خود عوام کو دیا اور اپنے متوسلین کے ذریعہ انگریزی لباس اور ایک خاص چھجہ دار ٹوپی کا جسے پہلوی کیپ کہا جاتا ہے۔ ملک میں جگہ جگہ مظاہرہ کیا اور جب لوگ اس سے اچھی طرح مانوس ہو گئے۔ تو شاہ نے ایک قانون کے ذریعے ہر قسم کی قدیم ٹوپیوں کا استعمال ممنوع قرار دیا اور ان سب کی بجائے پہلوی کیپ پہننے کا حکم دیا۔ اس حکم کی مذہبی طبقے کی طرف سے پھر مخالفت ہوئی اور اب کے اس مخالفت نے اس قدر شدت اختیار کی کہ شاہ کے حکم کے خلاف جگہ جگہ شورشیں ہو گئیں۔ اور مذہبی مجتہدین شورشوں کے سرغنہ بن گئے۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ نازک صورت حال مشہد میں پیدا ہو گئی۔ جہاں کے مجتہد صاحب نے اپنے پیروؤں کو اپنی خانقاہ میں جمع کر کے شاہ کے اس حکم کے خلاف بغاوت کرنے کی تحریک کی تھی۔

رضا شاہ نے مشہد کے مجتہد صاحب کی اس حرکت کو حکومت کے خلاف سازش قرار دیکر ان کی خانقاہ بحق حکومت ضبط کر لی اور ان کے پیروؤں کے اجتماع پر گولی چلا کر ان کی تحریک کو آغاز ہی میں کچل ڈالا۔ مشہد کی طرح اور مقامات کی شورشوں کو بھی اس نے پوری سختی سے دبایا، اور ضرورت پر فوجی مظاہرہ کرنے سے نہ چوکا۔ چند دنوں میں ایرانیوں کی مخالفت ختم ہو کر رہ گئی، اور پہلوی کیپ ایران کے قومی لباس کا جزو قرار پا گئی۔

لیکن اس کے چند ہی برسوں بعد رضا شاہ نے پہلوی کیپ کا استعمال عوام سے ترک کرا دیا اور اس کی بجائے مغربی چھجہ دار ٹوپیوں کو ایران میں رواج دے دیا۔ اب پہلوی ٹوپی صرف شاہی خاندان کا مخصوص لباس ہے اور عوام مغربی ہیٹ اوڑھتے ہیں۔

پھجہ دار ٹوپی کو رواج دینے سے زیادہ ایران سے مشرقی پردہ اُٹھانے میں شاہ کو مشکلات پیش آئیں۔ اگرچہ ایران میں ہندوستانی وضع کا پردہ کبھی بھی رائج نہیں تھا۔ لیکن صدیوں سے ایرانی خواتین برقعہ یا چادر یا نقاب سے اپنا مُنہ ڈھانک کر باہر نکلنے کی عادی تھیں، اوران کی اس عادت کو مذہبی عقیدے کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ ابتداءً رضا شاہ نے اس عادت کو ترک کرانے میں تحریص سے کام لیا۔ قانوناً عورتوں اور مَردوں کے شہری حقوق میں مساوات تسلیم کی۔ عورتوں کو ہر قسم کی سماجی اور روایتی پابندیوں سے قانوناً آزادی دی، اس کے بعد اپنے ہوا خواہوں اور اصلاح پسند جماعت سے پردہ کی مخالفت اور بے پردگی کی حمایت میں پروپیگنڈا کرایا۔ اور سب سے آخر میں خواتین کو مُنہ ڈھانک کر بازاروں میں چلنے کی قانوناً ممانعت کردی۔

مشہور ہے کہ چند برس پہلے رضا شاہ کی ملکہ زیارت کے لئے "قم" گئی تھیں، اُنھوں نے اپنے چہرہ سے نقاب اُلٹ دی۔ اس پر وہاں کے مجتہد نے ملکہ کی اس حرکت پر انھیں بڑی سرزنش کی۔ رضا شاہ کو جب اس واقعہ کا علم ہوا تو وہ بہ نفسِ نفیس قم پہنچے اوران مجتہد صاحب کی خود اپنے ہاتھ سے گوشمالی کی۔

رضا شاہ نے ایرانی خواتین سے پردہ کی قدیم عادت کو ترک کرانیکی ابتدائی تدبیر یہ اختیار کی تھی کہ طہران کے ایک بازار کو مغربی طرز پر سجایا۔ اس میں اعلیٰ درجہ کی دوکانیں اور سجے سجائے ہوٹل بنائے اور صرف اس جگہ خرید و فروخت تفریح اور کھانے پینے کے لئے عورتوں کو بے نقاب ہو جانے کی ترغیب دی۔ چنانچہ آج بھی طہران کا یہ بازار سارے شہر میں فیشن کا مرکز بنا ہوا ہے، اور یہاں کے ہوٹلوں میں ایرانی خواتین اور مردو ش دولت بے تکلف کھاتے پیتے اور یہاں کی دوکانوں پر سودا خریدتے نظر آتے ہیں۔ اس بازار کے علاوہ شاہ نے مغربی

طرز کے کلب بنائے جس میں مردوں کے دوش بدوش عورتوں کو شرکت کی اجازت دی۔

ان ترغیبات پیہم سے ایرانی خواتین سے پردہ کی عادت چھوٹتی گئی، اور وہ نئے طرز زندگی سے مانوس ہوتی گئیں۔ لیکن ابھی تک ان اصلاحات کو نئی پود ہی نے قبول کیا تھا۔ قدیم ایرانی خواتین کو اب بھی نقاب منہ سے اُلٹ دینے میں تامل تھا۔ اس کے جواب میں شاہ کے ہوا خواہوں نے چپکے چپکے یہ افواہ پھیلانی شروع کی کہ اب شریف خاتون کی پہچان ہی یہ ہے کہ وہ بے نقاب باہر آئے یہ آوارہ عورتیں ہوتی ہیں جو اب بھی نقاب منہ پر ڈالے نکلتی ہیں۔ اس افواہ کا اثر بہت گہرا ہوا اور رفتہ رفتہ قدیم ایرانی خواتین بھی پردے کو خیرباد کہنے لگیں۔

جب رضا شاہ نے دیکھا کہ اب ملک بے پردگی کو قبول کرنے پر اس حد تک تیار ہو چکا ہے تو انھوں نے خواتین کا منہ ڈھانک کر باہر نکلنا قانوناً ممنوع قرار دے دیا۔

اس قانون کا نفاذ ملک میں اس طرح ہوا کہ جو کوئی خاتون منہ ڈھانک کے کسی بازار سے گذرتی ہوئی نظر آئی ایرانی پولیس نے اس کا نقاب کھسوٹ لیا۔ کچھ دنوں تک پولیس کو یہ کام بھی کرنا پڑا اس کے بعد اس سلسلہ میں انھیں تشدد برتنے کی ضرورت نہیں رہی۔ اس لئے کہ طہران سے صحیح معنوں میں پردہ اٹھ چکا تھا، اور ابتدأ جو جھجک منہ کھولے باہر نکلنے میں ایرانی خواتین کو محسوس ہوتی تھی وہ دور ہو چکی تھی۔ لیکن یہ ایران کے پایۂ تخت طہران کا ذکر ہے ابھی ایران کے دور و دراز صوبے اس قدر زبردست اور انقلابی قسم کی سماجی اصلاحات سے مانوس نہیں ہوئے ہیں۔

ترکی کی انقلابی اصلاحات میں ترکوں کی قومی زبان کا مسئلہ بھی شامل تھا ،
اتاترک نے ترکی زبان سے چھانٹ چھانٹ کر غیر ترکی الفاظ خارج کر دیئے تھے،
اور ترکی کے سب ملکی اور غیر ملکی اداروں کو یہ ہدایت کر دی تھی کہ وہ صرف ترکی
زبان میں حساب کتاب رکھیں اور ترکی ہی میں خط و کتابت کیا کریں، اور اس معاملہ میں
انھوں نے اس قدر غلو سے کام لیا تھا کہ شہروں میں آدمیوں کے وہ نام تک
بدل دیئے جو غیر ترکی تھے۔

اس کی بالکل نقل رضا شاہ نے ایران میں کی۔ فارسی کو جو ایران کی قومی عام
زبان ہے غیر زبانوں کے اثرات سے آزاد کیا اور اسے ایران کی قومی زبان بنا دیا۔
غیر ملکی اداروں کو حکم دیا کہ وہ اپنا حساب و کتاب فارسی میں رکھیں، خط پر پتہ فارسی
میں لکھیں۔ دوکانوں پر سائن بورڈ فارسی میں لگائیں اسی کے ساتھ اتاترک کی
اتباع میں انہوں نے ایرانیوں کو خاندانی نام اختیار کرنیکا حکم دیا اور شہروں کے
غیر ایرانی نام بدل دیئے۔ مثلاً ایران کو روس اور برطانیہ "پرشیا" کہا کرتے
تھے اور یہی نام عام ہو گیا تھا۔ رضا شاہ نے اس کو بدل کر قدیم نام ایران اختیار
کر لیا اور اعلان کر دیا کہ غیر ممالک کے لوگ پتہ پر اگر اب بھی پرشیا لکھیں گے تو
وہ خط ایران میں تقسیم نہ کیا جائیگا بلکہ تلف کر دیا جائیگا۔

ایران کے سرکاری دفاتر تو خیر ہیں ہی فارسی میں سڑکوں کے اطلاعی سائن بورڈ
مشہور قدیم عمارتوں کی تاریخی تختیاں حتیٰ کہ میل شمار کرنے کے پتھر تک فارسی
میں لگائے گئے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی ایسا سیاح اگر ایران میں آ جائے
جو فارسی حروف سے ناآشنائے محض ہو تو وہ بغیر ایرانی رہبر کے سڑکوں،
بازاروں، ہوٹلوں یا ایرانی عمارتوں کے نام تک نہیں معلوم کر سکتا۔ اسی کے ساتھ
شاہ کی یہ خاص ہدایت ہے کہ ہر قسم کے لین دین میں ایرانی کو ترجیح دی جائے۔

چنانچہ خود رضا شاہ اپنی ذات کے لئے ایرانی مصنوعات کو غیر ملکی مصنوعات پر
اور ایرانی ماہر فن کو غیر ایرانی ماہر فن پر ترجیح دیتے ہیں، مشہور ہے کہ جب کبھی رضا شاہ بیمار ہوتے ہیں
اور ایسا بہت ہی شاذ ہوتا ہے تو انھیں اصرار ہوتا ہے کہ سوائے ایرانی ڈاکٹر کے
غیر ملکی ڈاکٹر خواہ وہ اپنے فن میں کتنا ہی طاق کیوں نہ ہو ان کا معائنہ تک نہ کرے۔

قاعدہ ہے کہ جب کسی قوم کو اپنی ضروریات زندگی پر قابو حاصل ہونے لگتا ہے
تو اس میں رفتہ رفتہ خودداری اور خود اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی کیفیت رضا شاہ
کے زمانہ میں ایران کی ہے۔ رضا شاہ سے پہلے خاندان قاچاریہاں حکمران تھا لیکن
اس خاندان کو اپنی عیش پرستیوں سے اس قدر فرصت ہی نہ تھی کہ وہ اپنے ملک
اور قوم کی اصلاح کی طرف توجہ کرتا۔ نتیجہ یہ تھا کہ ملک میں ایک قسم کی لامرکزیت
تھی، حکومت بے اثر تھی۔ ایرانیوں کے اخلاق و عادات بگڑتے جا رہے تھے۔
ان میں پستی اور دنائت کے جراثیم اثر کرنے لگے تھے۔ رضا شاہ ملکی اور اقتصادی
اصلاح کے ساتھ ساتھ سماجی اور اخلاقی اصلاحات کا بیڑا اٹھاتے ہیں۔ ایرانیوں
کو پستی سے بلندی کی طرف لیجاتے ہیں۔ اپنی عملی زندگی کے متعلق ان کا زاویۂ نظر بدل
دیتے ہیں اور سب سے بڑھکر یہ کہ ان میں احساس قومیت پیدا کر دیتے ہیں۔

چنانچہ پندرہ برس پہلے کے ایران اور آج کے ایران میں سوائے ناموں کے اور
کوئی بات ایک سی نہیں ملتی۔ نہ ظاہری اور نہ باطنی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایران جدید
کے نام سے ایک نئی دنیا نظروں کے آگے کھڑی ہے۔ ایک نئی قوم نئے حوصلے اور
امنگوں سے سرشار دنیا کی کامیاب قوموں کے درمیان اپنی جگہ بنا رہی ہے۔

آج سے پہلے جب ایران ایک مرکز پر متحد نہیں تھا اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کا
اسے تجربہ نہیں تھا، روس اور برطانیہ کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا۔ یورپ کی
یہ بڑی بڑی قوتیں جس طرف چاہتی تھیں، ایران کو موڑ دیا کرتی تھیں اور جو چاہتی تھیں

اس سے منوالیا کرتی تھیں۔ لیکن آج ایران خود ایک خوددار طاقت ہے اپنی ایک مرضی افتاد پنے ایک ارادہ کا مالک ہے۔ اب اسے رُوس یا برطانیہ، فرانس یا جرمنی، اٹلی یا امریکہ اپنی مرضی کے خلاف نہیں چلا سکتے اور نہ اپنی قوت و طاقت کی نمائش سے اسے مرعوب کر سکتے ہیں۔

ایران میں یہ انقلاب سیاسی اور معاشی حیثیت سے ہی نہیں ہوا اور نہ صرف اجتماعی طور پر اس کا مظاہرہ ہوتا ہے بلکہ انفرادی حیثیت سے بھی ایران جدید ایران قدیم سے بالکل مختلف نظر آتا ہے۔

سنہ ۱۹۳۶ء میں ایک برطانوی باشندہ ایران کی سیاحت کو جاتا ہے۔ اصفہان سے طہران تک موٹر میں سفر کرتا ہے۔ راستہ میں ایرانی محافظ اور اس سیاح میں موٹر کی نشست کے بارے میں تکرار ہو جاتی ہے۔ برطانوی سیاح کی جب سب دلیلیں اپنا مطالبہ ثابت کرنے میں ناکام رہتی ہیں تو وہ محافظ کو یہ کہکر دھمکاتا ہے کہ میں برطانوی رعایا ہوں اور یہ نہ سمجھو کہ میں اکیلا ہوں برطانوی توپیں میری حمایت میں موجود ہیں۔ آج سے پندرہ برس پہلے کے ایرانیوں کو مرعوب کرنے کے لئے بیشک یہ دلیل مؤثر ثابت ہوتی لیکن اس وقت یہ دلیل اُلٹا اثر کرتی ہے۔

برطانوی سیاح کے اس اعلان کو ایرانی محافظ بطور چیلنج قبول کر لیتا ہے اور اس سے اُس وقت تک کسی قسم کا واسطہ رکھنے سے انکار کر دیتا ہے، جب تک سیاح اپنے اس چیلنج کو واپس نہ لے۔ اس نوبت پر موٹر لاری کے سارے ایرانی مسافر جو اس وقت تک خاموش تھے محافظ کے ساتھ ہو جاتے ہیں اور سیاح کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں رہتا کہ وہ ایرانیوں کے قومی جذبات کو مجروح کرنے کی معافی طلب کرکے ان سب سے صلح کرلے اور اپنا سفر جاری رکھے۔

آج ایران میں قومی برتری کا یہ جذبہ مخصوص نہیں بلکہ عام ہے اور اس کے لیے ایران یقیناً رضا شاہ کی ذات کا ہمیشہ ہمیشہ ممنون احسان رہے گا۔

رضا شاہ کی عمر اس وقت ۶۵ - اور ۷۰ کے درمیان ہے لیکن یہ صرف اندازہ ہی اندازہ ہے، شاہ نے آج تک کبھی اپنی صحیح عمر نہیں بتائی۔ وہ بہت صبح سویرے اُٹھتے ہیں اور رات کو بہت دیر سوتے ہیں اور دن بھر کام میں مصروف رہتے ہیں صبح ان کی مصروفیت کی ابتدا فوج کے افسر خفیہ کی رپورٹ کی سماعت سے شروع ہوتی ہے۔ فوجی افسر خفیہ کے بعد شہر کی خفیہ پولیس کا افسر شاہ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے اور اپنا روزنامچہ سُناتا ہے۔ خفیہ پولیس کے افسر کے بعد پولیس کے افسر اعلیٰ کی باری آتی ہے یہ اپنی رپورٹ شاہ کے گوش گذار کرتا ہے۔ اس افسر کے بعد اہلکاران حکومت کی باری آتی ہے اور وہ باری باری سے اپنے محکموں کے حالات سے شاہ کو آگاہ کرتے ہیں۔ رپورٹوں سے فارغ ہو کر رضا شاہ ناشتہ کرتے ہیں اور ناشتہ کے بعد دفتری کام شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ دفتر کا کام اپنے محل ہی کے کمرے میں بیٹھ کر کریں۔ اکثر وہ بغیر اطلاع دیئے کسی محکمہ میں جا پہونچتے ہیں، اور اہلکاروں کے کام کی جانچ شروع کر دیتے ہیں۔ رضا شاہ کی اس عادت سے اہلکاران حکومت خوب واقف ہیں اور ہمیشہ چوکنے رہتے ہیں۔ رضا شاہ ضبط و نظم کے معاملہ میں بے انتہا سخت واقع ہوئے ہیں ذرا سی بے ضابطگی پر بھی وہ سزا دیئے بغیر نہیں رہتے۔ اس کا اثر یہ ہے کہ حکومت کے سارے دفاتر اور محکموں میں اعلیٰ درجہ کا نظم اور ضبط قائم ہو گیا ہے غیر ملکی سیاحوں سے رضا شاہ بہت ہی کم ملتے ہیں۔ البتہ غیر ملکی مدبّروں سے شام کے وقت ملاقات کرتے ہیں اور یہ ملاقات عموماً کھڑے کھڑے ہوتی ہے۔

پاشاہ ٹہلتے جاتے ہیں اور باتیں کرتے جاتے ہیں۔ ان رسمی ملاقاتوں میں رضا شاہ بے انتہا خوش خلق اور مرنجان مرنج انسان نظر آتے ہیں اور سخت سے سخت غیر ملکی مدبر کو بھی اپنے اخلاق و آداب سے رام کر لیتے ہیں۔ وہ فرانسیسی اور انگریزی بلا تکلف سمجھ لیتے ہیں۔ لیکن گفتگو ہمیشہ ایرانی میں کرتے ہیں۔ ایک مترجم شاہ کا مفہوم دوسری زبانوں میں ادا کرتا ہے۔

سرکاری طور پر وہ ضیافتیں کبھی نہیں کرتے۔ یہ کام اُنھوں نے حکومت ایران کے وزیر اعظم کے سپرد کر رکھا ہے۔

سال میں ایک مرتبہ رضا شاہ اپنے ممالک محروسہ کا دورہ کرتے ہیں۔ اس موقع پر جس سمت شاہ کا دورہ ہوتا ہے اس سمت کے دیہات اور قصبات خاص طور پر سجائے جاتے ہیں۔ سڑکیں صاف ہوتی ہیں۔ مکانوں کی آرائش کی جاتی ہے۔ اسکول کے لڑکوں کو نئی وردیاں تقسیم ہوتی ہیں جو شاہ کی آمد کے موقع پہ پریڈ کرتے اور شاہ کو سلامی دیتے ہیں۔ اس دورہ کے موقع پر ایران کے ہر شخص کو اس کی اجازت ہے کہ شاہ کے حضور میں حاضر ہو کر اپنی شکایات بیان کرے اور ویسے بھی بادشاہ کا عام حکم ہے کہ جو شخص مجھ سے کوئی شکایت کرنی چاہے وہ بغیر کسی خرچ کے تار گھر سے میرے نام تار بھیج سکتا ہے، لیکن پولیس عموماً ایسی شکایتوں کو روک دیتی ہے اور جب رضا شاہ کو اس کا علم ہوتا ہے تو بُری طرح سزا پاتی ہے۔

مشہور ہے کہ ایک شہر کے انجینیر کی شاہ کے پاس شکایتیں پہونچیں۔ شاہ جب اس سمت دورے پر گئے تو اس شہر میں بھی بلا اطلاع داخل ہو گئے۔ جہاں وہ انجینیر تعینات تھے۔ یہاں شاہ نے دیکھا کہ اس انجینیر کی نگرانی میں ایک نہایت خوبصورت اور مضبوط پل تعمیر ہو رہا ہے۔ اس پل کو دیکھ کر رضا شاہ اس قدر خوش ہوئے کہ اُنھوں نے اس انجینیر کو معاف کر دیا اور اس کے خلاف شکایتوں کی

تحقیقات نہیں کی۔

ایران میں کوئی کام شاہ کی مرضی اور حکم کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ چھوٹی سے چھوٹی آسامی کا تقرر بھی شاہ کے حکم سے ہوتا ہے اور معمولی سے معمولی کام کے لئے بھی شاہ کی منظوری لے لی جاتی ہے۔ اکثر اوقات شاہ کی منظوری لینے میں دیر ہو جاتی ہے لیکن کام میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی منظوری دیر سویر ضرور مل جاتی ہے۔ اس پابندی کا مقصد صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ سلطنت کا کوئی کام شاہ کے علم و اطلاع بغیر انجام نہ پائے اور مملکت کا کوئی شعبہ ان کی براہ راست نگرانی سے آزاد نہ رہے۔

رضا شاہ ایشیا میں سب سے بڑے زمیندار شمار ہوتے ہیں جتنی زمین اور جتنے بڑے بڑے علاقے ان کے پاس ہیں ایشیا کے کسی فرد واحد کے پاس نہیں ہیں۔ ان علاقوں کی آمدنی بھی بہت ہوتی ہے یعنی اتنی کہ رضا شاہ اس آمدنی کو ہر سال جوڑتے چلے جائیں تو دس برس بعد یہ دنیا میں سب سے زیادہ دولتمند شخص ہو سکتے ہیں۔ لیکن ان کو روپئے کی طمع نہیں ہے، ان کے علاقوں کی ساری آمدنی رفاہ عام کے کاموں میں صرف ہو جاتی ہے۔ علاقوں کے علاوہ بہت سی بڑی بڑی ہوٹلیں بھی ایران کے مختلف شہروں میں انھوں نے قائم کر رکھی ہیں۔ خصوصاً بحیرۂ قزوین کے کنارے جتنے بڑے بڑے شہر اور بندرگاہ ہیں ان سب میں رضا شاہ کے اپنے ہوٹل ہیں۔ ان ہوٹلوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں انتظامات سارے مغربی انداز پر ہیں اور گاہکوں کی بڑی خاطر کی جاتی ہے۔ رضا شاہ نے یہ ہوٹل غیر ملکی سیاحوں کی آسائش کے لئے بنوائے ہیں اور سیاح ہی ان میں ٹھہرتے ہیں۔ ان ہوٹلوں یا علاقوں کو حکومت ایران سے کوئی تعلق نہیں یہ سب رضا شاہ کی ذاتی جائداد ہے۔ جو ان کے بعد ان کی اولاد پر تقسیم ہو جائیگی۔

اس قدر تموّل کے باوجود رضا شاہ بہت سادہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ اس وقت شہنشاہ ہیں اور حکومت ایران ان کے ذاتی شاہانہ اخراجات کے لئے چوبیس لاکھ روپیہ سالانہ کی رقم منظور کرتی ہے۔ لیکن وہ ابتک ایک سپاہی کی طرح رہتے ہیں اور سپاہی کی طرح خرچ کرتے ہیں۔ انھیں کسی چیز کا شوق نہیں ہے اور نہ امور سلطنت سے انھیں اتنی فرصت ملتی ہے کہ وہ کوئی شوق رکھیں۔ البتہ موسیقی سے شاہ کو دلچسپی ہے۔ کام سے جب تھک جاتے ہیں تو خود پیانو بجاتے ہیں۔ مگر پیانو پر بھی ایرانی گیت ہی بجاتے ہیں۔ مشہور ہے کہ رضا شاہ نے بہت سے نئے گیت فارسی میں ایجاد کئے ہیں۔

موسیقی کے علاوہ شاہ کو ریس کا بھی بہت شوق ہے۔ اچھی نسل کے گھوڑے ہر وقت شاہ کے اصطبل میں موجود رہتے ہیں اور انکی تربیت کا خاص انتظام ہوتا ہے۔ گھوڑ دوڑ کے موسم میں رضا شاہ اپنا فرصت کا سارا وقت گھوڑوں پر صرف کرتے ہیں۔

رضا شاہ کو مطالعہ کا بھی شوق ہے سونے سے پہلے وہ کسی نہ کسی کتاب کا مطالعہ ضرور کرتے ہیں، اور صبح سویرے طہران سے نکلنے والے سارے اخبارات کا خود مطالعہ کرتے ہیں۔

رضا شاہ بلا کے سیر چشم واقع ہوئے ہیں اور جب ملک کے اخراجات کا معاملہ ان کے سامنے آتا ہے تو وہ کبھی اپنے ذاتی روپیہ کو عزیز نہیں رکھتے پچھلے چند برسوں میں حکومت ایران کو غیر معمولی سول اور فوجی اخراجات برداشت کرنے پڑے۔ رضا شاہ نے ان اخراجات کو پورا کرنے کے لئے اپنا ذاتی سونا حکومت کے نذر کردیا۔ اور مشہور ہے کہ چند پرانے تاج بھی رضا شاہ نے حکومت ایران کو دیدیئے تاکہ ان کی رقم ملک کی ضروریات پر خرچ کردی جائے۔

حکومت ایران کے بجٹ میں وہ خسارہ دیکھنا پسند نہیں کرتے، وزیر مالیہ اس بات
کا ہمیشہ خیال رکھتا ہے کہ بجٹ ہمیشہ متوازن ہو۔ اگر بجٹ نہ ہو تو خسارہ بھی نہ ہو۔ اور اس
کے لئے اگر ضرورت ہوتی ہے تو اسے خرچ کی مدّات میں کمی کرنی پڑتی ہے۔

رضا شاہ کی کئی بیبیاں ہیں اور کئی بچے ہیں۔ یہ ٹھیک طور پر کوئی نہیں بتا سکتا
کہ رضا شاہ کی کتنی بیبیاں ہیں، اس لئے کہ شاہ کے محل کے حالات معلوم کرنے کی
کوشش کرنا بھی جرم ہے۔ اسی طرح کسی کو بھی ٹھیک طور پر یہ پتہ نہیں کہ شاہ کے کتنے
بچے ہیں۔ پہلی شادی رضا شاہ کی اس وقت ہوئی تھی جب یہ کاسک بریگیڈ میں
معمولی سپاہی تھے، یہ خاتون ماژندران کی رہنے والی اور معمولی خاندان سے تعلق
رکھتی تھیں۔

ان کے بعد رضا شاہ نے سردار سپاہ ہو کر دوسری شادی کی۔ یہی بیوی آج
رضا شاہ کی ملکہ اور شاپور ولیعہد ایران کی ماں ہیں۔ یہ خاتون ایران کے پرانے شاہی
خاندان "قاچار" سے تعلق رکھتی ہیں، اور اس وقت کے گورنر ماژندران کی صاحبزادی
ہیں۔ ایران میں ان کا بڑا اعزاز ہے اور رضا شاہ کے بعد ایرانیوں پر انہی کا اثر ہے۔ انہی ملکہ
سے شاپور کی دو بہنیں بھی ہیں۔ ان دونوں کی شادیاں سیاسی مصالح کے ماتحت
ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک کی شادی ایران کے ایک طاقتور قبیلہ کے سردار
سے ہوئی ہے، اور دوسری موجودہ وزیر اعظم ایران کے لڑکے سے بیاہی
ہوئی ہے۔

ملکہ کے علاوہ بھی رضا شاہ کی کئی بیبیاں ہیں اور ان بیبیوں کے کئی
بچے ہیں۔ لیکن نہ یہ بیبیاں حرم سے باہر آتی ہیں اور نہ ان بچوں کو عام طور
پر دیکھا جا سکتا ہے۔

ایک مرتبہ ریس کے میدان میں تقریباً ہم عمر پانچ شہزادے شاہی بکس میں بیٹھے ہوئے نظر آئے تھے۔ یہ پانچوں دوسری بیبیوں سے ہیں اور ان پانچوں کا نام رضا ہے۔

رضا اب ایران میں عام نام ہے۔ اصلی نام چاہے کسی کا کچھ ہو۔ لیکن رضا کا جوڑ ضرور لگا دیا جاتا ہے، اور شاہی خاندان کے لئے تو یہ نام مخصوص ہو کر رہ گیا ہے، جتنے بچے ہوتے ہیں سب کے نام رضا رکھے جاتے ہیں۔

ایران میں ایک افواہ یہ ہے کہ رضا شاہ کی پہلی بیوی سے ایک لڑکا تھا جو اس وقت ولیعہد سے عمر میں بہت بڑا ہے۔ لیکن شاہ نے اسے ولی عہد نہیں بنایا۔ لیکن یہ محض افواہ ہی افواہ معلوم ہوتی ہے۔ کسی ثقہ تذکرہ نویس نے اس کی تصدیق نہیں کی۔

بہرحال ولیعہد ایران کا نام محمد رضا ہے۔ لیکن ایران میں عام طور پر شاپور کے نام سے مخاطب کیا جاتا ہے۔ شاپور کے اصطلاحی معنی بھی ولی عہد ہی کے ہیں۔

رضا شاہ نے شاپور کی تعلیم اور تربیت پر ابتدا ہی سے خاص نگرانی رکھی ہے۔ عربی۔ فارسی، فرانسیسی، روسی اور انگریزی زبانوں کے اتالیق ابتدائی عمر سے ولیعہد پر متعین کر دیئے گئے تھے، تاکہ شاپور ان زبانوں سے بے تکلف رہے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد رضا شاہ نے شاپور کو سوئٹزرلینڈ کے مشہور مدرسے "گستاد" میں تکمیل تعلیم کے لئے بھیج دیا۔ جب یہ وہاں سے واپس ہوا تو ایران میں اس کی فوجی تربیت اور سیاسی تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ شاپور کا روزمرہ کا پروگرام بہت طویل ہوا کرتا تھا اور صبح سے شام تک یہ کسی نہ کسی کام میں مصروف نظر آتا تھا۔

مشرقی ممالک میں شاپور پہلا ولی عہد ہے، جسے اسقدر مشقت کرنی پڑتی ہے
اور جو اسقدر کم عمری میں سلطنت کے ہر شعبے اور اس کی ذمہ داریوں سے پوری پوری
واقفیت حاصل کر چکا ہے۔ اس قسم کی سخت تربیت سے رضا شاہ کا مقصد یہ
ہے کہ شاہ پور رضا شاہ کے بعد ایران جیسی زبردست سلطنت کا بار اٹھانے کے
قابل ہو جائے اور جو اصلاحات رضا شاہ سے باقی رہ جائیں اپنے عہد میں
انھیں تکمیل تک پہونچائے۔

شاپور نہایت وجیہ، فیاض اور آزاد خیال لڑکا ہے اور نئی تعلیم نے اس کی
ان صفات میں اور جلا دے دی ہے۔ ایران کا مستقبل درحقیقت اسی نوجوان سے
وابستہ ہے، اور اگرچہ عام طور پر یہ خیال ہے کہ رضا شاہ کی سلطنت میں اس
وقت جو کمزوریاں پائی جاتی ہیں، شاہ پور انھیں دور کر دیگا لیکن زیادہ سمجھدار لوگ
یہ خیال کرتے ہیں کہ آیندہ چل کر شاہ پور کو اقتدار حاصل کرنے میں رضا شاہ کی
موجودہ پالیسی کے باعث بڑی بڑی مشکلات پیش آئیں گی۔

رضا شاہ نے شہنشاہ ہونے کے بعد سے ایران کے کسی امیر کو اسقدر طاقتور
نہیں رکھا کہ وہ کسی نوبت پر بھی شاہ کے حکم کی خلاف ورزی کر سکے۔ جو امرا
اور رؤسا فی الحقیقت ایران میں طاقتور اور ہردلعزیز تھے نہایت چالاکی اور
ہوشیاری سے ان کی طاقت کو توڑ دیا، اور ان کی ہردلعزیزی کو ختم کر دیا۔
مقصد اس پالیسی کا یہ معلوم ہوتا ہے کہ رضا شاہ کے بعد کسی امیر میں اسقدر
جرأت نہ ہو کہ وہ رضا شاہ کے جانشین کی اطاعت سے منحرف ہو سکے، لیکن سمجھدار
طبقے کا یہ خیال ہے کہ رضا شاہ کی اسی پالیسی کے باعث ایران کے اونچے طبقہ
میں رضا شاہ کی شدید مخالفت کا جذبہ پرورش پا رہا ہے اور گو اس وقت رضا شاہ
کے استبداد کے باعث یہ ظاہر نہیں ہونے پاتا۔ لیکن ان کے انتقال کے بعد

ان کے خاندان سے انتقام کی صورت میں یہ ظاہر ہوگا، اور اس وقت شاپور کے لئے ان کا مقابلہ آسان نہ رہے گا۔

جن امیروں کو رضا شاہ نے اپنے عہد میں نقصان پہونچایا اور ان کے سارے خاندانی اعزاز و اکرام کو خاک میں ملا دیا۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور امیر ابوالحسین تیمور تاش ہے۔ تیمور تاش ایران کے قدیم رؤسا کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ خراسان کا بہت بڑا جاگیردار اور ایران کا با اثر اور نہایت ہر دلعزیز امیر تھا۔

اسکی علمی اور فوجی قابلیت نہایت اونچی تھی۔ پیٹرو گریڈ کے فوجی مدرسہ کی اوّل درجہ کی فوجی سند اس نے حاصل کی تھی اور رضا شاہ سے پہلے بحیثیت گورنر اور گورنر جنرل اس نے حکومت ایران پر اپنی قابلیتوں اور صلاحیتوں کا سکّہ بٹھا دیا تھا۔ رضا شاہ کے شہنشاہ ہونے کے بعد تیمور تاش وزیر دربار کے معزز عہدہ سے سرفراز ہوا۔ یہ وہ عہدہ تھا جو وزیر اعظم سے کسی طرح کم نہ سمجھا جاتا تھا۔

تیمور تاش نہایت مہذب، آزاد خیال، وطن پرست اور ایران میں انقلابی اصلاحات کا حامی تھا۔ مشہور ہے کہ ایران میں رضا شاہ نے جسقدر معاشی سیاسی، سماجی اور اخلاقی اصلاحات نافذ کیں ان سب میں تیمور تاش کا ہاتھ تھا، بلکہ یہی شخص رضا شاہ کی آڑ میں ایران کا اصلی حکمراں سمجھا جاتا تھا۔

تیمور تاش کے اس بڑھتے ہوئے اقتدار، اعزاز و وقار اور اس کی عام ہر دلعزیزی کے باعث رضا شاہ کے حاشیہ نشینوں میں اس کے کچھ مخالف بھی پیدا ہو گئے اور انھوں نے رضا شاہ کو موقع بموقع اس کے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا۔

سنہ ۱۹۳۲ء میں تیمور تاش یورپ کی سیاحت کو گیا، ہر جگہ اس کا نہایت شاندار خیر مقدم ہوا۔ خصوصاً روس نے بڑے اعزاز کے ساتھ شاہانہ انداز

میں اس کا استقبال کیا۔ رضا شاہ کے حاشیہ نشینوں نے ان واقعات سے شاہ کو تیمور تاش کی طرف سے اور بدظن کر دیا، اور خود شاہ نے بھی محسوس کیا کہ ایران اور ایران کے باہر تیمور تاش کو جو مقبولیت حاصل ہے، اس سے رضا شاہ کا اقتدار کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ چنانچہ جب غریب تیمور تاش یورپ کے سفر سے مظفر و منصور ایران پہونچا تو ایران میں اس کے استقبال کے لئے جیلخانے کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔

سفر سے واپس آتے ہی رضا شاہ نے اس پہ سولہ ہزار پونڈ کی رشوت کا الزام لگایا۔ اور اس الزام میں تیمور تاش جیسے امیر کبیر کو صفائی کا موقع دیئے بغیر دس سال کے لئے جیل بھیجدیا۔ یوروپ جاتے ہوئے تیمور تاش نے اپنے ہاتھ سے ایک جیلخانہ کا افتتاح کیا تھا۔ قسمت نے اسے اسی جیلخانہ کا اسیر بنادیا۔ لیکن اس سزا کے دو ہی ہفتہ بعد تیمور تاش ۳۔ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو جیل ہی میں انتقال کر گیا۔ حکومت ایران کا کہنا یہ تھا کہ تیمور تاش کا انتقال حرکت قلب بند ہو جانے سے ہوا ہے۔ لیکن عوام کو اس میں شبہ ہے کہ یہ حرکتِ قلب قدرتاً بند ہوئی یا بند کرائی گئی۔

تیمور تاش ایران کے اسٹیج سے غائب ہو گیا۔ شاہ کے اقتدار کے لئے کوئی خطرہ باقی نہ رہا۔ عوام اور امراء ایران نے بظاہر اس حادثہ کو نہایت خاموشی سے برداشت کیا۔ لیکن یہ واقعہ ایسا نہیں تھا کہ ایرانی اسے بھول بھی جاتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کے حافظہ میں ابھی تک تیمور تاش کی یاد اور اس کی شخصیت کا اثر محفوظ ہے۔

تیمور تاش کے علاوہ اور بہت سے امراء و وزراء ایسے ہیں جنہیں رضا شاہ کے ہاتھوں ذلت نصیب ہوئی ہے۔ درجنوں خاندان اس طرح ذلتیں اٹھا چکے

وہ ابھی اپنی ذلتوں کو بھولے نہیں ہیں۔ شاپور کو رضا شاہ کے بعد اپنی چھپی ہوئی رنجشوں اور مخالفتوں کا مقابلہ کرنا ہے۔

شاپور کی عمر اس وقت چوبیس برس کی ہے اور مارچ ۱۹۳۹ء میں شاہ مصر کی بہن شاہزادی فوزیہ سے ان کی شادی ہوئی ہے، یہ شادی بھی سیاسی ہے اور مقصد اس کا یہ ہے کہ ایران اور مصر کے سیاسی تعلقات بہت زیادہ قریبی اور مضبوط ہوجائیں۔

رضا شاہ نے شاپور کی شادی کا بڑا اہتمام کیا تھا۔ سارے ایران میں ایک ہفتہ تک جشن منایا گیا جس میں شاہ فاروق کی والدہ ملکہ نازلی نے بھی حصّہ لیا تھا۔

ایرانیوں نے شاپور کے جشن شادی میں جسقدر دل کھول کر حصّہ لیا۔ اس سے یہ بات بہرحال ظاہر ہوتی ہے کہ شاپور ایران میں کافی ہردلعزیز ہے اور لوگ رضا شاہ سے زیادہ اس آزاد خیال اور فیاض نوجوان کو پسند کرتے ہیں، اور یہی ایک بات ہے جو شاپور کے حق میں ہے اور اسی سے یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ شاپور کے فیاض سلوک سے متاثر ہوکر ایرانی امراء شاید رضا شاہ کی کمزوریاں کو معاف کردیں اور اس خاندان کو ایران کے تخت پر استحکام حاصل ہوجائے۔

رضا شاہ صلح جو اور امن پسند شخص ہیں۔ انھوں نے اپنے عہد حکومت میں ایران کی ہمسایہ سلطنتوں اور ان مغربی حکومتوں کو جن کے سیاسی اور تجارتی تعلقات ایران سے وابستہ ہیں کبھی بے وجہ شکایت کا موقع نہیں دیا۔

ہم بتا چکے ہیں کہ جنگ عظیم سے پہلے ایران روس اور برطانیہ کی چراگاہ بنا ہوا تھا اور یہ دونوں قومیں ایران پر اپنا سیاسی اقتدار رکھنے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لیجانے میں کوشاں تھیں۔ لیکن جنگ عظیم کے بعد روس

میں انقلاب ہو گیا۔ بالشویک حکومت کو روس کی شہنشاہی پالیسی سے دلچسپی باقی نہ رہی اس لئے ایران سے اپنی توجہ ہٹالی، البتہ ایران سے ایک تجارتی معاہدہ کر لیا جو ابتک چلا آتا ہے، لیکن برطانیہ نے ایران پر اپنا سیاسی اقتدار قائم رکھنے کیلئے جنگ عظیم کے بعد بھی برابر ہاتھ پاؤں مارے۔ اسلئے کہ ایران ہندوستان کے راستے میں ہے، اور ہندوستان کو محفوظ رکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ایران پر بھی برطانیہ کا اثر رہے۔ لیکن رضا شاہ نے ایران میں برطانیہ کا اثر بڑھنے نہ دیا، اور انھیں جیسے ہی موقع ملا اس کو ختم کر کے رکھدیا۔ اس کے باوجود آج بھی ایران اور برطانیہ کے تعلقات نہایت خوشگوار اور دوستانہ ہیں۔ روس اور برطانیہ کے علاوہ عراق، ترکی اور افغانستان سے اس کے تعلقات نہایت برادرانہ ہیں۔

۱۹۳۶ء میں جب ترکی کے وزیر خارجہ نے اتاترک کے حکم سے جنیوا میں ایشیائی ممالک کی ایک علیحدہ لیگ قائم کرنے کی تحریک پیش کی تھی تو سب سے پہلے رضا شاہ کے دیا پر ایرانی نمایندہ نے اس لیگ کی تائید کی اور حکومت ترکی کو یقین دلایا کہ ایران اس معاملہ میں پوری طرح ترکی کے ساتھ ہے۔

ایشیائی لیگ تو بعض موانع کی بناپر قائم نہ ہو سکی۔ البتہ ترکی، عراق، ایران اور افغانستان کے درمیان ایک مدافعتی معاہدہ کی اسکیم تیار ہو گئی جسے ترکی نے اپنی قیادت اور ایران کی مدد سے تکمیل کو پہونچایا۔ اس معاہدہ کا نام "معاہدہ سعد آباد" ہے۔ اس لئے کہ یہ معاہدہ ایران میں طے پایا، اور ۱۹۳۷ء میں بغداد میں اس پر دستخط ہوئے۔

اس معاہدہ کے بعد ایران اور افغانستان کی سرحد کا جو قضیہ مدت سے چلا آرہا تھا اور جس کے باعث ایران اور افغانستان میں کچھ بدمزگی سی پیدا ہو گئی تھی ترکی کی ثالثی سے آپس ہی میں بخیر و خوبی طے ہو گیا، اور ان دونوں ہمسایہ

ممالک کے تعلقات بگڑنے نہ پائے۔

ایشیائی لیگ کی جو اسکیم اتاترک نے تیار کی تھی اس کا مقصد یہ تھا کہ ایشیا کی حکومتوں کے لئے ایک ایسا سیاسی مرکز قائم کیا جائے جہاں ان کے اندرونی اور بیرونی مناقشات بھی طے ہوں اور آپس میں تبادلۂ خیال کے ذریعے ایشیا کی اصلاح و ترقی کی تدابیر بھی زیر بحث آئیں، اور سب سے اہم مقصد یہ تھا کہ ایشیا پر سے مغربی قوتوں کے اثر و اقتدار کو ختم کر دیا جائے۔

معاہدہ سعد آباد اسی اسکیم کا ایک جزو ہے جس کے ذریعہ چار اسلامی ممالک کو ایک رشتۂ اخوت میں منسلک کیا گیا ہے۔ اس اسکیم میں نجد و حجاز، شرق اردن اور شام و فلسطین کی حکومتیں شامل نہیں ہوئیں، اس وجہ سے کہ ان اسلامی حکومتوں پر برطانیہ اور فرانس کا زبردست اثر تھا اور کچھ یہ وجہ تھی کہ عرب اور غیر عرب کی تفریق نے انھیں اس معاہدہ سے باز رکھا تھا۔

جنگ عظیم کی ابتدا میں عرب میں "وحدت عربیہ" کے نام سے ایک تحریک شروع ہوئی تھی، جس کا مقصد یہ تھا کہ عربوں کو ترکوں کے اقتدار سے آزاد کر کے ایک متحدہ ریاستہائے عربیہ قائم کی جائے۔ اس تحریک کا بانی برطانیہ کو قرار دیا جاتا ہے جس نے عربوں کو متحدہ ریاستہائے عربیہ کا سبز باغ دکھایا اور انھیں ترکوں سے توڑ کر چھوٹی چھوٹی محکوم ریاستوں میں تقسیم کر دیا۔

شام و فلسطین فرانس کے انتداب میں آگیا۔ عراق پر برطانیہ نے اپنا اقتدار جما لیا۔ البتہ نجد و حجاز بظاہر کسی یوروپین قوت کے زیر اقتدار نہیں آیا تھا۔ لیکن ابن سعود اور شریف حسین کی جنگ میں برطانیہ نے علانیہ ابن سعود کا ساتھ دیا۔ اور شریف حسین کو دیا مدد محض اس لئے دیا کہ شریف حسین حسب معاہدہ انگریزوں سے نجد و حجاز کی مکمل آزادی چاہتا تھا۔ شریف حسین کو اس جنگ میں ناکامی

رہی ابن سعود فتح مند رہا اور بے کھٹکے نجد و حجاز کا والی بن بیٹھا۔ حجاز میں ابن سعود کے برسر اقتدار آنے کے بعد برطانیہ کو کیا فائدہ ہوا۔ اس پر یہاں گفت گو کا موقع نہیں۔ اس کی تفصیل انشاء اللہ ابن سعود کے حالات میں آئے گی۔ اس جگہ صرف یہ معلوم کر لینا کافی ہے کہ معاہدہ سعد آباد جن چار اسلامی ممالک کے درمیان طے ہوا ان میں اسوقت بھی کامل برادرانہ تعلقات ہیں اور آپس میں معاشی اور سیاسی تعلقات کو بڑھانے کے لئے ایک زبردست بست سالہ اسکیم بھی تیار کر لی گئی ہے۔ جس پر عمل شروع ہو گیا ہے۔ اس اسکیم کو کامیاب بنانے میں اتاترک کے بعد سب سے زیادہ رضا شاہ کے عزم وارادہ کو دخل تھا۔

ہمسایہ ممالک کے دوستانہ معاہدات کے ساتھ ساتھ رضا شاہ نے ملک کی قوت مدافعت کو بڑھانے پر بھی خاص توجہ دی۔ چنانچہ فوجی تربیت ۲۱ برس کے ایرانی نوجوان کیلئے لازمی ہے۔

اس وقت ایران میں باقاعدہ فوج کے نو مخلوط ڈویژن ہیں اور پانچ بریگیڈ ہیں۔ اس کل فوج کی طاقت تقریبًا اٹھارہ سو افسر اور تقریبًا پچاس ہزار آلات جدیدہ سے مسلح سپاہیوں پر مشتمل ہے۔ فضائی بیڑے میں تقریبًا ایکہزار سپاہی اور افسر ہیں، اور اس وقت حکومتِ ایران کے پاس ڈھائی سو ہوائی جہاز موجود ہیں۔

ایران کے بحری بیڑے میں دو چھوٹے جنگی جہاز خلیج فارس میں ہیں۔ جن پر ۲ سے ۴ انچی دہانہ کی توپیں چڑھی ہوئی ہیں اور چار موٹر والی کشتیاں ہیں جن پر ۲ سے ۳ انچی قطر کی توپیں ہیں۔ اسی طرح بحیرۂ قزوین میں بھی چند جہاز پڑے ہوئے ہیں۔ مدافعت کا یہ انتظام رضا شاہ نے ہی اپنے عہد حکومت میں کیا ہے۔ ورنہ

ان سے پہلے شاہانِ قاچار کے عہد میں بحری اور فضائی بیڑہ برائے نام بھی نہیں تھا اور حکومت کی بری طاقت بھی روس اور برطانیہ کے زیراقتدار اور منتشر حالت میں تھی۔

رضا شاہ مذہباً شیعہ ہیں اور حکومت ایران کا سرکاری مذہب بھی یہی ہے لیکن مذہب کے معاملہ میں رضا شاہ بالکل غیر متعصب واقع ہوئے ہیں۔ اسوقت ایران کی آبادی تقریباً ڈیڑھ کروڑ ہے۔ اس میں شیعہ ۱۷ لاکھ سنّی ½ ۸ لاکھ پارسی دس ہزار یہودی تقریباً چالیس ہزار ارمنی تقریباً پچاس ہزار اور عیسائی، نستوری اور بہائی تقریباً تیس ہزار۔ شاہ کا اپنی ہر مذہب کی رعایا کے ساتھ یکساں سلوک ہے اور کسی مذہب کی تحقیر قانوناً جرم ہے۔

خود اپنے شیعہ مذہب پر البتہ رضا شاہ نے چند سخت پابندیاں عائد کردی ہیں۔ مجتہدین کا اثر عوام پر سے زائل کر دیا ہے۔ ملکی معاملات سے انھیں بالکل بے دخل رکھا ہے۔ عشرۂ محرم میں مراسم عزا پہلے جس آزادی سے ادا کئے جاتے تھے، ان کو روک دیا ہے اور توہمات کو مذہبی عقیدے کا جو درجہ حاصل تھا انھیں توڑ دیا ہے۔

محرم اب بھی ایران میں آتا ہے عزاداری اب بھی ہوتی ہے لیکن ان مراسم میں کوئی بات ایسی نہیں ہونے پاتی جس سے شاہ کی دوسری رعایا کی دل آزاری ہو یا کسی دوسرے مذہب کا شخص ان کا مذاق اڑائے۔ اس مذہبی رواداری کا نتیجہ یہ ہے کہ ایران میں شیعہ اور سنیوں کے تعلقات بالکل بھائیوں جیسے ہیں، اور کبھی کسی مذہبی معاملہ میں ان میں بدمزگی پیدا نہیں ہونے پاتی۔

سماجی اصلاحات کی طرح مجتہدوں اور قدامت پرستوں نے ان مذہبی اصلاحات میں بھی رضا شاہ کی مخالفت کی لیکن یہ مخالفت ایک خاص طبقہ سے

آگے بڑھنے نہ پائی، اور نہ اس سلسلہ میں کوئی ناخوشگوار صورت ملک میں پیدا ہوئی۔

ایران قاچاریوں کے عہد حکومت میں تعلیم میں بہت پیچھے تھا۔ سرکاری مدارس برائے نام تھے تعلیم کا معیار بہت پست تھا۔ محلہ کی مسجدیں یا مکتب ملک کی ابتدائی تعلیم گاہیں تھیں۔ اعلیٰ تعلیم صرف سرمایہ داروں اور رئیسوں کے حصّہ میں آتی تھی اور وہ بھی ایران کے باہر لیکن رضاشاہ کے زمانہ میں تعلیم عام ہو گئی معیار تعلیم بہت اونچا ہو گیا اور اعلیٰ تعلیم کے لئے سرمایہ داروں اور رئیسوں کی قید نہ رہی۔

رضاشاہ کے عہد کی تعلیمی ترقیوں کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سنہ ۱۹۲۰ء یعنی احمد شاہ کے عہد حکومت میں سارے ایران میں صرف تین سو سرکاری مدرسے اور ان مدرسوں میں کُل پینتیس ہزار لڑکے تعلیم پایا کرتے تھے، اور ۱۹۳۲ء یعنی رضا شاہ کے عہد حکومت میں مدارس کی تعداد ۲۴۳۶ اور طلبہ جو ان مدارس میں تعلیم حاصل کرتے تھے، ان کی تعداد ... ۱۴۲ تک پہونچ گئی تھی۔ ان سارے مدارس کے مصارف حکومت ایران اٹھاتی ہے، ان سرکاری مدارس کے علاوہ کئی ہزار خانگی مدارس بھی ایران میں ہیں جنھیں حکومت کی طرف سے سالانہ امداد ملتی ہے اور مدرسوں کے علاوہ پرانی وضع کے مکتبے بھی ابھی تک باقی ہیں۔ جن میں ملّا صاحب یا مجتہد صاحب لڑکوں کو مذہبی تعلیم دیتے ہیں۔ ایسے مدارس کی بھی حکومت مدد کرتی ہے۔ لیکن وقف فنڈ سے۔

ان سرکاری اور غیر سرکاری مدارس اور مکتبوں کے علاوہ مختلف عیسائی مشنوں کی طرف سے بھی ایران میں بہت سے مدارس قائم ہیں اور جرمن اور سوئٹ حکومتوں نے بھی ایران میں مدرسے قائم کئے ہیں، اور ان مدارس میں بھی طلبہ

کی بہت بڑی تعداد تعلیم پاتی ہے۔ لیکن یہ طالب علم عیسائی، یہودی، پارسی یا بہائی ہوتے ہیں۔ ایران کے مسلمان طالب علم ان مدرسوں کی طرف توجہ نہیں کرتے۔

ایران کے بہائیوں نے عورتوں کی تعلیم کی طرف بہت توجہ کی ہے اور اس وقت ایران میں کئی گرلز اسکول بہائیوں کے انتظام میں ہیں، جن میں قابل عورتیں تعلیم دیتی ہیں۔ نصاب تعلیم ان مدرسوں کا ایسا ہی ہے جو لڑکوں کے مدرسوں کا ہے۔

رضا شاہ غیر ملکی مدارس کو پسند نہیں کرتے۔ لیکن ان کو ایران سے خارج کر دینا بھی مصلحت کے خلاف سمجھتے ہیں۔ اس لئے ان پر حکومت کی طرف سے سخت نگرانی رکھتے ہیں، اور ایسے مدرسوں میں صرف انہی طالب علموں کو داخل ہونے کی اجازت دیتے ہیں جو مسلمان نہیں۔

ایران میں پہلے تعلیمی وظائف کا دستور نہ تھا۔ رضا شاہ نے طالبعلموں کو تحریص دینے کے لئے وظائف جاری کئے اور انھیں تعلیم کی تکمیل کے لئے حکومت کی طرف سے یورپ بھجوانے کی صورتیں بھی نکالیں۔

اس وقت ایران کے سرکاری مدرسوں میں جو مدرّس کام کر رہے ہیں، وہ ایرانی ہی ہیں۔ جو حکومت کے خرچ پر یورپ میں اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کر کے ایران واپس آئے ہیں۔ بچوں کی تعلیم کے ساتھ سارے ملک میں تعلیم بالغان کا بھی معقول انتظام ہے، اور وہ لوگ جو دن کو کوئی پیشہ کرتے ہیں، رات کو مدارس شبینہ میں آسانی سے شرکت کر سکتے ہیں۔

تعلیم کی اس سرگرمی کا نتیجہ یہ ہے کہ ایران میں پڑھے لکھے افراد کا تناسب دس فیصدی سے بڑھ کر اب ستئیس فیصدی ہو گیا اور اگر اس سرگرمی کی رفتار یہی رہی تو اندازہ ہے کہ کچھ ہی برسوں میں ترکی کی طرح ایران کا قلی بھی اَن پڑھ جاہل باقی نہ رہے گا۔

ایران کا محکمہ انصاف رضا شاہ سے پہلے بہت بدنام محکمہ تھا۔ ملک کی عدالتوں میں کوئی نظم اور باقاعدگی نہیں تھی۔ مقدمات کا انفصال ہمیشہ حاکم کی اختیارِ تمیزی پر ہوا کرتا تھا۔ قانون قاعدہ محض برائے بیت تھی۔ رضا شاہ نے برسرِاقتدار آتے ہی حکومت کے اور شعبوں کے ساتھ محکمہ انصاف کی طرف بھی توجہ کی اور اس کو منقلب کر کے رکھدیا۔

اس وقت ایران کا محکمہ انصاف بالکل فرانس کے طرز پر قائم ہے۔ چھوٹے چھوٹے قریوں اور قصبوں تک میں منصف رکھے گئے ہیں۔ بڑے بڑے قصبوں اور شہروں میں منصفوں کے ساتھ پولیس کے مجسٹریٹ بھی تعینات ہیں شہروں میں دیوانی اور فوجداری دونوں طرح کی عدالتیں ہیں اور ہر بڑے شہر میں ایک عدالت اپیل بھی بنائی گئی ہے اور سب سے بڑی عدالت جسے عدالت العالیہ یا ہائی کورٹ کہا جا سکتا ہے طہران میں ہے۔

ان عدالتوں میں فوجداری کا قانون فرانس کا اور دیوانی کا قانون سوئٹزرلینڈ کا رائج ہے۔ البتہ ملکی ضروریات کا لحاظ کرتے ہوئے ان قوانین میں مناسب ترمیم کرلی گئی ہے۔

محکمہ انصاف، وزیرِ انصاف کے ماتحت کام کرتا ہے اور یہ وزیر دستورِ ایران کے بموجب مجلس کو جواب دہ ہے لیکن ایسا ہوتا نہیں۔ ایران کا ہر وزیر صرف شاہ کو جواب دہ سمجھا جاتا ہے۔

ناصر الدین قاچار کے زمانہ سے یہ شکایت چلی آرہی تھی کہ ایران میں ٹیکس بہت زیادہ ادا کرنے پڑتے ہیں اور ان ٹیکسوں کے لگانے میں بڑی بے قاعدگی

برتی جاتی تھی۔ رضا شاہ جب حکومت ایران میں دخیل ہوئے تو انھوں نے خود بھی امراء اور رؤسائے سے بڑی سختی سے تقایا ٹیکس وصول کئے تھے، لیکن آج ایران کی حالت بالکل جدا ہے۔ ایرانیوں پر برائے نام ٹیکس ہیں اور ان کی وصولیابی میں بھی غیر معمولی سختی سے کام نہیں لیا جاتا۔

حیرت یہ ہے کہ اس وقت حکومت کے اخراجات قاچاریوں کے زمانہ سے تقریبًا چھ گنا زیادہ ہیں۔ لیکن اس کے باوجود رضا شاہ نے ایرانیوں پر سے ناواجبی ٹیکس منسوخ کر دیئے ہیں، جو اس زمانہ میں جاری تھے، اور آمدنی کی کمی کو ایران کی چنگی اور تیل کی قیمتوں کی رائلٹی سے پورا کر لیا ہے۔

زمینوں کا لگان بھی پہلے سے بہت کم کر دیا ہے۔ کسانوں کو تقاوی کی صورت میں روپیہ قرض دیا جاتا ہے۔ ان کی زراعت کو ترقی دینے کے لئے ایک محکمہ زراعت قائم ہے جو انھیں کاشت کے جدید اور منفعت بخش اصول بتاتا رہتا ہے۔

موجودہ حکومت کی اس پالیسی سے ایران کا کسان طبقہ بہت خوش اور مطمئن ہے اور اس میں خوش حالی کے آثار بھی ظاہر ہونے لگے ہیں۔

رضا شاہ میں جہاں اتنی خوبیاں ہیں تھوڑی سی کمزوریاں بھی پائی جاتی ہیں اور در اصل انہی کمزوریوں کے باعث ایران میں ان کے مخالفوں کا ایک مختصر سا گروہ بھی موجود ہے، جو شاہ کو انتہائی جابر اور ظالم بادشاہ سمجھتا ہے۔

اس مخالف گروہ کے نزدیک ایران ایک بہت بڑا جیلخانہ ہے جس میں ہر ایرانی قیدی ہے کسی متنفس کی اپنی کوئی مرضی اور ارادہ نہیں۔ زندگی کے ہر شعبے میں وہ شاہ کی مرضی کا پابند اور اسی کے حکم کا تابع ہے۔ کہنے کو ملک میں دستوری حکومت ہے، اور حکومت کے ہر شعبے کے لئے ایک مکمل قانون اور ضابطہ بھی موجود

ہے۔ لیکن ان سب کے باوجود شاہ کا ہر لفظ قانون ہے۔ جس سے کوئی شخص سرتابی نہیں کر سکتا۔

ترقی و تنزل، عنایت و عتاب، عروج و زوال بالکل شاہ کے مزاج کے تابع ہے اور کوئی شخص یہ نہیں بتا سکتا کہ کب عنایت ہو گی اور کب عتاب ہو گا۔

سیاسی وضع کے مقدمات میں جو اشخاص ملوث پائے جاتے ہیں بلا اظہار جرم جیل میں بھر دیئے جاتے ہیں۔ نہ ان پر مقدمہ چلایا جاتا ہے نہ انھیں صفائی کا موقع دیا جاتا ہے اور نہ ان کے لیے اپیل کی گنجائش نکلتی ہے۔

ملک میں کوئی سیاسی پارٹی نہیں ہے اور مجلس ملی بھی برائے نام ہے۔ بظاہر یہاں ملک کا قانون اور دستور زیر بحث آتا ہے۔ لیکن فی الحقیقت اس مجلس میں وہی قانون منظور کر لیا جاتا ہے جسے شاہ پسند کرتے ہیں۔ شاہ کے احکام پر بحث وتمحیص کا کوئی موقع نہیں ہوتا۔

غرض رضا شاہ کہنے کو ایران کے آئینی بادشاہ ہیں، لیکن فی الحقیقت وہ ملک کے ڈکٹیٹر یا مختار مطلق ہیں جن کی مرضی بغیر ملک کا کوئی کام انجام نہیں پا سکتا۔

مخالفین کے ان اعتراضات کے جواب میں شاہ پسند پارٹی یہ عذر کرتی ہے کہ رضا شاہ کے بادشاہ منتخب ہونے سے پہلے ایران کی اپنی کوئی مستقل سیاست نہیں تھی روس اور انگلستان کے زیر اثر کچھ حریف سیاسی پارٹیاں بن گئی تھیں جن کے ممبروں کو ملک کے مفاد سے زیادہ اپنے ذاتی مفاد کا خیال رہتا تھا، اور عوام تو سرے سے ملکی سیاست ہی سے نا آشنا تھے۔ رضا شاہ نے برسر اقتدار آنے کے بعد ان غرض مند پارٹیوں کو توڑ ڈالا جو حقیقتاً

ملک کو فائدہ کی بجائے نقصان پہونچا رہی تھیں، اور ذاتی مفاد کی خاطر عوام کو گمراہ کر رہی تھیں، اسی کے ساتھ انھوں نے ایران کی ایک سیاسی پالیسی منتخب کرلی۔

ظاہر ہے کہ اپنی مقرر کردہ سیاسی پالیسی پر کامیابی سے عمل کرنے کے لئے ضروری تھا کہ ملک کا نظم و نسق بھی براہ راست رضا شاہ کے ہاتھ میں ہوتا۔ چنانچہ اس وقت بھی رضا شاہ حکومت ایران کے ہر شعبے میں اسی لئے دخیل نظر آتے ہیں۔ ملک کے انتظام پر ان کی ذاتی نگرانی قائم رہے اور غرض پرستوں کو یہ موقع ہی نہ مل سکے کہ اپنی سازشی چالوں سے وہ حکومت کی پالیسی کو کسی شعبے میں بھی نقصاں پہونچا سکیں۔

جن صاحب اثر ایرانی امراء، وزراء اور رؤساء کو رضا شاہ نے اپنے عہد حکومت میں سخت سے سخت سزا دی ہے یا جنھیں مقدمہ چلائے بغیر جیلوں میں بھر دیا ہے وہ ایسے ہی افراد تھے جن سے امن عامہ میں خلل پڑنے اور ملک کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ تھا۔

ایران ہمیشہ سے ایک سازشی ملک سمجھا جاتا ہے۔ یہاں امراء و روساء اپنے اپنے ذاتی اقتدار کی خاطر ہمیشہ ریشہ دوانیاں کرتے چلے آئے ہیں۔ یہ ریشہ دوانیاں قاچاریوں کے عہد میں اسقدر بڑھ گئی تھیں کہ جب تک انتہائی سختی اور بے رحمی سے ان کے خلاف جہاد نہ کیا جاتا یہ ایران سے دور نہ ہو سکتی تھیں، اور جب تک یہ ایران سے دور نہ کی جاتیں ایران میں کوئی سیاسی اور معاشی اصلاح کامیاب نہ ہو سکتی۔ اور نہ سارا ملک ایک مرکز پر متحد ہو سکتا تھا۔

رضا شاہ اگر ملک کی اس خرابی کو آہنی سختی اور درشتی سے دور نہ کرتے تو ملک میں کبھی صحیح معنوں میں ایک دستوری حکومت کے قیام کا امکان نہ تھا۔ لیکن اب

اس کا امکان ہے کہ جب ایران کے عوام اور تعلیمی شاہ کی متعینہ پالیسی سے واقف ہو جائیں گے اور اپنے مفاد اور مضرات کو سمجھنے لگیں گے تو ان میں سلیقہ پیدا ہو جائیگا، شاہ کی گرفت بھی ملک کے نظم و نسق پر سے ڈھیلی ہو جائے گی اور ملک کے محب وطن اہل الرائے کو یہ موقع مل جائے گا کہ وہ اپنی "تربیت یافتہ" مرضی اور ارادہ کے ماتحت شاہ کے زیر سایہ ایران پر حکومت کریں اور ملک کے حالات کے پیش نظر جتنی چاہیں سیاسی پارٹیاں بنالیں۔ رائے عامہ کے پختہ ہونے کے بعد سیاسی پارٹیوں کا قیام یقیناً مفید ثابت ہوگا۔ لیکن جب تک رائے عامہ پوری طرح تربیت حاصل نہ کرے ایسی پارٹیوں کا وجود ملک و ملت کے لئے بجائے فائدے کے نقصان دہ رہے گا۔ اور یہی پالیسی اس وقت شاہ کی ہے۔

یہ تقریباً وہی دلیل ہے جو ترکی میں کمال اتاترک کے حمایتیوں کی طرف سے ان کے سیاسی حریفوں کے مقابل پیش کی گئی تھی اور اس میں شک نہیں اس دلیل میں کافی وزن بھی ہے، لیکن غالباً ایران پر یہ پوری طرح چسپاں نہیں ہو سکتی، اس لئے کہ ایران اور ترکی کے نتائج انقلاب میں بڑی حد تک یکسانیت کے باوجود ان کی نوعیت میں اختلاف ہے۔

ایران میں رضا شاہ نے سلطنت کی کمزوریوں کو دور کر کے ملک کے حالات کی اصلاح کی تھی اور اکثر شعبوں میں محض لیپا پوتی سے کام لیا تھا لیکن ترکی میں اتاترک نے صحیح معنوں میں انقلاب پیدا کر دیا اور ترکوں کی زندگی کے ہر شعبے کو اپنے بنائے ہوئے نقشہ کے ماتحت، از سر نو تعمیر کیا۔

ترکی ایک مفتوح ملک تھا اسکی سیاسی انفرادیت فنا ہو چکی تھی، اس کی صدیوں کی مذہبی اور وطنی حکومت کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ متواتر اندرونی شورشوں

اور بیرونی حملوں میں اسکی حیات اجتماعی پارہ پارہ ہو چکی تھی۔ ان انتہائی مایوس کن حالات میں کمال اتاترک ترکی کے اسٹیج پر نمودار ہوئے اور خود ترکوں نے اس امنڈتے ہوئے سیلاب میں ان کی ذات کو اپنا سہارا بنالیا۔

برخلاف اس کے ایران قاچاریوں کی بے اعتدالیوں اور عیش پرستیوں کا کاشکار تھا۔ مغربی اقوام کے لئے چراگاہ بن گیا۔ سلطنت میں ضعف پیدا ہو جانے کے باعث اندرونی سازشوں اور شورشوں کا مرکز ہو گیا تھا جب رضا شاہ نمودار ہوئے۔ ان حالات سے رضا شاہ نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ ہر اصلاحی اقدام کے ساتھ ملک میں اپنا اقتدار بڑھایا تا آنکہ تخت نادری پر اپنے لئے جگہ بنالی۔

ڈکٹیٹر کمال اتاترک بھی تھے اور رضا شاہ بھی ہیں۔ لیکن کمال اتاترک نے ترکی کو اپنی مرضی اور اپنے ارادہ پر چلانے کے باوجود رائے عامہ کی تربیت کا ہمیشہ خیال رکھا اور ملک کو ایک خاص نقطہ پر پہونچا کر اسے خود اپنا نیک و بد سوچنے اور سمجھنے کی آزادی دیدی۔ لیکن ایران میں رضا شاہ نے رائے عامہ کی تربیت کا مطلق لحاظ نہیں رکھا بلکہ وہ سارے وسائل ختم کر دیئے جن سے رائے عامہ کی تربیت ہو سکتی تھی، اور یہی در اصل رضا شاہ کے عہد حکومت پر سب سے بڑا اعتراض ہے جسے رضا شاہ کے دشمن ہمیشہ اس کے خلاف اچھالتے رہتے ہیں

یہ فی الحقیقت رضا شاہ کی کمزوری ہے۔ لیکن یہ صرف رضا شاہ کی ذات کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ اس کمزوری کا براہ راست تعلق مشرقی بادشاہی کے ساتھ ہے۔ رضا شاہ کا صرف اتنا قصور ہے کہ انھوں نے بادشاہ ہو جانا پسند کیا جس کے ساتھ مشرقی بادشاہوں کی یہ روایتی کمزوری بھی ان کے حصہ میں آگئی۔ ورنہ اگر رضا شاہ کمال اتاترک کی طرح اپنی قوم کے جس کی بیداری میں ان کا زبردست ہاتھ ہے صرف لیڈر رہنے پر قناعت کرتے تو نہ یہ کمزوری ان میں سرایت کرتی

اور نہ ان کے مخالفوں کو اس زاویہ سے انکی ذات پر حملہ کرنے کی جرأت ہوتی۔

جس طرح ترکی اور ایران کے انقلاب کی نوعیت میں اختلاف ہے اسی طرح اتاترک اور رضا شاہ کی شخصیتوں میں بھی فرق ہے۔

اتاترک ترکی کے مفاد کی خاطر قدیم مذہبی منصب خلافت کا خاتمہ کر دیتے ہیں اور ترکی کے قدیم شاہی خاندان آل عثمان کو ترکی حدود سے نکال دیتے ہیں۔ اس موقع پر سارے عالم اسلام کی طرف سے ان پر زور پڑتا ہے کہ وہ خود خلیفہ اور سلطان ہونے کا اعلان کر دیں، اور اس طرح اس صدیوں کی مذہبی روایت کو ترکی میں زندہ رکھیں، لیکن اتاترک ذاتی اعزاز و اقتدار کی ان ترغیبات سے بالکل بے اثر رہتے ہیں، اور اس منصب کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیتے ہیں جو ان کے نزدیک محض خیالی تھا، جس کا نہ کوئی فائدہ ہے۔ نہ مفہوم، اور نہ جسکے دُنیا میں باقی رہنے کا کوئی سبب ہے نہ ضرورت، حالانکہ اس وقت ترکی میں جو حالات رونما تھے، ان کے پیش نظر یہ ان کے لئے بہت آسان تھا کہ اپنے خلیفہ ہونے کا اعلان کر دیتے۔ خود مسلمان بھی اس کو جمہوریہ ترکیہ سے زیادہ آسانی سے تسلیم کر لیتے، اور قدیم روایات کے مطابق اتاترک کے اس اعلان میں مضائقہ نہ سمجھتے۔ اس لئے کہ خاندان عثمانی کا بانی بھی پہلے محض ایک معمولی سردار تھا۔ اس لئے عثمانی سلطنت کی بنیاد اتاترک کی طرح اپنے دست بازو کی قوت پر رکھی تھی۔ اس خاندان کا زمانہ ختم ہوا اس کی جگہ آسانی سے آل کمال لے سکتے تھے۔

رضا شاہ بھی ایران کے مفاد کو پیش نظر رکھ کر ایران کے قدیم خاندان قاچار کے آخری فرمانروا کو حدود ایران سے باہر کر دیتے ہیں۔ لیکن اس طرح کہ قاچاریوں کے سجادے پر خود متصرف ہو جاتے ہیں، اور وہ سب طمطراق جائز رکھتے ہیں، جو اس سجادے کے ساتھ مخصوص ہیں اور جن سے

تربیت یافتہ دُنیا کو اب کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی ہے، یہی وجہ ہے کہ اتاترک کے مخالفوں میں وہ رجعت پسند نظر آتے تھے جن کے خمیر میں سلطنت پرستی داخل تھی اور جو جمہوریت کے مخالف تھے اور رضا شاہ کے مخالفوں میں وہ افراد ہیں جن میں روشن خیالی پائی جاتی ہے اور جو مشرقی طرز کی بادشاہت کو پسند نہیں کرتے۔

رضا شاہ کی بادشاہت قبول کر لینے کے متعلق ایک یہ عذر پیش کیا جاتا ہے کہ ایران کے مجتہدوں نے قیام جمہوریت کی مخالفت کی تھی ورنہ رضا شاہ نے اپنی طرف سے تو یہی چاہا تھا کہ ایران میں جمہوریت قائم کر دیں اور خود ایرانی جمہوریہ کے صدر بن جائیں۔

ایران میں چونکہ اکثریت شیعوں کی ہے اور خود رضا شاہ بھی مذہباً شیعہ ہیں اس لئے اس معاملہ میں شیعہ مذہب کے احکام ماننا ان کا فرض تھا جن کی رُو سے امیر منتخب نہیں ہوا کرتا بلکہ مامور من اللہ ہوتا ہے۔ چنانچہ رضا شاہ نے ایران میں جمہوریت قائم کرنے کا ارادہ کیا تھا تو یہی بحث پیدا ہوئی اور مجتہدین نے یک زباں ہو کر اس ارادہ کی مخالفت کی اور مہینوں کے غور و خوض کے بعد رضا شاہ کو ملکی اور ملی خدمات کے صلے میں ایران کی بادشاہت پیش کر دی گئی، اور اس معاملہ میں ایران کے عوام بھی اس گروہ کے ساتھ ہو گئے۔ ان حالات میں رضا شاہ کے لئے اس کے سوا چارہ نہ رہا تھا کہ ایرانیوں کی اس متفقہ پیشکش کو قبول کر لیں اور اپنے ملک کو تباہ ہونے سے بچا لیں۔

اس عذر میں یقیناً کلام کی بڑی گنجائش موجود ہے لیکن اگر ہم اسے بجنسہٖ تسلیم

بھی کرلیں تب بھی رضا شاہ کی یہ کمزوری نمایاں نظر آتی ہے کہ اُنھوں نے اپنی بادشاہت سے ایران کی رائے عامہ کی تربیت کا کام نہیں لیا۔ بلکہ اسے اپنے اقتدار کا وسیلہ بنالیا۔

اس میں شک نہیں کہ ایران نے ظاہری حیثیت سے اس وقت جو ترقیاں کی ہیں اور سیاسی اور معاشی حیثیت سے ایشیا میں جو مرتبہ اس نے حاصل کرلیا ہے وہ یقیناً قابلِ رشک ہے اور رضا شاہ کے احساس وطنیت پر دلالت کرتا ہے لیکن اگر اس کے ساتھ رائے عامہ کی تربیت بھی جاری رہے اور ایران کے اہل رائے طبقے کو یہ موقع ملے کہ وہ اپنے وطن کی بہبودی اور بہتری کے لئے آزادی اور ذمہ داری کے ساتھ اپنے ضمیر اور خیال کا اظہار بھی کرسکیں تو پھر یقیناً ایران کی موجودہ ترقیات میں کوئی بات قابل گرفت نہ رہے۔

رضا شاہ کی ذاتی کمزوریوں میں ایک کمزوری اور قابل ذکر ہے، جس کا ان کے مخالف بہت چرچا کرتے ہیں اور وہ یہ کہ رضا شاہ بے انتہا حساس اور مشتعل مزاج واقع ہوئے ہیں۔ ان کی اشتعال پذیری کے واقعات کثرت سے ان کی نجی زندگی میں بھی نظر آتے ہیں۔

نجی زندگی کے واقعات میں "قم" کا صرف وہ واقعہ پیش کردینا کافی ہے جس کا ہم نے پچھلے اوراق میں ذکر کیا ہے۔ یہ واقعہ اس طرح تھا کہ رضا شاہ کی ملکہ زیارت کے لئے قم گئی تھیں۔ اثناء زیارت میں ملکہ نے منہ سے نقاب اُلٹ دی وہاں کے مجتہد صاحب کو ملکہ کی یہ حرکت بُری معلوم ہوئی۔ اُنھوں نے ملکہ کی اس حرکت پر مذہبی ایک طویل تنقید کرڈالی۔ چنانچہ رضا شاہ کو مجتہد صاحب کی

اس جسارت کا علم ہوا تو رضا شاہ بہ نفسِ نفیس "قم" پہنچے اور اپنے ہاتھ سے ان مجتہد صاحب کو سزا دی۔

سرکاری حیثیت سے رضا شاہ کی اشتعال پذیری کے ثبوت میں واشنگٹن کا وہ واقعہ پیش کیا جاتا ہے۔ جو ایرانی سفیر کو پیش آیا تھا اور جس کے بعد ایران اور امریکہ کے سیاسی اور تجارتی تعلقات بھی منقطع ہو گئے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ واشنگٹن کا ایرانی سفیر "میری لینڈ" میں مقررہ رفتار سے زیادہ تیزی سے موٹر چلاتا ہوا پکڑا گیا، اور امریکن قانون کے مطابق عدالت نے اس پر جرمانہ کر دیا۔ شاہ کو جب اس واقعہ کا علم ہوا تو شاہ نے فوراً اپنے سفیر کو واشنگٹن سے طلب کر لیا اور امریکہ سے سارے سیاسی اور تجارتی تعلقات منقطع کر لئے۔

اس واقعہ کا حوالہ دیتے ہوئے نیویارک کے ایک اخبار نے ایرانیوں کی خواہ مخواہ اشتعال پذیری کا مذاق اڑایا۔ بادشاہ کو اس صحافتی مذاق کی برداشت کہاں تھی، اس کے جواب میں شاہ نے ایران میں امریکہ کے ڈاک کے حقوق ضبط کر لئے۔

فرانس کے ایک اخبار کو جو چہل سوجھی تو اس نے اپنی ایک اشاعت میں شاہ کا کارٹون بنا ڈالا۔ شاہ نے اس کا اس قدر برا مانا کہ فوراً فرانس سے اپنا سفیر واپس طلب کر لیا۔ اور حکومت فرانس سے جواب طلب کئے بغیر تعلقات منقطع کرنے کا اعلان کر دیا۔

رضا شاہ کی انہی اشتعال پذیریوں کے باعث یورپ میں ان کے متعلق یہ رائے قائم کر لی گئی ہے کہ یہ کسی قدر غیر متوازن دماغ کے آدمی ہیں اور تدبر اور مصلحت اندیشی ان میں کم ہے۔

رضا شاہ کی ذاتی کمزوریوں پر یہ تنقید ہم نے ۱۹۳۹ء میں لکھی تھی جب ان

کتاب کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا تھا۔ اگرچہ ہمیں خود بھی افسوس تھا کہ ایک مسلم حکمران کے متعلق ہمیں یہ ناگوار فرض ادا کرنا پڑا لیکن اس کے ساتھ یہ ڈھارس بھی تھی کہ ہم نے رضا شاہ کی قلمی تصویر بنانے میں کہیں مبالغہ یا جانبداری کو راہ نہیں دی ہے۔ چنانچہ بعد کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ رضا شاہ اور ان کے طرز حکومت کی کمزوری پر ہم نے جس انداز سے نظر ڈالی تھی وہ حقیقت سے دور نہیں تھا۔ اپنی حکومت اور اپنی ذات کی انہی کمزوریوں کی بدولت بالآخر رضا شاہ کو تخت چھوڑنا اور ایران میں ایک اور انقلاب دیکھنا پڑا۔ جو یقیناً ان کی حمایت میں نہ تھا بہر حال اس وقت جبکہ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن پبلک میں پیش ہو رہا ہے، رضا شاہ کی لائف کو مکمل کرنے کی خاطر ایران کے اس نئے انقلاب کا مختصر سا حال بیان کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ستمبر ۱۹۳۹ء میں یورپ کی دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہوا۔ ابتداً جرمنی اور اٹلی کے خلاف برطانیہ اور فرانس کا فوجی اتحاد تھا لیکن کچھ دنوں کے بعد فرانس شکست کھا گیا، اور برطانیہ جرمنی اور اٹلی سے نبٹنے کے لئے اکیلا رہ گیا۔ اگرچہ برطانیہ اور فرانس کے اتحاد میں ترکی بھی شامل تھا لیکن اس نے کامیابی کے ساتھ اپنی غیر جانب داری برقرار رکھی۔ روس جرمنی کا دوست تھا اور تقریباً دو برس تک دوست رہا لیکن یونان اور یوگوسلاویہ کی شکست کے بعد مشرق قریب کی طرف پیشقدمی میں روس کی تازہ دم فوج جرمنوں کی راہ میں روک ثابت ہوئی اور ہٹلر نے دوستانہ معاہدے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے جولائی ۱۹۴۱ء میں روس پر چڑھائی کر دی۔

روس پر جرمنوں کی چڑھائی سے یورپ کی جنگ کا نقشہ بدل گیا۔ برطانیہ

اور روس میں مضبوط فوجی سمجھوتہ ہو گیا اور امریکہ نے ان دونوں ملکوں کو اُدھار اور پٹہ پر زیادہ سے زیادہ فوجی سامان بھیجنے کا وعدہ کر لیا۔

اس نوبت پر امریکہ کے سامان کو روس کے محاذ تک پہنچانے کا سوال پیدا ہوا۔ ولاڈی وسٹاک "کا راستہ جھگڑے کا تھا ہر وقت جاپان کے اُلجھ پڑنے کا خطرہ رہتا تھا اسلئے "آرچ انجیل" کا راستہ پسند کیا گیا اور برطانوی امداد روس تک پہنچانے کے لئے خلیج فارس سے براہ "ایران" قفقاز پہنچا دینے کی تجویز سوچی گئی۔ اس تجویز کے مطابق حکومت برطانیہ اور حکومت روس کے لئے یہ ضروری تھا کہ رضا شاہ سے گفتگو کرتے لیکن صورت حال یہ تھی کہ جرمن پہلے ہی ایران میں اپنا اثر جما چکے تھے عراق میں برطانیہ کے خلاف فوجی شورش کی ناکامی کے بعد ایران ان کی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا تھا اور رضا شاہ پر اثر ڈال کر انھیں برطانیہ اور روس کے خلاف اُبھار دیا تھا۔ حکومت برطانیہ اور روس کے لئے یہ صورت حال خطرناک تھی ان دونوں حکومتوں نے پہلے دوستانہ انداز میں رضا شاہ سے گلا کیا اور ان سے خواہش کی کہ وہ ایران سے ان سب جرمنوں کو نکال باہر کریں جنھیں جرمن سفارت خانے سے تعلق نہیں ہے تاکہ ایران میں برطانیہ اور روس کے خلاف کوئی نئی شورش نہ پیدا ہو۔ لیکن رضا شاہ نے برطانیہ اور روس کی اس خواہش کو ٹال دیا اور جرمنوں کو ایران سے باہر نکال دینے پر راضی نہ ہوئے۔ تقریباً تین مہینے کی گفت و شنید کے بعد جب روس اور برطانیہ کو یہ یقین ہو گیا کہ شاہ ایران کی اس ضد سے نازیوں کی سازش چھتہ کو ایران میں نشو و نما پانے کا موقع مل رہا ہے تو انھوں نے متحد ہو کر ایران کی سرحدوں میں فوجیں داخل کر دیں۔ روسی فوجیں قفقاز کی سرحد سے ایران میں داخل ہوئیں۔ اور برطانوی فوجیں خلیج فارس

کے قائم کردہ معیار پر پوری اُتر سکتی ہے۔ لیکن اس کی معاشی پوزیشن چونکہ نہایت مضبوط بنیادوں پر قائم ہے۔ اس لئے اس کشمکش اقتدار کے زمانہ میں بھی ایران ایک خوددار اور خود اعتماد سلطنت کا مرتبہ رکھتا ہے۔ جس سے دول یورپ بھی برابری کیساتھ سودا کرنے پر مجبور ہیں۔

دولِ عالم میں ایران کو یہ اعزاز و وقار بلاشبہ رضا شاہ کی ذات سے حاصل ہوا، اور یہ رضا شاہ کا اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ اس کے مقابل ان کی بڑی سے بڑی کمزوری بھی کوئی اہمیت نہیں رکھتی بلکہ ایران اور ایرانیوں پر رضا شاہ کا یہ اتنا بڑا احسان ہے کہ وہ کبھی بھی اس سے ادا نہیں ہو سکتے۔

بہرحال رضا شاہ اس صدی کے ان صفِ اوّل کے بڑے لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ جنھوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے اپنی قوموں کی قسمتیں پلٹ دیں اور انھیں قعر مذلت سے اُٹھا کر بام رفعت تک پہنچا دیا۔

وہ نقوش یقیناً تازہ رہیں گے، جو رضا شاہ نے ایران پر مرتسم کر دیئے ہیں۔ اور ایرانی تاریخ "پہلوی" عہد کی برکتوں کو ہمیشہ ہمیشہ اپنے صفحات میں محفوظ رکھیگی، جنھوں نے ایران کو از سر نو زندہ کر دیا۔

حصہ سوم

عراق و عرب

تعارف

عہدِ حاضر کے بڑے لوگوں کا یہ تیسرا حصہ ہے جس میں عراق و عرب کی دو مشہور شخصیتوں کا تعارف کرایا گیا ہے۔

امیر فیصل بن حسین عرب نقطۂ نظر سے ایک کامیاب شخصیت کا مالک ہے اس نے پہلے شام میں بعد کو عراق میں اپنی سلطنت قائم کی اور اس وقت بھی اس کا خاندان عراق میں حکومت کر رہا ہے۔

اس کے وہ "کارنامے" جو اس نے جنگ عظیم میں انجام دیئے تھے آج تک اردو میں جمع نہیں کئے گئے تھے۔ ہم نے اس حصہ میں انھیں پوری تفصیل کے ساتھ قلم بند کر دیا ہے، جگہ جگہ فیصل کے شریک غالب کرنل لارنس کی سرگرمیوں پر بھی روشنی ڈالی ہے اور آخر میں بغاوت عرب اور شریفیوں کی ذات کے متعلق غیر عرب اسلامی ممالک کا نقطۂ نظر بھی پوری دیانتداری کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔

عرب کی دوسری مشہور شخصیت ابن سعود کی ہے۔ اس نے اپنے دست بازو کی مدد سے جو کامیابیاں حاصل کیں اس حصے میں اختصار کے ساتھ ان کا ذکر ہے۔ لیکن ابن سعود کی ذاتی خوبیوں اور کمزوریوں پر بے لاگ تبصرہ کیا گیا ہے اور مغربی قوتوں کے متعلق اس نے جو پالیسی اختیار کر رکھی ہے اس پر بھی حقیقت کے سلسلہ روشنی ڈالی ہے۔ اسی کے ساتھ ابن سعود کی فتوحات اور

حکومت کے انتظام پر غیر وہابی اسلامی ممالک کا نقطۂ نظر بھی پوری وضاحت اور ایمانداری کے ساتھ پیش کر دیا گیا ہے۔

قارئین کے لئے ان دونوں کے حالات میں عبرت و بصیرت کا بہت کچھ سامان موجود ہے۔ توقع ہے کہ یہ حصہ بھی پہلے دو حصوں کی طرح دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

محمد مرزا دہلوی

امیر فیصل بن حسین الہاشمی

تحریک وحدت عربیہ کا علمبردار، نہایت ذہین اور مصلحت اندیش عرب سردار، جس نے جنگ عظیم میں اپنی قوم کی آزادی کے عوض مغربی قوتوں کے ہاتھ سلطنت عثمانی کا سودا کر ڈالا۔ اور ــــــــــــــــــــ

چھ سو برس بعد خلفاء عباسیہ کے سجادے پر تصرف حاصل کر لیا۔

غیر عرب اسلامی ممالک فیصل بن حسین اور اس کے کارناموں کو کسی اور زاویہ سے دیکھتے ہیں۔ لیکن عرب فیصل کو اپنا محسن اور قومی رہنما مانتے ہیں اس نے قومی آزادی کو عربوں کی منزلِ مقصود قرار دے کر ان میں نیا عزم اور نیا حوصلہ پیدا کر دیا۔ اور انھیں اس زمانہ کی مہذب اقوام کی مجلس اعلیٰ میں لا بٹھایا!!

حالات نے فیصل کو ابھارا اور فیصل نے ان سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

میدانِ حرب اور محفل سیاست ہر جگہ اس نے اپنی خداداد ذہانت اور طباعی کے جواہر دکھائے۔ لیکن میدانِ حرب سے زیادہ یہ محفلِ سیاست ہی میں چمکا جہاں یوروپ کے کہنہ مشق اور شاطر قسم کے سیاسی تاجروں سے اس کا واسطہ پڑا۔ فیصل نے ان سے بے جھجک سودا کیا اور ــــــــــــــــــــ

نفع میں رہا۔

فیصل، حسین ابن علی شریف مکہ کا تیسرا لڑکا تھا جو قبیلہ بنو ہاشم کا معزز

سردار اور حضرت علیؓ اور فاطمۃ الزہراؓ کے واسطے سے آنحضرت صلعم کی اولاد میں ہونے کے باعث سُنّی عقائد کے عربوں میں بے انتہا واجب التعظیم و احترام سمجھا جاتا تھا۔ لیکن شریف حسین چونکہ ابتدا ہی سے بے حد خود سر ضدّی اور جاہ طلب واقع ہوا تھا اور طبعاً نہایت جوشیلا اور مغلوب الغضب قسم کا انسان تھا اس لئے سلطان عبدالحمید کے عہد میں شریف مکّہ ہوتے ہی اس نے اطراف و جوانب کے عرب قبائل پر اپنی امارت کا سکّہ بٹھانا شروع کر دیا۔ اور چونکہ ترکوں سے اسے ہمیشہ سے نفرت تھی اس لئے جہاں موقع ملا عربوں کو ترکوں کے خلاف اُبھارا اور جگہ جگہ شورشیں برپا کرا دیں۔

عبدالحمید کو جب شریف حسین کی ان سرگرمیوں کا علم ہوا تو اس نے شریف حسین کو علانیہ سزا دینے کے بجائے یہ کیا کہ شریف حسین اور اس کے سارے خاندان کو قسطنطنیہ بلا کر نظر بند کر دیا۔

شریف حسین قسطنطنیہ میں اٹھارہ برس سلطان کا "مہمان" رہا اور ۱۹۰۸ء کے ترکی انقلاب کے بعد جب نوجوان ترکوں نے عبدالحمید کو معزول کر دیا تو اس کو بھی مکّہ جانے کی اجازت مل گئی۔

فیصل ۱۸۸۷ء میں مکّہ میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تربیت اس کی قدیم خاندانی روایت کے بموجب ایک بدوی قبیلے میں ہوئی۔ لیکن چھ برس کی عمر میں فیصل اپنے خاندان کے ساتھ سلطان عبدالحمید کے حکم سے قسطنطنیہ چلا گیا اور وہیں اسکی تعلیم و تربیت مکمل ہوئی۔

فیصل ابتدا ہی سے نہایت ذہین اور طباع لڑکا تھا۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد اس نے ترکی کے محکمہ فوج اور سلطان کے محکمۂ خاص میں ملازمت کی اور ترقی کرتے کرتے سلطان عبدالحمید کا پرائیویٹ سکریٹری بن گیا۔

یکم جولائی ۱۹۰۸ء کو انجمن اتحاد و ترقی کے ممبروں نے یکایک سلطان عبدالحمید کے خلاف بغاوت کر دی اور دستوری حکومت کا اعلان کر دیا۔ فیصل اور اس کے والد شریف حسین نے سلطان کے خلاف اس بغاوت میں پوری سرگرمی سے حصّہ لیا اور سلطان عبدالحمید کو معزول کرنے میں نوجوان ترکوں کی مدد کی۔

عبدالحمید کی معزولی کے بعد نوجوان ترکوں نے شریف حسین کو مکہ جانے کی اجازت دیدی اور وہ اپنے سارے خاندان کے ساتھ جس میں فیصل بھی شامل تھا قسطنطنیہ سے مکّہ آ گیا۔ لیکن اسی دوران میں اسے یہ تجربہ ہوا کہ نوجوان ترکوں کی حکومت عبدالحمید سے زیادہ سخت اور بے اصول ہے۔ کیونکہ یہ نوجوان نسلی تعصب بھی رکھتے تھے، اور ترکوں کے مقابلہ میں غیر ترکوں کی ان کے نزدیک کوئی وقعت نہیں تھی۔ شریف حسین نوجوان ترکوں کے اس تعصب سے بہت ہی متنفر ہو گئے اور ترکوں سے نفرت کا جو جذبہ مدّت سے اسکے قلب و دماغ میں پرورش پا رہا تھا وہ ابھر آیا۔ مکّہ پہونچکر شریف حسین نے عرب قبائل میں پھر سے اپنا اقتدار بڑھانا شروع کر دیا، اور اب کے ایک آزاد عرب سلطنت کے قیام کے لئے اس نے انگلستان سے نامہ و پیام شروع کیا، اور ان کوششوں میں اس کے چاروں لڑکے بھی اس کے شریک تھے۔ لیکن یہ ساری کوششیں انتہائی رازداری سے جاری رکھی گئیں تاکہ وقت سے پہلے ترکوں کو عربوں کے ارادوں کا علم نہ ہو سکے۔

۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ ابتداً ترک غیر جانبدار رہے لیکن کچھ ہی دنوں بعد جرمنی اور آسٹریا کے ساتھ یہ بھی جنگ میں کود پڑے۔ ترکوں کے اعلان جنگ کے ساتھ ہی انگریزوں نے نہر سوئز اور خلیج فارس

کی عربی اور عراقی بندرگاہوں کو گھیر لیا۔ اور قط الامارا پر اپنی فوجیں اُتار دیں۔
لیکن اس جگہ انگریزوں کو ترکوں اور عراقیوں کی فوجوں نے شکست فاش
دی اور ساری برطانوی فوج کو مع جنرل کے گرفتار کر کے قسطنطنیہ بھیج
اس شکست کا بدلہ لینے کے لئے انگریزوں نے مصر اور مالٹا سے ا پ
زبردست جنگی بیڑا بھیجا۔ اب کے ترکوں کو شکست ہوئی اور انگریزوں نے
قط الامارا پر قبضہ کر لیا۔

اسی کے ساتھ برطانیہ نے عربوں کو بھی ترکوں کے خلاف اُبھارنا شروع کیا
چنانچہ ۳۱ر اکتوبر ۱۹۱۴ء کو برطانوی افواج کے کمانڈر انچیف لارڈ کچنر نے شریف حسین
کے منجھلے لڑکے شریف عبداللہ کو تار بھیجا :-

جرمنی نے ترکی حکومت کو سونا دیکر خرید لیا ہے۔ حالانکہ انگلستان، فرانس
اور روس نے ترکی سے یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر ترکی اس جنگ میں غیر جانبدار
رہے تو اسکی سلطنت جنگ سے محفوظ رہے گی۔ اسی کے ساتھ ترکی
حکومت نے سلطان کی مرضی کے خلاف مصر کی سرحد پر حملہ کر دیا ہے
اگر عرب قوم اس جنگ میں برطانیہ کا ساتھ دے تو برطانیہ یہ ضمانت کرتی
ہے کہ عرب میں کوئی قوت مداخلت نہ کر سکے گی اور برطانیہ بیرونی حملے
سے عرب کو بچائے گی۔

شریف حسین نے برطانیہ کے اس پیغام کا فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔ اس
لئے کہ قط الامارا پر برطانیہ کی شکست کے بعد شریف حسین کو ترکوں کے خلاف
جنگ شروع کرنے میں تامل ہو گیا تھا، لیکن برطانیہ کی طرف سے جب
مسلسل زور پڑا اور جنگ کے حالات میں بھی کچھ تبدیلی ہو گئی تو بالآخر
شریف حسین برطانیہ سے سودا کرنے پر راضی ہو گیا اور جولائی ۱۹۱۵ء میں

شریف حسین نے مصر کے ہائی کمشنر سر ہنری میک ماہن کے پاس اپنی شرائط پیش کر دیں۔

"حکومت برطانیہ عربوں کی آزادی کی جنگ میں پوری طرح مدد کرے۔ اور عدن کو چھوڑ کر ایشیا کے جنوب مغرب کی سارے عربی بولنے والے علاقے کو آزاد عرب علاقہ تسلیم کرے"۔

ابتداً سر ہنری میک ماہن نے شریف حسین کی یہ شرط منظور نہیں کی لیکن جب وقت گذرتا گیا اور حالات کا تقاضا یہ ہوا کہ عرب میں فوراً ترکوں کے خلاف بغاوت کرائی جائے تو عرب علاقہ کی سرحدات کی بحث کو ختم کر دیا گیا، اور میک ماہن نے بظاہر شریف حسین کی شرط کو تسلیم کر کے انھیں ترکوں کے خلاف فوراً بغاوت کرنے کی ہدایت کی۔ اور اس ہدایت کے ساتھ بہت سے اسلحہ اور دس ہزار پونڈ شریف عبداللہ کے لئے بھیجے اور وعدہ کیا کہ بغاوت کے شروع ہوتے ہی پچاس ہزار پونڈ شریف حسین کی خدمت میں بھیجے جائیں گے، اور برطانوی جنگی جہاز نہر سوئز کی بندرگاہوں سے عرب فوجوں کی پیش قدمی میں مدد کریں گے، اس وعدے وعید کے ساتھ سودا ختم ہوا اور شریف حسین نے ترکوں کے خلاف پوری سرگرمی سے بغاوت کی تیاریاں شروع کر دیں۔

اعلان جنگ کے بعد ترکی حکومت نے شریف حسین کو یہ حکم بھیجا تھا کہ وہ حجاز میں ترکوں کی امداد کے لئے فوجیں اکٹھی کرے۔ شریف حسین اور اس کے لڑکوں نے اس حکم سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور حجاز کا دورہ کر کے بجائے ترکوں کی حمایت میں فوجیں بھرتی کرنے کے قبائل کو ترکوں کے خلاف شریف حسین کے جھنڈے کے نیچے متحد کرنا شروع کر دیا۔

سنہ ۱۹۱۵ء میں جب عرب میں ترکوں کے خلاف بغاوت کا سارا سامان لیس ہو چکا تو شریف حسین نے فیصل کو شام بھیجا۔ بظاہر اس لئے کہ شام کے ترکی گورنر اور کمانڈر جمال پاشا کو اپنی وفاداری اور امداد کا یقین دلائے اور بباطن اس لئے کہ شامی قبائل کو ترکوں سے توڑے اور عرب بغاوت کا راستہ شام تک ہموار کر دے۔ فیصل نے یہ کام بڑی خوبی سے کیا۔ دمشق پہونچکر وہ جمال پاشا کا مہمان ہوا اور اسے یقین دلادیا کہ ترکوں کی امداد کو حجاز میں ایک زبردست لشکر تیار کیا جارہا ہے اور بباطن اس نے دمشق کے اکثر امراء اور سرداران قبائل کو ترکوں سے توڑ لیا۔

دمشق میں ابھی فیصل کی سرگرمیاں جاری ہی تھیں کہ شریف حسین نے فیصل کو اطلاع دی کہ اس نے عرب کے بہت سے قبائل کو اپنے جھنڈے کے نیچے جمع کر لیا ہے اور یہ قبائل مدینہ کی ترکی چھاؤنی پر حملہ کرنے کے لئے بیچین ہو رہے ہیں۔ شریف حسین نے یہ اطلاع فیصل کو اس وقت دی جب شریف حسین اور برطانیہ کے درمیان سودا شروع ہو چکا تھا۔ اور برطانوی ہائی کمشنر سے عرب علاقہ کی سرحدات کے لئے گفتگو ہو رہی تھی۔ اس اطلاع کے ملتے ہی فیصل نے جمال پاشا سے عذر کیا اور مدینے جانے کی اجازت طلب کی، لیکن جمال پاشا نے یہ کہکر فیصل کو روک لیا کہ وہ اور انور پاشا دونوں فیصل کے ساتھ مدینے جائیں گے اور وہاں کے حالات اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے۔ یہ وقت فیصل کیلئے بہت سخت تھا۔ لیکن ان دونوں کے ساتھ سے وہ انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے شریف حسین کو فوراً اس نئی صورت حالات سے اطلاع دی۔ اور یہ ہدایت کی کہ جمال اور انور کی موجودگی میں کوئی بات بھی عربوں سے ایسی نہ ہونے پائے کہ ان کو ہم پر شبہ ہو سکے۔

کچھ دنوں بعد فیصل انور پاشا اور جمال پاشا کے ساتھ مدینہ پہونچا۔ شریف حسین کافی احتیاطی تدابیر اختیار کر چکا تھا۔ تقریباً پانچ ہزار عرب فوج نے ان ترکوں کے آگے جمع ہو کر اپنے کرتب دکھائے اور سرداران قبائل نے ترکوں کو اپنی کامل وفاداری کا یقین دلا دیا۔ انور اور جمال بظاہر اس مظاہرے سے بالکل مطمئن ہو گئے۔ لیکن رات ہوتے ہی فیصل کو ایک اور مصیبت کا سامنا کرنا پڑا اور وہ یہ کہ جمال جس محل میں ٹھیرے ہوئے تھے اس محل کو خفیہ طور پر چند عرب قبائل نے گھیر لیا اور ان کے سردار فیصل کے پاس یہ اجازت لینے پہونچے کہ ان دونوں ترکوں کا یہیں خاتمہ کر دیں۔ فیصل اس تجویز سے بہت گھبرایا اور جس طرح بھی ہو سکا اس نے اس وقت تو ان عرب سرداروں کو سمجھا بجھا کر رخصت کر دیا۔ لیکن خود انور اور جمال کو اس محل سے نکال کر اپنے گھر لے آیا اور اپنے کمرے میں ان دونوں کو سلا کر خود اس کمرے کے باہر رات بھر ان کی حفاظت کرتا رہا۔ صبح کو اس نے انور اور جمال کو بخیر و خوبی ریل پر سوار کرا دیا۔ اور خود بھی انھیں پہونچانے کے لئے دمشق تک ان کے ساتھ چلا گیا۔

فیصل کی یہ جسارت حقیقتاً حیرت انگیز تھی اس لئے کہ انتہائی کوششوں کے باوجود انور اور جمال کو یہ شبہ ہو گیا تھا کہ مدینے میں حالات بہتر نہیں، اور عرب جنگ میں ان کا ساتھ دینے کو تیار نہیں ہیں۔ اس شبہ کی موجودگی میں فیصل کا دمشق تک ان لوگوں کے ساتھ جانے کے یہ معنی تھے کہ فیصل نے اپنے آپ کو بالکل ان دونوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا کہ یہ چاہیں تو اسے قتل کر دیں یا دمشق پہونچ کر اسے قید کر دیں، اور اس طرح شریف حسین کو مجبور کر دیں کہ وہ اپنی باغیانہ سرگرمیوں سے دستبردار ہو جائے۔

لیکن انور اور جمال نے اس شبہ کے باوجود کہ عرب ہمارے ساتھ

چال کر رہے ہیں فیصل سے کوئی باز پرس نہیں کی۔ بلکہ دمشق پہونچکر اُنھوں نے مصلحتاً فیصل کو مدینے واپس جانیکی اجازت دیدی۔ اس فہمائیش کے ساتھ کہ وہ مدینے پہونچکر عربوں کو ترکوں کی حمایت پر آمادہ کرے اور جو قبائل ترکوں کے مخالف ہو گئے ہیں، انھیں رام کرلے۔

لیکن دوسری طرف اُنھوں نے مدینے کی ترکی چھاؤنی پر شام سے مزید کمک بھیجدی اور اس طرح عربوں کی بغاوت کو ابتدا ہی میں روک دینے کا سامان کرلیا۔

۱۹۱۶ء میں ترکوں کے خلاف عربوں کی تیاریاں مکمل ہوگئیں۔ اور دوسری طرف سرہنری میک ماہن اور شریف حسین کے درمیان معاملہ آخری طور پر طے ہو چکا، برطانوی ہتیار اور برطانوی روپیہ حجاز میں پہونچ چکا اور برطانوی جہاز عربی بندرگاہوں پر عربوں کی مدد کے لئے تعینات ہو چکے۔

شریف حسین نے ۹ر جون ۱۹۱۶ء کو ترکوں کے خلاف اعلان جنگ کردیا، اور اُسی دن طائف، جدّہ اور مدینہ کی ترکی چھاونیوں پر ایک ساتھ حملہ کردیا۔ طائف کی عرب فوج کی کمان شریف حسین نے اپنے ہاتھ میں رکھی۔ جدہ پر شریف عبداللہ کی ماتحتی میں فوج بھیجی اور مدینہ کی فوجوں پر فیصل اور علی کو متعین کیا۔

۱۳ر جون کو شریف حسین نے طائف کی چھاؤنی کو آسانی سے زیر کرلیا۔

۱۶ر جون کو جدّہ کی ترکی چھاؤنی بھی برطانیہ کے جہازوں کی مدد سے زیر ہوگئی۔ لیکن مدینہ میں فیصل اور علی کی فوجوں کو کامیابی نہیں ہوئی، مدینہ میں ترکوں کی سب سے بڑی فوجی چھاؤنی تھی۔ اور اس وقت یہاں ترکی کا مشہور

اور دلیر جنرل فخری پاشا کمانڈر تھا۔ فیصل کی بدوی فوجوں نے مدینہ پر بڑی بے جگری سے دو مرتبہ حملہ کیا لیکن دونوں مرتبہ ترکوں نے عربوں کے حملوں کو بُری طرح پسپا کردیا۔ اس مسلسل ناکامی کے بعد عربوں کے حوصلے پست ہو گئے، اور وہ مدینہ سے پچاس میل دور ہٹ آئے اور رابغ میں پڑاؤ ڈال دیا تاکہ ترکی فوج کو مکہ پہونچنے سے روک دیں۔

عرب میں یہ حالات تھے جب بدنامِ زمانہ ٹامس ایڈورڈ لارنس حجاز میں نمودار ہوا ———— لارنس مصر کی انگریزی فوج کے شعبۂ جاسوسی میں متعین تھا۔ ابتداءً پندرہ دن کی چھٹی پر جدّہ آیا تھا مگر بعد کو اپنی خوشی سے عرب میں رہ پڑا۔ لارنس کے پہونچنے سے پہلے جدہ پر امیر عبداللہ کا قبضہ ہو چکا تھا۔ جدّہ سے لارنس مدینے پہونچا اور اس وقت پہونچا جب فیصل فخری پاشا سے ٹکرا کر اپنی مایوس اور ناکام فوج کے ساتھ رابغ ہٹ آیا تھا۔ رابغ ہی میں فیصل اور لارنس کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ جس کے بعد جنگِ عظیم کے خاتمہ تک یہ دونوں ایک دوسرے سے جُدا نہ ہوئے۔

مدینہ سے عربوں کے ہٹتے ہی ترکوں کو ریل کے ذریعہ شام سے مزید کمک مل گئی۔ ہوائی جہاز، مشین گنیں، اور ٹینک بھی باغیوں کے مقابلہ کے لئے جمال پاشا نے فخری پاشا کے پاس بھیج دیئے۔ ترک اس کمک سے تازہ دم ہو کر رابغ کی طرف بڑھے: تاکہ فیصل کی فوج کا پوری طرح قلع قمع کر دیں۔ یہ وقت فیصل اور اس کی فوج کے لئے بہت نازک تھا۔ کھلے میدان میں عرب آلات جدید سے مسلح ترکوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ اور عربی فوج میں اس قدر قوت نہیں تھی کہ ترکوں کے بڑھتے ہوئے کالم کو روک سکے، اس نازک وقت

میں لارنس نے فیصل کی مدد کی۔ سب سے پہلے تو اُس نے رابغ اور مدینہ کے درمیان جسقدر قبائل تھے ان سب میں دورہ کیا اور انگریزی سونا اور انگریزی ہتیار اہل قبائل میں تقسیم کئے اس ہدایت کے ساتھ کہ مدینہ کے ترکی کالم سے گوریلہ وضع کی لڑائی چھیڑ دیں اور اس کے بعد اس نے دوسری تجویز یہ کی کہ مدینہ کی ترکی فوج کو اُلجھانے کے لئے تھوڑی سی عربی فوج زید بن حسین کی ماتحتی میں چھوڑ کر باقی فوج "ینبوع" اور "الوجہ" کے بندرگاہوں کی طرف روانہ کر دی، اور امیر عبداللہ کو یہ ہدایت بھیجی کہ الوجہ کے فتح ہوتے ہی وہ جدہ کے راستہ مدینہ کی ترکی فوج پر آپڑے اور اس طرح ترکی کالم کو مدینہ واپس آنے پر مجبور کر کے مدینہ میں محصور کرلے۔

ینبوع اور الوجہ کے بندرگاہوں پر فوراً قبضہ کر لینے کا مقصد یہ تھا کہ شام کے ترکی کیمپ سے مدینہ کی ترکی فوج کا رشتہ منقطع کر دیا جائے، اور اس طرح ترکی کالم کی مکہ کی طرف پیشقدمی روک کر اسے قلعہ بند ہوجانے پر مجبور کر دیا جائے چنانچہ اس تجویز کے ماتحت فیصل اور لارنس نے برق صفت تیزی سے ینبوع اور الوجہ کی بندرگاہوں پر حملہ کر دیا، اور دوسری طرف امیر عبداللہ کی فوجوں نے ترکوں پر مدینہ کے شمال سے یلغار کر دی اس دوطرفہ حملہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ مکہ کی طرف ترکی کالم کی پیشقدمی رُک گئی اور ترکوں نے مدینہ کی حفاظت کرتے ہوئے محصور ہوجانا پسند کر لیا۔

فیصل نے ینبوع اور الوجہ آسانی سے فتح کر لئے، اور ان بندرگاہوں کی فتح کے ساتھ ہی برطانیہ سے عربوں کا رشتہ زیادہ مضبوط ہو گیا، اس لئے کہ انہی بندرگاہوں کے ذریعہ برطانیہ نے فیصل کو ہتیاروں کی امداد دینی شروع کی، اور لارنس نے اطراف و جوانب کے قبائل کو فیصل کی حمایت میں آمادہ

کر کسان میں برطانوی روپیہ اور ہتیار تقسیم کرنے شروع کر دیئے۔ اس ترکیب سے چند ہی دنوں میں لارنس نے فیصل کے جھنڈے کے نیچے دس ہزار فوج جمع کر دی۔ ینبوع اور الوجبہ کی فتح کے بعد لارنس کے مشورے سے فیصل نے شام کی طرف رُخ کیا۔ شام کی سرحد پر "عقبہ" ترکوں کا ایک اور اہم بندرگاہ تھا۔ لارنس کے نزدیک عرب میں ترکوں کو پوری طرح بے بس کرنے کے لئے اس بندرگاہ پر قبضہ کرنا بھی ضروری تھا۔ چنانچہ ۱۸۔ جون ۱۹۱۷ء کو فیصل کی بدوی فوجیں الوجبہ سے عقبہ کی طرف روانہ ہوگئیں اور راستہ میں جو عرب قبائل ملتے گئے انھیں فیصل اپنے جھنڈے کے نیچے جمع کرتا گیا۔ عقبہ کی مہم کئی وجوہ سے اہم تھی ایک تو عقبہ کے فتح ہونے کے بعد حجاز میں ترکی کمک نہیں پہونچ سکتی تھی۔ دوسرے اس فتح سے حجاز کے عربوں کا شام کے عربی قبائل سے رشتہ جڑ جاتا تھا اور ان قبائل کو جنھیں فیصل اپنے دمشق کے دورانِ قیام میں ترکوں کے خلاف اُبھار آیا تھا۔ علانیہ ترکوں سے بغاوت کرنیکا موقع مل جاتا۔

یہ تجویز چونکہ عربوں کے حق میں بہت مفید نظر آرہی تھی اس لئے فیصل نے فوراً ہی الوجبہ سے شمال کی طرف کوچ کر دیا۔ منزلِ مقصود اگرچہ فیصل کی عقبہ ہی تھی لیکن ترکوں کو بھلاوے میں ڈالنے کے لئے اس نے چکر دار راستہ اختیار کیا۔ اور یہ وادی "شیراں" سے گذرتا ہوا ہیہ کے شمال میں نکلا، اور راستہ میں جگہ جگہ ریلوے لائن توڑتا گیا۔ جو ترکوں نے دمشق سے مدینے تک قائم کر رکھی تھی۔ مواب کے علاقہ میں پہونچکر فیصل نے اپنا رُخ معان کی طرف پھیر دیا۔ اور معان سے ۱۸ میل جانب مغرب ایک ترکی چوکی پر حملہ کرکے اس چوکی کے سارے ترک سپاہیوں کا قلع قمع کر ڈالا۔ جب معان کی ترکی چھاؤنی میں عربوں کے اس حملے کی اطلاع ملی تو ترکوں نے عربوں کی گوشمالی کے لئے ایک فوجی

کالم بھیجدیا ۔ جس وقت یہ ترکی کالم فیصل کی فوج کا تعاقب کرتا ہوا وادی الوالیث پہونچا تو فیصل کی فوج نے جو اس سے پہلے ہی اس وادی کی پہاڑیوں پر قابض ہوچکی تھی ترکی کالم کو سب طرف سے گھیر کر بندوقوں کا نشانہ بنانا شروع کردیا۔ اس جنگ میں عربوں کی تعداد اگرچہ کم تھی اور ترک کافی تعداد میں موجود تھے ۔ لیکن ترک اس وادی میں اس بُری طرح پھنس گئے تھے کہ ان کے جدید آلات اور ان کی کثرت تعداد بھی کام نہ آسکی ۔ اور سارا ترکی کالم دیکھتے ہی دیکھتے بدوؤں نے کاٹ کر رکھدیا۔

فیصل کی اس زبردست فتح سے عربوں کے حوصلے بڑھ گئے ، اور ترکوں میں بدحواسی پھیل گئی ۔عرب قبائل جوق جوق فیصل کے جھنڈے کے نیچے جمع ہونے لگے اور فیصل کو انھوں نے بے تکلف اپنا قومی رہنما اور سردار تسلیم کرلیا۔

وادی الوالیث میں فتح حاصل کرنے کے بعد فیصل کی فوجیں عقبہ کی طرف بڑھیں اور بغیر کسی لڑائی بھڑائی کے ۶۔ جولائی ۱۹۱۷ء کو عقبہ میں داخل ہوگئیں عقبہ کے ترک اور جرمن دستوں نے عربوں کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔

فیصل کی فوجوں نے عقبہ کو فتح کرلیا۔ لیکن اب ان کے پاس کھانے کو کچھ نہیں رہا تھا، اور نہ آگے پیشقدمی کرنے کے لئے مناسب ہتھیار تھے ۔فیصل نے برطانیہ سے مدد مانگی، لارنس عقبہ سے مصر پہونچا۔ اس وقت مشرق قریب کی برطانوی افواج کا کمانڈر انچیف جنرل الینبی تھا ۔ اس نے عقبہ کی فتح پر تو مسرت کا اظہار کیا اور عربوں کو مدد دینے پر بھی رضامندی ظاہر کردی۔ لیکن اس سلسلہ میں سوال یہ پیدا ہوا کہ عقبہ کی فتح کے بعد فیصل کی فوجوں کی پوزیشن کیا ہوگی ۔ کیونکہ عقبہ پر عرب کی سرحد ختم اور شام کی سرحد شروع ہوجاتی ہے، اور شام

اور فلسطین کی کمان چونکہ براہ راست جنرل البنی کے پاس ہے اس لئے فیصل کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ آیندہ جنرل البنی کی ماتحتی میں کام کرے اور اسی کی ہدایات پر عمل کرے۔ یہ سوال بہت ٹیڑھا تھا۔ لارنس بطور خود اس کا کوئی جواب نہ دے سکا۔ مصر سے ضروری امداد لیکر عقبہ واپس آیا اور یہاں اس نے فیصل سے اس بارے میں مشورہ کر کے شریف حسین کو اس نئی صورت حال کی اطلاع دی، لارنس کو اندیشہ تھا کہ شاید شریف حسین اس بات کو منظور نہ کرے گا کہ فیصل البنی کی ماتحتی میں کام کرے۔ لیکن شریف حسین جب عقبہ آیا تو فیصل اور لارنس نے کہہ سُنکر اس کو راضی کر لیا۔ چنانچہ اسی وقت سے فیصل کی فوجیں البنی کی نگرانی میں آگئیں اور برطانوی فوج کا داہنا بازو قرار پائیں۔

شریف حسین بہت چوکنا آدمی تھا۔ اسے برطانیہ کے اس وعدے پر ابتک شبہ تھا کہ جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد ممالک عربیہ کی آزاد انفرادیت تسلیم کر لی جائے گی۔

چنانچہ جس وقت لارنس نے شریف حسین کے آگے یہ تجویز پیش کی کہ فیصل کی فوجیں جنرل البنی کی ماتحتی میں چلی جائیں اور فیصل آیندہ جنرل البنی کی ہدایتوں پر عمل کرے تو شریف حسین نے دوبارہ اسی مسئلے کو اُٹھایا تھا اور برطانیہ سے اس کی طمانیت چاہی تھی کہ وہ جنگ عظیم کے بعد اپنا وعدہ پورا بھی کریگا۔ اس پر لارنس نے شریف حسین کو یہ زبان دی تھی کہ حکومت برطانیہ اگر کوئی وعدہ کر لیتی ہے تو اُس پر ہمیشہ قائم رہتی ہے، اور کسی حالت میں اس سے نہیں پھرتی۔

لارنس کے کہنے سُننے کا شریف حسین کو یقین آیا ہو یا نہ آیا ہو لیکن یہ واقعہ ہے کہ لارنس ہی کے یقین دلانے کے بعد شریف حسین نے اس کی منظوری

دیدی کہ فیصل کی فوجیں آیندہ سے جنرل ایلنبی کی ماتحتی میں رہیں اور برطانوی فوج کے ایک جزو کی حیثیت سے شام کی طرف پیش قدمی کریں۔

اب تک فیصل کو جس قدر فتوحات حاصل ہو چکی تھیں انہیں لارنس کی ذاتی "جاسوسانہ" قسم کی سرگرمیوں کو بڑا دخل تھا۔ یہ دبلا پتلا حقیر سا انسان عربی لباس پہنے ایک چھوٹی سی بدوی جماعت کو ساتھ لئے رات دن صحرا کے بدوی قبائل میں چکر لگایا کرتا تھا۔ ــــــــــــ کہیں شیوخ اور سرداران قبائل کو روپے کا لالچ دیتا۔ کہیں وحدت عربیہ کا واسطہ دیتا۔ کہیں آزادی عرب کا سبز باغ دکھاتا۔ کہیں لوٹ کے مال کا یقین دلاتا۔ غرض جس طرح بھی ہو سکتا۔ ان بدویوں کو ترکوں کے خلاف اور فیصل کی حمایت پر آمادہ کرتا چلا جاتا تھا۔ وحشی بدویوں کو رام کرنا آسان نہیں خاصکر ایسی صورت میں جبکہ اکثر ہمسایہ قبائل میں مدتوں سے آپس میں دشمنی چلی آتی ہو۔ لیکن لارنس کی شخصیت میں نہ معلوم کیا جادو تھا کہ اس نے نہ صرف ان قبائل کو رام کر لیا بلکہ ان کی عداوتوں کو ختم کر کے انھیں ترکوں کی دشمنی پر متحد کر دیا۔

بدوی قبائل میں چکر لگانے کے علاوہ لارنس نے اس کو بھی اپنا مشن بنا لیا تھا کہ جہاں موقع ملے ترکوں کی امدادی ریل گاڑیوں کو ڈائنامیٹ لگا کر اڑا دے اور جہاں پل نظر پڑے نیست و نابود کر دے۔ تار کے کھمبے اکھڑوا ڈالے غرض شام اور مدینہ کی ترکی فوجوں کے درمیان جسقدر ذرائع رسل و رسائل ہو سکتے تھے لارنس انھیں ایک ایک کر کے تباہ و برباد کرتا جاتا تھا۔ لارنس کی ان حرکتوں میں ایک طرف بدوی قبائل کی دلچسپی کا سامان تھا تو دوسری طرف ترکی فوجوں کے لئے بے پناہ مشکلات کا پیغام، اور دراصل ترکوں پر یہی دو طرفہ حملے تھے جن سے

عرب اور شام میں ان کے قدم اُکھڑے اور ایسے اُکھڑے کہ پھر ترکی سرحد سے قدم نہ جم سکے۔

عقبہ پر عربوں کے قابض ہو جانے کے باعث مدینہ کی ترکی فوجوں کی پوزیشن بہت کمزور ہو گئی تھی، اور خود شام میں ترکوں کو قدم جمانے مشکل ہو گئے تھے۔ اس لئے ترکوں نے عربوں کو عقبہ سے نکال باہر کرنے کی فوراً تدبیریں کرنی شروع کر دیں۔
عقبہ کے شمال میں ترکوں کی ایک زبردست چھاؤنی تھی "معاون" یہاں بہجت پاشا کی کمان میں سات ہزار کے قریب آلاتِ جدیدہ سے مسلح ترکی فوج پڑی ہوئی تھی۔ اس فوج نے عقبہ پر "گویرا" کے راستے چڑھائی کر دی اور "ابا اللسان" میں وادی موسیٰ کے دھانہ کا انتظام کر کے مورچہ بند ہو گئی۔
اس دوران میں عربی فوج بھی اپنی تھکن دور کر چکی تھی، ترکوں کے مقابلہ کو آگے بڑھی اور "پیٹرا" کے کھنڈروں میں خیمہ زن ہو گئی۔
برطانوی ہوائی جہازوں نے ترکوں پر بم برسانے شروع کئے، اور وادی موسیٰ کی پہاڑیوں پر سے چند چھپے ہوئے بدوی قبائل نے ترکوں کو زچ کرنا شروع کر دیا۔ بدوی حملے ترکوں کو دھوکا دینے کے لئے کئے گئے اور ان میں وہ کامیاب رہے۔
۲۱۔ اکتوبر کو ترکی فوجیں پیٹرا کی پہاڑیوں میں جمع ہوئیں۔ عربوں کی ایک چوکی نے ان کا مقابلہ کیا۔ وادی موسیٰ کے بدوی قبائل نے ترکوں کی صفوں میں ابتری ڈال دی۔ برطانوی ہوائی جہازوں نے بم برسائے اور ہلکے سے مقابلہ کے بعد عربی فوج بظاہر وادی موسیٰ کی طرف پسپا ہو گئی ترک جوش میں آگے بڑھے۔ وادی موسیٰ کی طرف، عربوں کی اصلی پوزیشن کو نظرانداز کر کے، دور

تک بڑھے چلے گئے ۔ یہ ترکوں کی بہت بڑی غلطی تھی، جس سے ترک زچ ہو گئے اور ترکی فوجیں تباہ و برباد ہو گئیں۔

جیسے ہی ترک وادی موسیٰ میں در آئے وادی کی ہر کھو اور پہاڑیوں کی سر چٹان سے ان پر گولیوں اور گولوں کا مینہ برسنے لگا۔ ترک گھِر گئے۔ لڑائی میں شکستِ فاش اٹھائی۔ بہت سے ترک عربوں کے ہاتھ سے بچے اور بہت سے گرفتار ہو گئے۔

ترکوں کی اس شکست کے بعد عقبہ پر عربوں کا قبضہ مضبوطی سے قائم ہو گیا اور مدینہ کی چھاؤنی کے ساتھ ترکوں کا فوجی رشتہ ٹوٹ گیا۔

عقبہ پر عربوں کی پیشقدمی کے دوران میں جنرل البنی کی فوجیں بحیرۂ روم کے کنارے کنارے فلسطین کے جنوب میں بڑھتی جا رہی تھیں اور جس وقت عربوں نے "بیزا" میں ترکوں کو شکست دی اس وقت جنوبی فلسطین کے اکثر شہر جنرل البنی کے قبضے میں آ چکے تھے۔

۲۸- اکتوبر ۱۹۱۷ء کو جنرل البنی نے جنوبی فلسطین کا اہم بندرگاہ "غزہ" فتح کر لیا۔ اور وہاں سے "بیر سبع" کی طرف بڑھا، اور معمولی مقابلہ کے بعد بیر سبع پر بھی قبضہ کر لیا۔

عربی اور برطانوی فوجوں کی متعدد یورش سے شام میں ترکی پوزیشن پر نہایت سخت دباؤ پڑ رہا تھا۔ اسی کے ساتھ ترکوں کی عربی فوجیں ایک ایک کر کے عربوں اور برطانیہ کی فوجوں سے ملتی جا رہی تھیں اور شام کے اکثر حصوں میں ترکوں کے خلاف علانیہ بغاوتیں ہونے لگی تھیں۔ خود ترکی فوج میں بد دلی اور مایوسی کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔

ان حالات کو دیکھ کر جرمن جنرل فاکن ہان نے جس کے پاس شام کی ترکی فوجوں کی کمان تھی ترکی حکومت کو یہ مشورہ دیا تھا کہ ترکی فوجیں فوراً ہی شام اور فلسطین سے ہٹالی جائیں۔ مدینہ کی چھاؤنی خالی کر دی جائے، اور دمشق کے شمال میں اناطولیہ کی سرحد سے قریب حلب پر ترکی مورچہ قائم کر دیا جائے۔ یہ بڑا قیمتی مشورہ تھا۔ اگر انور پاشا، وزیر جنگ جرمن جنرل کے اس مشورہ پر عمل کرتے تو نہ شام میں ترکوں کی فوجیں تباہ ہوتیں اور نہ برطانیہ اور فیصل کی فوجوں کو دمشق تک پیشقدمی کرنے کی جرأت ہوتی لیکن انور پاشا نے جنرل فاکن ہان کے اس مشورے کو نہ مانا اور عرب پیشقدمی کو "عمّان" پر اور البنی کو شرق اردن پر روکنے کا حکم دیدیا۔

فیصل کی فوجیں پٹرا کی فتح کے بعد سستا رہی تھیں اور جنرل البنی کی فوجیں بیرسبع فتح کر چکنے کے بعد بیت المقدس کی طرف کوچ میں مصروف تھیں۔ شام کی فتح کے متعلق جنرل البنی نے اپنا ایک خاص پروگرام بنا لیا تھا، اور اسی پروگرام کے ماتحت اس نے فیصل کو حکم دیا کہ عربی فوجیں پیٹرا سے صحرا کے اندر ہو کر چکر دار راستہ سے عمّان سے پچاس میل جانب شمال "دراعہ" پر حملہ کر دیں۔ تاکہ عمّان اور شرق اردن کی ترکی فوجوں کا راستہ دمشق کی ترکی چھاؤنی سے منقطع ہو جائے، اور جنرل البنی شرق اردن کی ترکی فوجوں سے ایک فیصلہ کن جنگ کر سکے۔

"پیٹرا" سے آگے بڑھتے ہی "مدوریہ" پر عربوں کا ترکی فوجوں سے ہلکا سا مقابلہ ہوا، اور اس کے بعد تیزی سے عربی فوجیں دراعہ کی طرف بڑھیں لیکن ترکوں کو بُھلاوا دینے کے لئے چند عربی قبائل کا رُخ عمّان کی طرف رکھا۔

دوسری طرف جنرل الینبی نے بیت المقدس فتح کر لیا، اور اس کی فوجیں ایک فیصلہ کن جنگ کے لئے وادی اردن کی طرف بڑھنی شروع ہو گئیں۔
جزیرۃ العرب کی جنگ میں یہ آخری معرکہ تھا جس کے بعد ترکی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ اور عربی اور برطانوی فوجوں نے آسانی کے ساتھ شام کے پایۂ تخت دمشق پر قبضہ کر لیا۔

ینبع سے جو عرب فوجیں 'درعہ' کی طرف پیشقدمی کر رہی تھیں، ان کے راستے میں بے پناہ مشکلات تھیں۔ سب سے زیادہ جس چیز نے عرب فوجوں کو پریشان کیا وہ یہ تھی کہ کئی کئی دن انھیں اور ان کے جانوروں کو اس صحرا میں پانی نصیب نہ ہوا۔
کئی دن کی مسلسل پیشقدمی کے بعد عربی فوجیں "ازرک" کے سامنے پہونچیں، اور مزید شمال کی طرف پیشقدمی کرنے سے پہلے سستانے لگیں۔ علاوہ اس کے موسم برسات بھی شروع ہو گیا تھا جس کے باعث آگے کامیابی سے پیشقدمی جاری رکھنا مشکل تھا۔ حملے سے پہلے ازرک پر عربوں نے نیئی باقاعدہ فوجیں، مسلح گاڑیاں، ہوائی جہاز اور بدویوں کی زبردست ٹولیاں جمع کر لیں، اور جیسے ہی موسم برسات ختم ہوا عرب فوج نے درعہ کے شمال، جنوب اور مغرب پر حملہ کر کے وہ ترکی لائن توڑ دی جو دمشق کے ترکی مرکز سے "الناصرہ" (Nazerath) عمّان اور درعہ کی ترکی فوجوں کا رشتہ جوڑے ہوئے تھی۔ اس مہم میں شیخ سعد کی پہاڑی پر درعہ اور مزراب' کی ترکی فوجوں سے عربوں کا جما ہوا مقابلہ بھی ہوا، لیکن ترکوں کو شکست ہوئی اور عربوں نے درعہ کے جنوب میں "مفرک" کے پاس شمال میں "عزارہ" پر

اور مغرب میں "مزارب" کے قریب ترکی ریلوے کو تباہ کر دیا، اور فلسطین کی ترکی فوجوں سے قسطنطنیہ کا جو واحد رشتہ اب تک برقرار تھا وہ توڑ دیا۔

عربوں اور ترکوں کے اس آخری معرکہ کے متعلق کرنل اسٹرلنگ ایک انگریز افسر جو ترکوں کے خلاف عربوں کے ایک کالم کی کمان کر رہا تھا اپنے ایک امریکن دوست کو ایک خط لکھتا ہے:۔

" ہم نے جزیرۃ العرب کی بغاوت پر جو بے دریغ روپیہ اور اپنا وقت خرچ کیا اس کا خاطر خواہ نتیجہ نکل آیا۔ عربوں کا یہ آخری حملہ نہایت ہنگامہ خیز تھا۔ جس وقت ہم اس حملے کیلئے اپنے مرکز سے روانہ ہوئے ہیں تو ہمارے پاس صرف چار سو باقاعدہ عرب فوج تھی۔ اس فوج کے ساتھ ہم نے ترکوں کے فوجی مرکزوں سے میلوں پرے چکر کاٹتے ہوئے تقریباً چھ سو میل صحرا میں سفر طے کیا اور اچانک ان پر جا پڑے اور انھیں کاٹ کر رکھ دیا۔

جنرل الینی کی پیشقدمی سے دو دن پہلے ہم نے ترکوں کی تین ریلوے لائنیں کاٹ دیں، اور پانچ دن تک ترکوں کی کوئی ریل ترکی فوج تک نہ پہونچنے دی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب ترکوں کی پسپائی شروع ہوئی تو انھوں نے دیکھا کہ ان کے اسلحہ کے مرکز اور کھانے پینے کی چیزوں کے ڈپو خالی پڑے ہوئے ہیں۔ اگرچہ یہ دن ہمیں بھی بہت سخت گذرے ہر رات کو ہمیں دو دو مرتبہ اپنا کیمپ بدلنا پڑتا تھا کہ کہیں دشمن اچانک ہمیں حملہ نہ کر بیٹھے، اور یہ سب احتیاطیں محض اس لئے تھیں کہ ہماری فوج بہت کمزور تھی۔ لیکن جب یہاں سے ہم نے دمشق کی طرف کوچ شروع کیا تو ہمارے پاس علاوہ پیدل کے گیارہ ہزار صرف عرب سوار تھے۔"

کی عربی اور عراقی بندرگاہوں کو گھیر لیا۔ اور قطالامارا پر اپنی فوجیں اتار دیں۔ لیکن اس جگہ انگریزوں کو ترکوں اور عراقیوں کی فوجوں نے شکست فاش دی اور ساری برطانوی فوج کو مع جنرل کے گرفتار کرکے قسطنطنیہ بھیج دیا۔ اس شکست کا بدلہ لینے کے لئے انگریزوں نے مصر اور مالٹا سے اپنا زبردست جنگی بیڑا بھیجا۔ اب کے ترکوں کو شکست ہوئی اور انگریزوں نے قطالامارا پر قبضہ کر لیا۔

اسی کے ساتھ برطانیہ نے عربوں کو بھی ترکوں کے خلاف ابھارنا شروع کر دیا۔ چنانچہ ۳۱ر اکتوبر ۱۹۱۴ء کو برطانوی افواج کے کمانڈر انچیف لارڈ کچنر نے شریف حسین کے منجھلے لڑکے شریف عبداللہ کو تار بھیجا:۔

جرمنی نے ترکی حکومت کو سونا دیکر خرید لیا ہے۔ حالانکہ انگلستان، فرانس اور روس نے ترکی سے یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر ترکی اس جنگ میں غیر جانبدار رہے تو اسکی سلطنت جنگ سے محفوظ رہے گی۔ اسی کے ساتھ ترکی حکومت نے سلطان کی مرضی کے خلاف مصر کی سرحد پر حملہ کر دیا ہے اگر عرب قوم اس جنگ میں برطانیہ کا ساتھ دے تو برطانیہ یہ ضمانت کرتی ہے کہ عرب میں کوئی قوت مداخلت نہ کر سکے گی اور برطانیہ بیرونی حملے سے عرب کو بچائے گی۔

شریف حسین نے برطانیہ کے اس پیغام کا فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔ اس لئے کہ قطالامارا پر برطانیہ کی شکست کے بعد شریف حسین کو ترکوں کے خلاف جنگ شروع کرنے میں تامل ہو گیا تھا، لیکن برطانیہ کی طرف سے جب مسلسل زور پڑا اور جنگ کے حالات میں بھی کچھ تبدیلی ہو گئی تو بالآخر شریف حسین برطانیہ سے سودا کرنے پر راضی ہو گیا اور جولائی ۱۹۱۵ء میں

شریف حسین نے مصر کے ہائی کمشنر سر ہنری میک ماہن کے پاس اپنی شرائط پیش کر دیں۔

"حکومت برطانیہ عربوں کی آزادی کی جنگ میں پوری طرح مدد کرے۔ اور عدن کو چھوڑ کر ایشیا کے جنوب مغرب کی سارے عربی بولنے والے علاقے کو آزاد عرب علاقہ تسلیم کرے"۔

ابتداً سر ہنری میک ماہن نے شریف حسین کی یہ شرط منظور نہیں کی لیکن جب وقت گذرتا گیا اور حالات کا تقاضا یہ ہوا کہ عرب میں فوراً ترکوں کے خلاف بغاوت کرائی جائے تو عرب علاقہ کی سرحدات کی بحث کو ختم کر دیا گیا، اور میک ماہن نے بظاہر شریف حسین کی شرط کو تسلیم کر کے انھیں ترکوں کے خلاف فوراً بغاوت کرنے کی ہدایت کی۔ اور اس ہدایت کے ساتھ بہت سے اسلحہ اور دس ہزار پونڈ شریف عبداللہ کے لئے بھیجے اور وعدہ کیا کہ بغاوت کے شروع ہوتے ہی پچاس ہزار پونڈ شریف حسین کی خدمت میں بھیجے جائیں گے، اور برطانوی جنگی جہاز نہر سوئز کی بندرگاہوں سے عرب فوجوں کی پیش قدمی میں مدد کریں گے، اس وعدے وعید کے ساتھ سودا ختم ہوا اور شریف حسین نے ترکوں کے خلاف پوری سرگرمی سے بغاوت کی تیاریاں شروع کر دیں۔

اعلان جنگ کے بعد ترکی حکومت نے شریف حسین کو یہ حکم بھیجا تھا کہ وہ حجاز میں ترکوں کی امداد کے لئے فوجیں اکٹھی کرے۔ شریف حسین اور اُس کے لڑکوں نے اس حکم سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور حجاز کا دورہ کر کے بجائے ترکوں کی حمایت میں فوجیں بھرتی کرنے کے قبائل کو ترکوں کے خلاف شریف حسین کے جھنڈے کے نیچے متحد کرنا شروع کر دیا۔

۱۹۱۵ء میں جب عرب میں ترکوں کے خلاف بغاوت کا سارا سامان لیس ہو چکا تو شریف حسین نے فیصل کو شام بھیجا۔ بظاہر اس لئے کہ شام کے ترکی گورنر اور کمانڈر جمال پاشا کو اپنی وفاداری اور امداد کا یقین دلائے اور بباطن اس لئے کہ شامی قبائل کو ترکوں سے توڑے اور عرب بغاوت کا راستہ شام تک ہموار کر دے۔ فیصل نے یہ کام بڑی خوبی سے کیا۔ دمشق پہونچکر وہ جمال پاشا کا مہمان ہوا اور اسے یقین دلادیا کہ ترکوں کی امداد کو حجاز میں ایک زبردست لشکر تیار کیا جارہا ہے اور بباطن اس نے دمشق کے اکثر امراء اور سرداران قبائل کو ترکوں سے توڑ لیا۔

دمشق میں ابھی فیصل کی سرگرمیاں جاری ہی تھیں کہ شریف حسین نے فیصل کو اطلاع دی کہ اس نے عرب کے بہت سے قبائل کو اپنے جھنڈے کے نیچے جمع کر لیا ہے اور یہ قبائل مدینہ کی ترکی چھاؤنی پر حملہ کرنے کے لئے بیچین ہو رہے ہیں۔ شریف حسین نے یہ اطلاع فیصل کو اس وقت دی جب شریف حسین اور برطانیہ کے درمیان سودا شروع ہو چکا تھا۔ اور برطانوی ہائی کمشنر سے عرب علاقہ کی سرحدات کے لئے گفتگو ہو رہی تھی۔ اس اطلاع کے ملتے ہی فیصل نے جمال پاشا سے عذر کیا اور مدینے جانے کی اجازت طلب کی، لیکن جمال پاشا نے یہ کہکر فیصل کو روک لیا کہ وہ اور انور پاشا دونوں فیصل کے ساتھ مدینے جائیں گے اور وہاں کے حالات اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے۔ یہ وقت فیصل کیلئے بہت سخت تھا۔ لیکن ان دونوں کے ساتھ سے وہ انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے شریف حسین کو فوراً اس نئی صورت حالات سے اطلاع دی، اور ہدایت کی کہ جمال اور انور کی موجودگی میں کوئی بات بھی عربوں سے ایسی نہ ہونے پائے کہ ان کو اہم پیشبہ ہو سکے۔

کچھ دنوں بعد فیصل انور پاشا اور جمال پاشا کے ساتھ مدینہ پہونچا۔ شریف حسین کافی احتیاطی تدابیر اختیار کر چکا تھا۔ تقریباً پانچ ہزار عرب فوج نے ان ترکوں کے آگے جمع ہو کر اپنے کرتب دکھائے اور سرداران قبائل نے ترکوں کو اپنی کامل وفاداری کا یقین دلادیا۔ انور اور جمال بظاہر اس مظاہرے سے بالکل مطمئن ہو گئے۔ لیکن رات ہوتے ہی فیصل کو ایک اور مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ اور وہ یہ کہ جمال جس محل میں ٹھیرے ہوئے تھے اس محل کو خفیہ طور پر چند عرب قبائل نے گھیر لیا اور ان کے سردار فیصل کے پاس یہ اجازت لینے پہونچے کہ ان دونوں ترکوں کا یہیں خاتمہ کر دیں۔ فیصل اس تجویز سے بہت گھبرایا، اور جس طرح بھی ہو سکا اس نے اس وقت تو ان عرب سرداروں کو سمجھا بجھا کر رخصت کر دیا۔ لیکن خود انور اور جمال کو اس محل سے نکال کر اپنے گھر لے آیا، اور اپنے کمرے میں ان دونوں کو سلا کر خود اس کمرے کے باہر رات بھر ان کی حفاظت کرتا رہا۔ صبح کو اس نے انور اور جمال کو بخیر و خوبی ریل پر سوار کرا دیا، اور خود بھی انھیں پہونچانے کے لئے دمشق تک ان کے ساتھ چلا گیا۔

فیصل کی یہ جسارت حقیقتاً حیرت انگیز تھی اس لئے کہ انتہائی کوششوں کے باوجود انور اور جمال کو یہ شبہ ہو گیا تھا کہ مدینے میں حالات بہتر نہیں، اور عرب جنگ میں ان کا ساتھ دینے کو تیار نہیں ہیں۔ اس شبہ کی موجودگی میں فیصل کا دمشق تک ان لوگوں کے ساتھ جانے کے یہ معنی تھے کہ فیصل نے اپنے آپ کو بالکل ان دونوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا کہ یہ چاہیں تو اُسے قتل کر دیں یا دمشق پہونچ کر اُسے قید کر دیں، اور اس طرح شریف حسین کو مجبور کر دیں کہ وہ اپنی باغیانہ سرگرمیوں سے دستبردار ہو جائے۔

لیکن انور اور جمال نے اس شبہ کے باوجود کہ عرب ہمارے ساتھ

چال کر رہے ہیں فیصل سے کوئی باز پرس نہیں کی۔ بلکہ دمشق پہونچکر اُنھوں نے مصلحتاً فیصل کو مدینے واپس جانیکی اجازت دیدی۔ اس فہمائش کے ساتھ کہ وہ مدینے پہونچکر عربوں کو ترکوں کی حمایت پر آمادہ کرے اور جو قبائل ترکوں کے مخالف ہو گئے ہیں، انھیں رام کرلے۔

لیکن دوسری طرف اُنھوں نے مدینے کی ترکی چھاؤنی پر شام سے مزید کمک بھیجدی اور اس طرح عربوں کی بغاوت کو ابتداہی میں روک دینے کا سامان کرلیا۔

سنہ ۱۹۱۶ء میں ترکوں کے خلاف عربوں کی تیاریاں مکمل ہوگئیں۔ اور دوسری طرف سر ہنری میک ماہن اور شریف حسین کے درمیان معاملہ آخری طور پر طے ہو چکا، برطانوی ہتھیار اور برطانوی روپیہ حجاز میں پہونچ چکا اور برطانوی جہاز عربی بندرگاہوں پر عربوں کی مدد کے لئے تعینات ہو چکے۔

شریف حسین نے ۹؍جون سنہ ۱۹۱۶ء کو ترکوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا، اور اُسی دن طائف، جدّہ اور مدینہ کی ترکی چھاونیوں پر ایک ساتھ حملہ کر دیا۔ طائف کی عرب فوج کی کمان شریف حسین نے اپنے ہاتھ میں رکھی۔ جدّہ پر شریف عبداللہ کی ماتحتی میں فوج بھیجی، اور مدینہ کی فوجوں پر فیصل اور علی کو متعین کیا۔

۱۲؍جون کو شریف حسین نے طائف کی چھاؤنی کو آسانی سے زیر کرلیا۔

۱۶؍جون کو جدّہ کی ترکی چھاؤنی بھی برطانیہ کے جہازوں کی مدد سے زیر ہوگئی۔ لیکن مدینہ میں فیصل اور علی کی فوجوں کو کامیابی نہیں ہوئی، مدینہ میں ترکوں کی سب سے بڑی فوجی چھاؤنی تھی۔ اور اس وقت یہاں ترکی کا مشہور

اور لیڈر جنرل فخری پاشا کمانڈر تھا۔ فیصل کی بدوی فوجوں نے مدینہ پر بڑی بے جگری سے دو مرتبہ حملہ کیا لیکن دونوں مرتبہ ترکوں نے عربوں کے حملوں کو بُری طرح پسپا کر دیا۔ اس مسلسل ناکامی کے بعد عربوں کے حوصلے پست ہو گئے، اور وہ مدینہ سے پچاس میل دور ہٹ آئے اور رابغ میں پڑاؤ ڈال دیا تاکہ ترکی فوج کو مکہ پہونچنے سے روک دیں۔

عرب میں یہ حالات تھے جب بدنامِ زمانہ ٹامس ایڈورڈ لارنس حجاز میں نمودار ہوا —— لارنس مصر کی انگریزی فوج کے شعبۂ جاسوسی میں متعین تھا۔ ابتداءً پندرہ دن کی چھٹی پر جدہ آیا تھا مگر بعد کو اپنی خوشی سے عرب میں رہ پڑا۔ لارنس کے پہونچنے سے پہلے جدہ پر امیر عبداللہ کا قبضہ ہو چکا تھا۔ جدہ سے لارنس مدینے پہونچا اور اس وقت پہونچا جب فیصل فخری پاشا سے ٹکرا کر اپنی مایوس اور ناکام فوج کے ساتھ رابغ ہٹ آیا تھا۔ رابغ ہی میں فیصل اور لارنس کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ جس کے بعد جنگِ عظیم کے خاتمہ تک یہ دونوں ایک دوسرے سے جُدا نہ ہوئے۔

مدینہ سے عربوں کے ہٹتے ہی ترکوں کو ریل کے ذریعہ شام سے مزید کمک مل گئی۔ ہوائی جہاز، مشین گنیں، اور ٹینک بھی باغیوں کے مقابلہ کے لئے جمال پاشا نے فخری پاشا کے پاس بھیج دیئے۔ ترک اس کمک سے تازہ دم ہو کر رابغ کی طرف بڑھے تاکہ فیصل کی فوج کا پوری طرح قلع قمع کر دیں۔ یہ وقت فیصل اور اس کی فوج کے لئے بہت نازک تھا۔ کھلے میدان میں عرب آلاتِ جدید سے مسلح ترکوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ اور عربی فوج میں اس قدر قوت نہیں تھی کہ ترکوں کے بڑھتے ہوئے کالم کو روک سکے، اس نازک وقت

میں لارنس نے فیصل کی مدد کی۔ سب سے پہلے تو اُس نے رابغ اور مدینے کے درمیان جسقدر قبائل تھے ان سب میں دورہ کیا اور انگریزی سونا اور انگریزی ہتھیار اہل قبائل میں تقسیم کئے اس ہدایت کے ساتھ کہ مدینہ کے ترکی کالم سے گوریلہ وضع کی لڑائی چھیڑ دیں اور اس کے بعد اس نے دوسری تجویز یہ کی کہ مدینہ کی ترکی فوج کو اُلجھانے کے لئے تھوڑی سی عربی فوج زید بن حسین کی ماتحتی میں چھوڑ کر باقی فوج "ینبوع" اور "الوجہ" کے بندرگاہوں کی طرف روانہ کر دی، اور امیر عبداللہ کو یہ ہدایت بھیجی کہ الوجہ کے فتح ہوتے ہی وہ جدہ کے راستہ مدینہ کی ترکی فوج پر آپڑے اور اس طرح ترکی کالم کو مدینہ واپس آنے پر مجبور کر کے مدینہ میں محصور کر لے۔

ینبوع اور الوجہ کے بندرگاہوں پر فوراً قبضہ کر لینے کا مقصد یہ تھا کہ شام کے ترکی کیمپ سے مدینہ کی ترکی فوج کا رشتہ منقطع کر دیا جائے، اور اس طرح ترکی کالم کی مکہ کی طرف پیشقدمی روک کر اسے قلعہ بند ہو جانے پر مجبور کر دیا جائے۔ چنانچہ اس تجویز کے ماتحت فیصل اور لارنس نے برق صفت تیزی سے ینبوع اور الوجہ کی بندرگاہوں پر حملہ کر دیا، اور دوسری طرف امیر عبداللہ کی فوجوں نے ترکوں پر مدینہ کے شمال سے یلغار کر دی اس دو طرفہ حملہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ مکہ کی طرف ترکی کالم کی پیشقدمی رُک گئی اور ترکوں نے مدینہ کی حفاظت کرتے ہوئے محصور ہو جانا پسند کر لیا۔

فیصل نے ینبوع اور الوجہ آسانی سے فتح کر لئے، اور ان بندرگاہوں کی فتح کے ساتھ ہی برطانیہ سے عربوں کا رشتہ زیادہ مضبوط ہو گیا، اس لئے کہ انہی بندرگاہوں کے ذریعہ برطانیہ نے فیصل کو ہتیاروں کی امداد دینی شروع کی، اور لارنس نے اطراف وجوانب کے قبائل کو فیصل کی حمایت میں آمادہ

کرسکاں میں برطانوی روپیہ اور ہتیار تقسیم کرنے شروع کر دیئے۔ اس ترکیب سے چند ہی دنوں میں لارنس نے فیصل کے جھنڈے کے نیچے دس ہزار فوج جمع کر دی۔ ینبوع اور الوجہ کی فتح کے بعد لارنس کے مشورے سے فیصل نے شام کی طرف رُخ کیا۔ شام کی سرحد پر "عقبہ" ترکوں کا ایک اور اہم بندرگاہ تھا۔ لارنس کے نزدیک عرب میں ترکوں کو پوری طرح بے بس کرنے کے لئے اس بندرگاہ پر قبضہ کرنا بھی ضروری تھا۔ چنانچہ ۱۸۔ جون ۱۹۱۷ء کو فیصل کی بدوی فوجیں الوجہ سے عقبہ کی طرف روانہ ہوگئیں اور راستہ میں جو عرب قبائل ملتے گئے انھیں فیصل اپنے جھنڈے کے نیچے جمع کرتا گیا۔ عقبہ کی مہم کئی وجوہ سے اہم تھی، ایک تو عقبہ کے فتح ہونے کے بعد حجاز میں ترکی کمک نہیں پہونچ سکتی تھی۔ دوسرے اس فتح سے حجاز کے عربوں کا شام کے عربی قبائل سے رشتہ جڑ جاتا تھا اور ان قبائل کو جنھیں فیصل اپنے دمشق کے دوران قیام میں ترکوں کے خلاف اُبھار آیا تھا۔ علانیہ ترکوں سے بغاوت کرنیکا موقع مل جاتا۔

یہ تجویز چونکہ عربوں کے حق میں بہت مفید نظر آرہی تھی اس لئے فیصل نے فوراً ہی الوجہ سے شمال کی طرف کوچ کر دیا۔ منزلِ مقصود اگرچہ فیصل کی عقبہ ہی تھی لیکن ترکوں کو بھلاوے میں ڈالنے کے لئے اس نے چکردار راستہ اختیار کیا۔ اور "وادی ثبیراں" سے گذرتا ہوا ایہ کے شمال میں نکلا، اور راستہ میں جگہ جگہ وہ ریلوے لائن توڑتا گیا۔ جو ترکوں نے دمشق سے مدینے تک قائم کر رکھی تھی۔ مواب کے علاقہ میں پہونچکر فیصل نے اپنا رُخ معان کی طرف پھیر دیا اور معان سے ۱۸ میل جانب مغرب ایک ترکی چوکی پر حملہ کر کے اس چوکی کے سارے ترک سپاہیوں کا قلع قمع کر ڈالا۔ جب معان کی ترکی چھاؤنی میں عربوں کے اس حملے کی اطلاع ملی تو ترکوں نے عربوں کی گوشمالی کے لئے ایک فوجی

کالم بھیجدیا۔ جس وقت یہ ترکی کالم فیصل کی فوج کا تعاقب کرتا ہوا وادی ابوالیث پہونچا تو فیصل کی فوج نے جو اس سے پہلے ہی اس وادی کی پہاڑیوں پر قابض ہو چکی تھی ترکی کالم کو سب طرف سے گھیر کر بندوقوں کا نشانہ بنانا شروع کردیا۔ اس جنگ میں عربوں کی تعداد اگرچہ کم تھی اور ترک کافی تعداد میں موجود تھے۔ لیکن ترک اس وادی میں اس بُری طرح پھنس گئے تھے کہ ان کے جدید آلات اور ان کی کثرت تعداد بھی کام نہ آسکی۔ اور سارا ترکی کالم دیکھتے ہی دیکھتے بدوؤں نے کاٹ کر رکھدیا۔

فیصل کی اس زبردست فتح سے عربوں کے حوصلے بڑھ گئے، اور ترکوں میں بدحواسی پھیل گئی۔ عرب قبائل جوق جوق فیصل کے جھنڈے کے نیچے جمع ہونے لگے اور فیصل کو انھوں نے بے تکلف اپنا قومی رہنما اور سردار تسلیم کرلیا۔

وادی ابوالیث میں فتح حاصل کرنے کے بعد فیصل کی فوجیں عقبہ کی طرف بڑھیں اور بغیر کسی لڑائی بھڑائی کے ۷۔ جولائی ۱۹۱۷ء کو عقبہ میں داخل ہوگئیں۔ عقبہ کے ترک اور جرمن دستوں نے عربوں کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔

فیصل کی فوجوں نے عقبہ کو فتح کرلیا۔ لیکن اب ان کے پاس کھانے کو کچھ نہیں رہا تھا، اور نہ آگے پیشقدمی کرنے کے لئے مناسب ہتھیار تھے۔ فیصل نے برطانیہ سے مدد مانگی، لارنس عقبہ سے مصر پہونچا۔ اس وقت مشرق قریب کی برطانوی افواج کا کمانڈر انچیف جنرل ایلنبی تھا۔ اس نے عقبہ کی فتح پر تو مسرت کا اظہار کیا اور عربوں کو مدد دینے پر بھی رضامندی ظاہر کردی۔ لیکن اس سلسلہ میں سوال یہ پیدا ہوا کہ عقبہ کی فتح کے بعد فیصل کی فوجوں کی پوزیشن کیا ہوگی۔ کیونکہ عقبہ پر عرب کی سرحد ختم اور شام کی سرحد شروع ہو جاتی ہے، اور شام

اور فلسطین کی کمان چونکہ براہ راست جنرل البنی کے پاس ہے اس لئے فیصل کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ آیندہ جنرل البنی کی ماتحتی میں کام کرے اور اسی کی ہدایات پر عمل کرے۔ یہ سوال بہت ٹیڑھا تھا۔ لارنس بطور خود اس کا کوئی جواب نہ دے سکا۔ مصر سے ضروری امداد لیکر عقبہ واپس آیا اور یہاں اس نے فیصل سے اس بارے میں مشورہ کر کے شریف حسین کو اس نئی صورت حال کی اطلاع دی، لارنس کو اندیشہ تھا کہ شاید شریف حسین اس بات کو منظور نہ کرے گا کہ فیصل البنی کی ماتحتی میں کام کرے۔ لیکن شریف حسین جب عقبہ آیا تو فیصل اور لارنس نے کہہ سُنکر اس کو راضی کر لیا۔ چنانچہ اسی وقت سے فیصل کی فوجیں البنی کی نگرانی میں آگئیں اور برطانوی فوج کا داہنا بازو قرار پائیں۔

شریف حسین بہت چوکنا آدمی تھا۔ اسے برطانیہ کے اس وعدے پر ابتک شبہ تھا کہ جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد ممالک عربیہ کی آزاد انفرادیت تسلیم کر لی جائے گی۔

چنانچہ جس وقت لارنس نے شریف حسین کے آگے یہ تجویز پیش کی کہ فیصل کی فوجیں جنرل البنی کی ماتحتی میں چلی جائیں اور فیصل آیندہ جنرل البنی کی ہدایتوں پر عمل کرے تو شریف حسین نے دوبارہ اسی مسئلے کو اُٹھایا تھا اور برطانیہ سے اس کی طمانیت چاہی تھی کہ وہ جنگ عظیم کے بعد اپنا وعدہ پورا بھی کریگا۔ اس پر لارنس نے شریف حسین کو یہ زبان دی تھی کہ حکومت برطانیہ اگر کوئی وعدہ کر لیتی ہے تو اُس پر ہمیشہ قائم رہتی ہے، اور کسی حالت میں اس سے نہیں پھرتی۔

لارنس کے کہنے سُننے کا شریف حسین کو یقین آیا ہو یا نہ آیا ہو لیکن واقعہ ہے کہ لارنس ہی کے یقین دلانے کے بعد شریف حسین نے اس کی منظوری

دیدی کہ فیصل کی فوجیں آئندہ سے جنرل الینبی کی ماتحتی میں رہیں اور برطانوی فوج کے ایک جزو کی حیثیت سے شام کی طرف پیش قدمی کریں۔

اب تک فیصل کو جس قدر فتوحات حاصل ہو چکی تھیں انمیں لارنس کی ذاتی "جاسوسانہ" قسم کی سرگرمیوں کو بڑا دخل تھا۔ یہ دبلا پتلا حقیر سا انسان عربی لباس پہنے ایک چھوٹی سی بدوی جماعت کو ساتھ لئے رات دن صحرا کے بدوی قبائل میں چکر لگایا کرتا تھا۔ ——— کہیں شیوخ اور سرداران قبائل کو روپے کا لالچ دیتا۔ کہیں وحدت عربیہ کا واسطہ دیتا۔ کہیں آزادی عرب کا سبز باغ دکھاتا۔ کہیں لوٹ کے مال کا یقین دلاتا۔ غرض جس طرح بھی ہو سکتا۔ ان بدویوں کو ترکوں کے خلاف اور فیصل کی حمایت پر آمادہ کرتا چلا جاتا تھا۔ وحشی بدویوں کو رام کرنا آسان نہیں خاصکر ایسی صورت میں جبکہ اکثر ہمسایہ قبائل میں مدتوں سے آپس میں دشمنی چلی آتی ہو۔ لیکن لارنس کی شخصیت میں نہ معلوم کیا جادو تھا کہ اس نے نہ صرف ان قبائل کو رام کر لیا بلکہ ان کی عداوتوں کو ختم کر کے انھیں ترکوں کی دشمنی پر متحد کر دیا۔

بدوی قبائل میں چکر لگانے کے علاوہ لارنس نے اس کو بھی اپنا مشن بنا لیا تھا کہ جہاں موقع ملے ترکوں کی امدادی ریل گاڑیوں کو ڈائنامیٹ لگا لگا کر اڑا دے اور جہاں پل نظر پڑے نیست و نابود کر دے۔ تار کے کھمبے اکھڑوا ڈالے غرض شام اور مدینہ کی ترکی فوجوں کے درمیان جسقدر ذرائع رسل و رسائل ہو سکتے تھے لارنس انھیں ایک ایک کر کے تباہ و برباد کرتا جاتا تھا۔ لارنس کی ان حرکتوں میں ایک طرف بدوی قبائل کی دلچسپی کا سامان تھا تو دوسری طرف ترکی فوجوں کے لئے بے پناہ مشکلات کا پیغام، اور دراصل ترکوں پر یہی دو طرفہ حملے تھے جن سے

عرب اور شام میں ان کے قدم اُکھڑے اور ایسے اُکھڑے کہ پھر ترکی سرحد سے ورے نہ جم سکے۔

عقبہ پر عربوں کے قابض ہو جانے کے باعث مدینہ کی ترکی فوجوں کی پوزیشن بہت کمزور ہو گئی تھی، اور خود شام میں ترکوں کو قدم جمانے مشکل ہو گئے تھے اس لئے ترکوں نے عربوں کو عقبہ سے نکال باہر کرنیکی فوراً تدبیریں کرنی شروع کر دیں۔

عقبہ کے شمال میں ترکوں کی ایک زبردست چھاؤنی تھی "معاون" یہاں بہجت پاشا کی کمان میں سات ہزار کے قریب آلاتِ جدیدہ سے مسلح ترکی فوج پڑی ہوئی تھی۔ اس فوج نے عقبہ پر "گویرا" کے راستے چڑھائی کر دی اور "ابا اللسّان" میں وادی موسیٰ کے دہانہ کا انتظام کر کے مورچہ بند ہو گئی۔ اس دوران میں عربی فوج بھی اپنی تھکن دُور کر چکی تھی، ترکوں کے مقابلہ کو آگے بڑھی اور "پیٹرا" کے کھنڈروں میں خیمہ زن ہو گئی۔

برطانوی ہوائی جہازوں نے ترکوں پر بم برسانے شروع کئے، اور وادیٔ موسیٰ کی پہاڑیوں پر سے چند چھپے ہوئے بدوی قبائل نے ترکوں کو زِچ کرنا شروع کر دیا۔ بدوی حملے ترکوں کو دھوکا دینے کے لئے کئے گئے اور ان میں وہ کامیاب رہے۔

۲۱۔ اکتوبر کو ترکی فوجیں پیٹرا کی پہاڑیوں میں جمع ہوئیں۔ عربوں کی ایک ٹولی نے ان کا مقابلہ کیا۔ وادی موسیٰ کے بدوی قبائل نے ترکوں کی صفوں میں ابتری ڈال دی۔ برطانوی ہوائی جہازوں نے بم برسائے اور ہلکے سے مقابلہ کے بعد عربی فوج بظاہر وادی موسیٰ کی طرف پسپا ہو گئی ترک جوش میں آگے بڑھے۔ وادی موسیٰ کی طرف، عربوں کی اصلی پوزیشن کو نظر انداز کر کے، دُور

تک بڑھے چلے گئے۔ یہ ترکوں کی بہت بڑی غلطی تھی، جس سے ترک زچ ہو گئے اور ترکی فوجیں تباہ و برباد ہو گئیں۔

جیسے ہی ترک وادی موسیٰ میں در آئے وادی کی ہر کھو اور پہاڑیوں کی ہر چٹان سے ان پر گولیوں اور گولوں کا مینہ برسنے لگا۔ ترک گھر گئے۔ لڑائی میں شکستِ فاش اٹھائی۔ بہت سے ترک عربوں کے ہاتھ سے نہ بچے اور بہت سے گرفتار ہو گئے۔

ترکوں کی اس شکست کے بعد عقبہ پر عربوں کا قبضہ مضبوطی سے قائم ہو گیا اور مدینہ کی چھاؤنی کے ساتھ ترکوں کا فوجی رشتہ ٹوٹ گیا۔

عقبہ پر عربوں کی پیشقدمی کے دوران میں جنرل الینی کی فوجیں بحیرۂ روم کے کنارے کنارے فلسطین کے جنوب میں بڑھتی جا رہی تھیں اور جس وقت عربوں نے "بیٹرا" میں ترکوں کو شکست دی اس وقت جنوبی فلسطین کے اکثر شہر جنرل الینی کے قبضے میں آ چکے تھے۔

۲۸- اکتوبر ۱۹۱۷ء کو جنرل الینی نے جنوبی فلسطین کا اہم بندرگاہ "غزہ" فتح کر لیا۔ اور وہاں سے "بیر سبع" کی طرف بڑھا۔ اور معمولی مقابلہ کے بعد بیر سبع پر بھی قبضہ کر لیا۔

عربی اور برطانوی فوجوں کی متحدہ یورش سے شام میں ترکی پوزیشن پر نہایت سخت دباؤ پڑ رہا تھا۔ اسی کے ساتھ ترکوں کی عربی فوجیں ایک ایک کر کے عربوں اور برطانیہ کی فوجوں سے ملتی جا رہی تھیں اور شام کے اکثر حصوں میں ترکوں کے خلاف علانیہ بغاوتیں ہونے لگی تھیں۔ خود ترکی فوج میں بد دلی اور مایوسی کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔

ان حالات کو دیکھ کر جرمن جنرل فاکن ہان نے جس کے پاس شام کی ترکی فوجوں کی کمان تھی ترکی حکومت کو یہ مشورہ دیا تھا کہ ترکی فوجیں فوراً ہی شام اور فلسطین سے ہٹالی جائیں۔ مدینہ کی چھاؤنی خالی کر دی جائے، اور دمشق کے شمال میں اناطولیہ کی سرحد سے قریب حلب پر ترکی مورچہ قائم کر دیا جائے۔ یہ بڑا قیمتی مشورہ تھا۔ اگر انور پاشا، وزیر جنگ جرمن جنرل کے اس مشورہ پر عمل کرتے تو نہ شام میں ترکوں کی فوجیں تباہ ہوتیں اور نہ برطانیہ اور فیصل کی فوجوں کو دمشق تک پیشقدمی کر نیکی جرأت ہوتی لیکن انور پاشا نے جنرل فاکن ہان کے اس مشورے کو نہ مانا اور عرب پیشقدمی کو "عمان" پر اور البنی کو شرق اردن پر روکنے کا حکم دیدیا۔

فیصل کی فوجیں پٹرا کی فتح کے بعد ششتا رہی تھیں اور جنرل البنی کی فوجیں بیر سبع فتح کر چکنے کے بعد بیت المقدس کی طرف کوچ میں مصروف تھیں۔ شام کی فتح کے متعلق جنرل البنی نے اپنا ایک خاص پروگرام بنا لیا تھا، اور اسی پروگرام کے ماتحت اس نے فیصل کو حکم دیا کہ عربی فوجیں پٹرا سے صحرا کے اندر ہو کر چکر دار راستہ سے عمان سے پچاس میل جانب شمال "دراعہ" پر حملہ کر دیں تا کہ عمان اور شرق اردن کی ترکی فوجوں کا راستہ دمشق کی ترکی چھاؤنی سے منقطع ہو جائے، اور جنرل البنی شرق اردن کی ترکی فوجوں سے ایک فیصلہ کن جنگ کر سکے۔

"پیٹرا" سے آگے بڑھتے ہی "مدوورہ" پر عربوں کا ترکی فوجوں سے ہلکا سا مقابلہ ہوا، اور اس کے بعد تیزی سے عربی فوجیں دراعہ کی طرف بڑھیں لیکن ترکوں کو بھلاوا دینے کے لئے چند عربی قبائل کا رُخ عمان کی طرف رکھا۔

دوسری طرف جنرل الینبی نے بیت المقدس فتح کر لیا، اور اس کی فوجیں ایک فیصلہ کن جنگ کے لئے وادی اردن کی طرف بڑھنی شروع ہو گئیں۔
جزیرۃ العرب کی جنگ میں یہ آخری معرکہ تھا جس کے بعد ترکی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ اور عربی اور برطانوی فوجوں نے آسانی کے ساتھ شام کے پایۂ تخت دمشق پر قبضہ کر لیا۔

یبڑا سے جو عرب فوجیں 'دراعہ' کی طرف پیشقدمی کر رہی تھیں، ان کے راستے میں بے پناہ مشکلات تھیں۔ سب سے زیادہ جس چیز نے عرب فوجوں کو پریشان کیا وہ یہ تھی کہ کئی کئی دن انھیں اور ان کے جانوروں کو اس صحرا میں پانی نصیب نہ ہوا۔
کئی دن کی مسلسل پیشقدمی کے بعد عربی فوجیں "ازرک" کے سامنے ہو پہنچیں، اور مزید شمال کی طرف پیشقدمی کرنے سے پہلے سستانے لگیں۔ علاوہ اس کے موسم برسات بھی شروع ہو گیا تھا جس کے باعث آگے کامیابی سے پیشقدمی جاری رکھنا مشکل تھا۔ حملے سے پہلے ازرک پر عربوں نے اپنی باقاعدہ فوجیں، مسلح گاڑیاں، ہوائی جہاز اور بدویوں کی زبردست ٹولیاں جمع کر لیں، اور جیسے ہی موسم برسات ختم ہوا عرب فوج نے دراعہ کے شمال، جنوب اور مغرب پر حملہ کر کے وہ ترکی لائن توڑ دی جو دمشق کے ترکی مرکز سے "الناصرہ" (Nazerath) عمّان اور دراعہ کی ترکی فوجوں کا رشتہ جوڑے ہوئے تھی۔ اس مہم میں شیخ سعد کی پہاڑی پر دراعہ اور مزراب' کی ترکی فوجوں سے عربوں کا جما ہوا مقابلہ بھی ہوا، لیکن ترکوں کو شکست ہوئی اور عربوں نے دراعہ کے جنوب میں "مفرک" کے پاس شمال میں "عرارہ" پر

اور مغرب میں "مزارب" کے قریب ترکی ریلوے کو تباہ کر دیا، اور فلسطین کی ترکی فوجوں سے قسطنطنیہ کا جو واحد رشتہ اب تک برقرار تھا وہ توڑ دیا۔

عربوں اور ترکوں کے اس آخری معرکہ کے متعلق کرنل اسٹرلنگ ایک انگریز افسر جو ترکوں کے خلاف عربوں کے ایک کالم کی کمان کر رہا تھا اپنے ایک امریکن دوست کو ایک خط لکھتا ہے:۔

"ہم نے جزیرۃ العرب کی بغاوت پر جو بے دریغ روپیہ اور اپنا وقت خرچ کیا اس کا خاطر خواہ نتیجہ نکل آیا۔ عربوں کا یہ آخری حملہ نہایت ہنگامہ خیز تھا۔ جس وقت ہم اس حملے کیلئے اپنے مرکز سے روانہ ہوئے ہیں تو ہمارے پاس صرف چار سو باقاعدہ عرب فوج تھی۔ اس فوج کے ساتھ ہم نے ترکوں کے فوجی مرکزوں سے میلوں پرے چکر کاٹتے ہوئے تقریباً چھ سو میل صحرا میں سفر طے کیا اور اچانک ان پر جا پڑے اور انھیں کاٹ کر رکھ دیا۔

جنرل البنی کی پیشقدمی سے دو دن پہلے ہم نے ترکوں کی تین ریلوے لائنیں کاٹ دیں، اور پانچ دن تک ترکوں کی کوئی ریل ترکی فوج تک نہ پہونچنے دی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب ترکوں کی پسپائی شروع ہوئی تو انھوں نے دیکھا کہ ان کے اسلحہ کے مرکز اور کھانے پینے کی چیزوں کے ڈپو خالی پڑے ہوئے ہیں۔ اگرچہ یہ دن ہمیں بھی بہت سخت گذرے، ہر رات کو ہمیں دو دو مرتبہ اپنا کیمپ بدلنا پڑتا تھا کہ کہیں دشمن اچانک ہمیں حملہ نہ کر بیٹھے، اور یہ سب احتیاطیں محض اس لئے تھیں کہ ہماری فوج بہت کمزور تھی۔ لیکن جب یہاں سے ہم نے دمشق کی طرف کوچ شروع کیا تو ہمارے پاس علاوہ پیدل کے گیارہ ہزار صرف عرب سوار تھے"۔

جس دن فیصل کی فوجوں نے دراعہ کے اطراف کی ترکی ریلوے لائنوں کو تباہ کر کے دمشق سے فلسطین کے ترکوں کا رشتہ منقطع کر دیا، اس کے دو دن بعد البنی نے وادی اردن میں ترکوں پر حملہ کر دیا۔

اس حملے کے وقت شام کی فوجوں کا جرمن کمانڈر لیمان فان سنڈرس الناصرہ میں مقیم تھا۔ مگر اس طرح کہ اس کا رشتہ دمشق کے مرکز سے منقطع ہو چکا تھا، اور اس کی فوجوں میں اس قدر دم نہ تھا کہ جنرل البنی کے حملوں کو روک سکے۔

۱۹ ستمبر ۱۹۱۸ء کو یہ فیصلہ کن معرکہ شروع ہوا۔ جنرل البنی کی فوجوں نے ترکی فوجوں کو وادی اردن میں گھیر کر پوری قوت سے ان پر حملہ کر دیا۔ ترکی لائن بہت جلد ٹوٹ گئی اور بہت بری طرح دمشق کی طرف پسپا ہونے لگی۔ لیکن البنی نے اس مرتبہ محض ترکوں کی پسپائی پر قناعت نہیں کی بلکہ ترکوں کی منتشر فوج پر اپنے ہوائی جہازوں سے پے در پے حملے کر کے آدھے سے زیادہ ترکوں جرمنوں اور آسٹریا والوں کو ختم کر دیا۔

وادی اردن میں ترکوں کا ایک پورا ڈویژن البنی نے گھیر کر تباہ کر ڈالا تھا۔ اور جو ترک البنی کی زد سے بچ کر نکلے ان میں سے اکثر مقامی بدوی اور فیصل کے ساتھی صحرائی قبائل کی گولیوں کی نذر ہو گئے۔

ترکوں کو اس معرکہ میں مکمل شکست ہوئی اور شام پر عربوں کا قبضہ ہو گیا۔

اس شکست کے بعد ترکوں نے نہایت تیزی سے دمشق خالی کر دیا۔ اور ترکوں کے پیچھے پیچھے عرب فوجیں اور عرب فوجوں کے پیچھے برطانوی

فوجیں مظفر و منصور ۳۰۔ستمبر ۱۹۱۸ء کو دمشق میں داخل ہوئیں۔عرب فوجیں جو فیصل کی فوج کا ہراول تھیں برطانوی فوجوں سے پہلے دمشق میں داخل ہوئیں۔گویا شام پر قبضے میں اولیت فیصل کو حاصل ہوگئی یا دیدی گئی۔

فیصل بذات خود ابھی دراعہ میں مقیم تھا، اور البنی یا فامیں۔اسی طرح برطانوی فوجوں کا ہراول بھی دمشق میں داخل ہو چکا تھا۔دمشق پہونچکر لارنس کو جو فیصل کے نائب کی حیثیت میں تھا۔ایک اور مشکل کا سامنا کرنا پڑا شامیوں نے ترکوں کی پسپائی اور عربوں کی فتح کا حال سنکر فوراً اپنی ایک عارضی حکومت بنالی اور اس عارضی حکومت کا صدر امیر عبد القادر کو منتخب کیا۔یہ امیر عبدالقادر الجیریا کے امیر کا پوتا تھا، جس نے فرانسیسیوں سے لڑائی میں شکست کھانے کے بعد دمشق میں سکونت اختیار کر رکھی تھی اور ترکوں کا نہایت معتمد امیر بن گیا تھا، اور ترکوں نے دمشق کے قرب وجوار میں اس کو بہت سی زمینیں دیدی تھیں۔

۱۹۱۷ء میں جب عربوں نے عقبہ فتح کر لیا تو امیر عبد القادر فیصل کے پاس عقبہ پہونچا۔اور یہ یقین دلایا کہ وہ ترکوں سے بھاگ کر اس کے پاس آیا ہے۔اور اس جنگ میں فیصل کی مدد کرنا چاہتا ہے۔فیصل کو اس بات کا یقین آگیا اور نہ صرف فیصل نے اس کا یقین کر لیا بلکہ شریف حسین نے بھی امیر عبدالقادر کو مکہ بلاکر اسے خطاب دیا۔شریف حسین کے اس اظہار اعتماد کے بعد امیر عبد القادر کو یہ موقع مل گیا کہ وہ فیصل کی فوجوں کی پیشقدمی کے متعلق ضروری اور راز کی باتیں معلوم کر لیا کرے۔چنانچہ جب فیصل کی فوجیں عقبہ سے دراعہ کی طرف روانہ ہوئیں تو امیر عبدالقادر نے فیصل کی فوجوں کی صحیح منزل مقصود سے شام کے گورنر کو آگاہ کر دیا تھا۔لیکن اس قبل از وقت آگاہی کے باوجود جب ترکوں کو شکست ہوگئی تو عبد القادر نے یہ حرکت کی کہ پھر فیصل کے

پاس آگیا۔ اور اس کو دمشق کی ترکی پوزیشن کے متعلق حالات بتا دیئے اور جب وادی اردن میں ترکوں کو آخری شکست ہوگئی تو امیر عبدالقادر فوراً دمشق واپس آیا اور دروزیوں سے مل کر اس نے شریف حسین کے نام سے دمشق میں ایک حکومت بنا ڈالی اور اس حکومت کا صدر خود بن بیٹھا۔ چنانچہ جس وقت لارنس فیصل کے مقدمۃ الجیش کے ساتھ دمشق پہونچا تو اس نے دیکھا کہ امیر عبدالقادر وہاں اپنی حکومت قائم کر چکا ہے، اور دروزی اس کی حمایت میں ہیں فیصل کے باقاعدہ دمشق پہونچنے میں ابھی دیر تھی اور لارنس فیصل کے نائب کی حیثیت سے آیا تھا اس لئے یہ ذمہ داری اس پر تھی کہ فیصل کے آنے تک دمشق پر فیصل کا قبضہ قائم رکھے۔ اس لئے اس نے دمشق پہونچتے ہی عبدالقادر کی حکومت کو توڑ دیا، اور ایک نئی عارضی حکومت اس نے وہاں قائم کی جس کا صدر شکری پاشا ایوبی کو منتخب کیا۔ لارنس کی اس حرکت نے امیر عبدالقادر کو بے انتہا مشتعل کیا اور اس نے اطرش پاشا دروزی کی مدد سے خود شریف حسین اور فیصل کے خلاف دمشق میں بغاوت شروع کر دی۔ لیکن امیر عبدالقادر اس کے ساتھیوں کی یہ بغاوت بڑھنے نہ پائی لارنس نے اسے نہایت سختی سے کچل دیا، اور جو عارضی حکومت لارنس نے دمشق میں بنائی تھی وہ عام طور پر تسلیم کر لی گئی۔

دمشق میں عربی اور انگریزی فوجوں کے داخلہ کے کچھ دنوں بعد امیر فیصل اور جنرل البنی سرکاری طور پر شہر میں داخل ہوئے۔ جنرل البنی موٹر کے ذریعہ دمشق میں داخل ہوا اور امیر فیصل درعہ سے اسپیشل ٹرین کے ذریعہ آئے۔ دونوں تقریباً ایک ہی وقت دمشق پہونچے، اور پہلی مرتبہ فیصل اور البنی ایک

دوسرے سے ملے۔

اس موقع پر ایلنبی نے فیصل کو برطانوی دفترِ خارجہ کا ایک تار دیا جس میں حکومت برطانیہ نے عربوں کو ایک فوجی قوت کی حیثیت سے تسلیم کر لیا تھا فیصل نے ایلنبی کا شکریہ ادا کیا اور یہ ملاقات دمشق کے لئے انتظامات کے متعلق مشوروں پر ختم ہوگئی۔

دمشق چونکہ فیصل کی عربی فوجوں کی مدد سے فتح کیا گیا تھا اس لئے شام پر فیصل کی بادشاہت گویا طے شدہ سی بات تھی۔ چنانچہ دمشق کی فتح کے کچھ دنوں بعد جب یورپین حکومتوں میں صلح ہوگئی تو جنرل ایلنبی دمشق کا سارا نظم و نسق بے تکلف فیصل کو سپرد کر کے انگلستان روانہ ہوگیا۔ اور امیر فیصل شام کے بادشاہ کہلائے جانے لگے۔

دمشق کی فتح کے ساتھ عرب کی جنگ ختم ہوگئی اور یورپ کی حکومتوں کے درمیان صلح ہو جانے کے بعد جنگ عظیم ہی کا خاتمہ ہوگیا۔ لیکن مدینہ کو جنگ کے خاتمہ کے بعد بھی ترکی کے مشہور جنرل فخرالدین پاشا نے عربوں کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ اس بہادر جنرل نے اپنے مٹھی بھر ترک سپاہیوں سے کامل دو برس تک مدینے پر قبضہ رکھا اور اس ساری مدت میں اگرچہ امیر عبداللہ کی فوجیں مدینہ کا محاصرہ کئے رہیں، لیکن انھیں اتنی جرأت نہیں ہوئی کہ فخرالدین پاشا اس کی فوجوں کو مدینے سے باہر نکال دیتیں۔ بلکہ جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد بھی جب جنرل فخرالدین پاشا مدینے کو عربوں کے حوالے کرنے پر راضی نہ ہوئے تو عربوں کے پاس سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ مدینے کا برابر محاصرہ کئے پڑے رہیں۔ لیکن اس محاصرہ کے زمانہ میں چونکہ ترکی فوجوں کی حالت بہت خراب

ہو گئی تھی اور اس کا ان کے حوصلے پر بہت برا اثر پڑا تھا اسلئے وہ جنگ کے خاتمے کے بعد زیادہ دنوں تک محصور حالت میں نہ رہ سکے تھے اور ایک دن موقع پا کر انھوں نے اپنے شیر دل کمانڈر جنرل فخرالدین پاشا کو خود ہی گرفتار کر لیا اور شہر مدینہ امیر عبداللہ کے حوالے کر دیا۔ اس طرح جنگ عظیم کے ختم ہونے کے تین مہینے بعد یعنی ۱۰۔ جنوری ۱۹۱۹ء کو مدینہ عربوں کے قبضے میں آیا۔

عربوں کے ہاتھوں مدینہ کی فتح کے بعد سارا عرب علاقہ گویا ترکی اقتدار سے آزاد ہو گیا، اور شریف حسین اور سر ہنری میک ماہن کے معاہدے کے مطابق حکومت برطانیہ کا یہ فرض ہو گیا کہ عراق شام اور نجد و حجاز کے عربی بولنے والے علاقے کو آزاد عرب علاقہ تسلیم کرلے، اور اپنے جنگ عظیم کے ساتھیوں سے بھی اس کی آزاد حیثیت تسلیم کرا لے۔ لیکن جنگ کے اختتام پر جب شریف حسین نے اس سلسلہ میں برطانیہ سے سلسلہ جنبانی کی تو یکایک ایک نئے خفیہ معاہدے کا انکشاف ہوا۔ یہ معاہدہ دوران جنگ میں خفیہ طور پر انگلستان اور فرانس کے درمیان طے ہوا تھا اور "سائیکس پیکاٹ" (SYKS PICOT) کے نام سے مشہور تھا۔ اس کی رو سے برطانیہ اور فرانس نے فلسطین اور شام کے علاقے آپس میں تقسیم کر لئے تھے اور باقی علاقے عربوں کے لئے چھوڑ دیئے تھے۔

اگرچہ جنگ کے دوران ہی میں ترکوں کے ذریعے یہ افواہیں عربوں تک پہونچ چکی تھیں کہ شام اور فلسطین کے متعلق فرانس اور برطانیہ میں پہلے ہی سمجھوتہ ہو چکا ہے۔ لیکن عربوں نے ان افواہوں کا پوری طرح یقین نہیں کیا تھا، اور شریف حسین کے شبہ کو بھی لارنس نے یہ کہکر دور کر دیا تھا کہ انگلینڈ

نے جو وعدہ کیا ہے وہ حرف بحرف پورا کیا جائیگا۔

لیکن اب جو برطانیہ اور فرانس کا یہ خفیہ معاہدہ طشت ازبام ہوا تو شریف حسین اور فیصل کے غم و غصے کی کوئی انتہا نہ رہی۔ لیکن اس نوبت پر غم و غصے کا اظہار بعدازوقت اور خلاف تدبر تھا۔ اس لئے فیصل نے شریف حسین کی رہنمائی کی اور اسے اس بات پر آمادہ کرلیا کہ پیرس میں جو صلح کانفرنس کا اعلان کیا گیا ہے۔ اس کانفرنس میں عربوں کے نمایندے اپنا مطالبہ پیش کریں اور آئینی طور پر شام اور فلسطین پر اپنے نسلی حقوق ثابت کریں۔ بڑی ردوکد کے بعد شریف حسین اس پر راضی ہوا، اور عربوں کا ایک وفد فیصل کی قیادت میں پیرس کانفرنس کے آگے مطالبات پیش کرنے روانہ ہوگیا۔

لارنس جو ابھی تک "عربوں کا دوست تھا، عربی وفد کی آمد کے موقع پر یہ فوراً مارسیلیز پہونچا اور فیصل کو ساتھ لے کر پیرس آیا۔ اس موقع پر فرانسیسی حکومت کے طرز عمل سے یہ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ برطانیہ فیصل کے معاملہ میں جسقدر دلچسپی لے رہا ہے فرانس اس کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا، لیکن فرانس کی اس سرد مہری سے فیصل بددل نہیں ہوا اور اس نے کانفرنس کے آگے مطالبات پیش کرنیکی تیاریاں شروع کردیں۔

فیصل کی سیاسی سوجھ بوجھ کے اصلی جوہر اسی کانفرنس میں کھلے اگرچہ اس سے پہلے فیصل کو مغربی قوتوں کی کسی کانفرنس کا تجربہ نہ تھا۔ لیکن اس موقع پر جس خوبی اور قابلیت کے ساتھ فیصل نے اپنے مطالبات پیش کئے وہ اس بات کا ثبوت تھا کہ فیصل عربوں میں ایک استثنائی قابلیت کا سیاسی مدبر ہے۔ جسے برطانیہ اور فرانس نظرانداز نہیں کرسکتے اور نہ اس کے

مطالبات کو ٹال سکتے ہیں۔

اس کانفرنس میں برطانیہ کی پوزیشن بہت نازک تھی۔ جنگ عظیم میں عربوں کو اپنے ساتھ ملانے کے لئے ایک طرف عربوں سے حتمی وعدے کر لئے تھے، دوسری طرف یہودیوں کو فلسطین کے متعلق زبان دیدی تھی اور تیسری طرف سلطنت عثمانی کے عربی صوبوں کو فرانس کے مشورے سے اس طرح تقسیم کر دیا تھا کہ فلسطین پر برطانیہ کا اقتدار رہے، اور شام اور اس کے شمال کا علاقہ یعنی جنوبی آرمینیا بشمول اس سے دیار بکر تک فرانس کے حوالے کر دیا تھا۔

اب بحث یہ تھی کہ ان متعدد اور متضاد قسم کے معاہدوں کی تکمیل کس طرح کی جائے کہ کسی قوم کو شکایت کا موقع نہ ملے۔

ظاہر ہے کہ فرانس کو برطانیہ دبا نہیں سکتا، یہودیوں کو زبان دیکر پھر نہیں سکتا تھا اس لئے کہ وہ یہودیوں کا مقروض تھا۔ اب آجا کر رہ گئے عرب جنھیں برطانیہ نے جنگ کے دوران میں لاکھوں پونڈ اور بے حساب اسلحہ دیئے تھے اور ان کو کامیاب بنانے میں خود بھی حصّہ لیا تھا فرانس انھیں دبانا چاہتا تھا۔ لیکن وعدہ ان سے بھی برطانیہ نے کر لیا تھا، اس لئے عربوں کو دبانے میں برطانیہ علانیہ فرانس کا ساتھ نہیں دینا چاہتا تھا البتہ اس کانفرنس میں برطانیہ کی کوشش یہی رہی کہ کسی طرح عرب نمایندوں سے ایسا تصفیہ ہو جائے کہ برطانیہ پر وعدہ خلافی کا الزام نہ آسکے۔

فیصل نے کانفرنس میں جو انداز اختیار کیا وہ سراسر فرانس کے خلاف

تھا فیصل کا کہنا یہ تھا کہ شام کی جنگ عربوں نے فتح کی ہے۔ برطانیہ بیشک اس جنگ میں عربوں کا مددگار رہا۔ لیکن اس ساری لڑائی میں فرانس نے کوئی فوجی مدد عربوں کو نہیں دی۔ لڑائی کے آخری دور میں برائے نام فرانس کا ایک فوجی دستہ شام میں بھیجا گیا تھا۔ جو لڑنے کے بجائے نمائش کا کام دیتا رہا۔ اس ایک فوجی دستے کے بَل پر فرانس کا دعویٰ ہرگز شام پر تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

شام کے علاوہ فیصل نے فلسطین اور عراق کو بھی عرب سے جُدا کرنیکی سختی سے مخالفت کی۔ وہ کسی ایسی تجویز کو سُننے تک کا روادار نہ تھا جسکی رُو سے فلسطین کے سلطنت یہود بن جانے کا امکان پیدا ہو جائے۔ اُسے اس پر اصرار تھا کہ فلسطین ایک علیحدہ ملک نہیں ہے بلکہ سرزمین شام کا ایک صوبہ ہے۔ اس اعتبار سے فلسطین کبھی شام سے اور عرب ممالک سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اس نے یہ بات مان لی تھی کہ اگر یہودی فلسطین میں بسنا چاہیں تو عربوں کو اس پر اعتراض نہ ہوگا۔ وہ اپنے مدرسے علیحدہ کھول سکتے ہیں اور اپنی تہذیب کے مرکز بھی فلسطین میں قائم کر سکتے ہیں بلکہ وہ فلسطین کی حکومت میں بھی حصّہ لے سکتے ہیں لیکن بالکل اس طرح جس طرح اقلیتیں کسی اکثریت کے ساتھ حکومت میں شریک ہوتی ہیں۔ یہ کبھی نہ ہوگا کہ یہود فلسطین میں اکثریت حاصل کرلیں یا حکومت فلسطین پر قبضہ حاصل کرلیں۔ فلسطین عربوں کی سرزمین ہے عربوں ہی کی رہے گی، اس کی حیثیت ہمیشہ سے عرب سلطنت کے ایک جزو کی سی ہے، اور یہی حیثیت اسکی ہمیشہ برقرار رہیگی۔

فیصل نے اس کانفرنس میں عربوں کے خیالات کی پوری پوری نمائندگی

کی، اور اس گفت و شنید کے دوران میں ایسا مدبرانہ انداز قائم رکھا جو مغرب کے تجربہ کار مدبروں کو متاثر کئے بغیر نہ رہا۔

عربوں کے سارے مطالبات تو ظاہر ہے کہ مغربی قومیں منظور نہیں کر سکتی تھیں تاہم فیصل کی دلیلوں کے آگے اس حد تک وہ ضرور جھک گئیں کہ "بیروت" کو علیحدہ کر کے انھوں نے شام میں "فرانس کے زیر سایہ" عربوں کی حکومت کا قیام منظور کر لیا۔ اور فلسطین کے مسئلے کو کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھا۔ مقصد یہ تھا کہ اس وقت فیصل سے اُلجھنے کے بجائے معاملہ کو ٹھنڈا کر کے اپنی مرضی کے مطابق فیصلہ کر لیں۔

پیرس کانفرنس کے خاتمہ کے بعد فیصل انگلستان آیا اور یہاں برطانوی حکومت کے بڑے بڑے عہدہ داروں سے ملاقات کر کے دمشق واپس ہوا۔ شام کے بڑے بڑے شہروں میں فیصل کی واپسی کی خوشیاں منائی گئیں، اور دمشق نے نہایت تزک و احتشام سے اپنے نجات دھندہ کا استقبال کیا اور یوروپ سے واپس آنے کے چند ہی دنوں بعد نہایت دھوم دھام سے دمشق میں فیصل کی تاجپوشی ہوئی۔ اور فیصل شام کا بادشاہ منتخب ہو گیا۔

فیصل نے جنگ عظیم میں جس کامیابی سے ترکوں کے مقابلہ میں عرب فوجوں کی قیادت کی تھی اور پیرس کانفرنس میں جس مدبرانہ انداز میں عربوں کے مطالبات پیش کئے تھے یہ گویا اس کا صلہ تھا، اور فیصل ذاتی طور پر اس کا اہل اور مستحق بھی تھا۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ فیصل اس صلہ سے تادیر متمتع نہ ہو سکا۔ اور اپنی تاجپوشی کے صرف بارہ مہینے بعد ہی اسے اپنی بادشاہت سے دستبردار ہونا پڑا۔ یہ حقیقتاً اس پر ظلم تھا کہ اس نے جس سرزمین کو اپنی تلوار کے زور سے فتح کیا تھا اور جہاں کی بادشاہت اس کا جائز حق تھا۔ اس حق سے اسے محروم کر دیا جائے

لیکن فیصل کے ساتھ یہ ظلم ہوا اور اس طرح ہوا کہ حکومت برطانیہ بھی اس کی مدد نہ کر سکی۔

اصل میں فیصل کی تاجپوشی کے بعد ہی حکومت شام کے سامنے دو اہم سوال آگئے۔ پہلا سوال یہ تھا کہ فرانسیسی "آقاؤں" کو کس طرح خوش کیا جائے، اور دوسرا یہ کہ اتنا روپیہ کہاں سے آئے جو شام کے نظم و نسق کو دوبارہ سبنھالا جائے۔

روپئے کے سوال کا جہاں تک تعلق تھا فیصل نے اسے ذاتی طور پر حل کرنے کی کوشش کی۔ اپنا ذاتی سرمایہ حکومت شام کے نذر کر دیا۔ لیکن کام اس سے بھی نہ بنا۔ رہا تعلقات کا معاملہ یہ اس سے بھی زیادہ مشکل ثابت ہوا۔ اپنی طرف سے تو فیصل نے انتہائی کوشش کی کہ حکومت شام اور حکومت فرانس کے تعلقات بگڑنے نہ پائیں۔ لیکن وروزی قبائل نے فیصل کی کوششوں کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ امیر عبدالقادر نے ابتدا ہی میں شریف حسین اور فیصل کے خلاف دروزیوں میں جو زہر پھیلا دیا تھا وہ برابر اپنا کام کر رہا تھا۔ چنانچہ فیصل کی تاجپوشی کے بعد بھی ان قبائل نے فیصل کو اپنا بادشاہ تسلیم نہیں کیا۔ اور برابر ملک کے نظم و نسق میں رخنے ڈالتے رہے۔ اسی کے ساتھ حکومت کے بعض شعبوں پر اقتدار قائم رکھنے کے متعلق فرانس اور فیصل میں کچھ اختلاف پیدا ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ اختلاف اس قدر بڑھا کہ نوبت جنگ و پیکار تک پہونچی، اور فرانس نے فیصل کو الٹی میٹم دیدیا کہ وہ ۲۰ر اگست ۱۹۲۰ء تک شام کی سرحد سے باہر ہو جائے۔ ورنہ فرانسیسی فوجیں دمشق پر حملہ کر دینگی۔ اس الٹی میٹم کے ساتھ ہی فرانسیسی فوجوں کی نقل و حرکت بھی شروع ہو گئی۔ اور فیصل کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ رہا کہ وہ فوراً اپنے متعلقین اور اسٹاف کو

لے کر دمشق سے چلا جائے۔

سر رونلڈ اسٹورس نے اپنی کتاب "اورینٹینس" میں وہ آخری مراسلت درج کی ہے جو فیصل اور حکومت فرانس کے درمیان ہوئی تھی، اس مراسلت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فیصل آخر وقت تک فرانس سے مصالحت کرنے اور اسکے سارے مطالبات تسلیم کرنے کو تیار تھا لیکن حکومت فرانس اس کے لئے تیار نہیں تھی کہ وہ آئندہ بھی فیصل سے کوئی تعلق رکھے یا شام پر اس کا اثر تسلیم کرے۔

جس وقت حکومتِ فرانس نے اپنے بیروت کے گورنر کی معرفت فیصل کو شام پر فرانسیسی انتداب تسلیم کرنیکا الٹی میٹم دیا اور ساتھ ہی دمشق کی طرف فرانسیسی فوجیں بھی روانہ کر دیں تو فیصل نے ۲۱۔ جولائی کو بیروت کے گورنر کو لکھا:۔

"آپ کے ۲۱۔ جولائی کے مراسلہ میں جو شرائط درج تھیں ان کو تمام و کمال تسلیم کر لینے کے بعد بھی یہ معلوم ہوا ہے کہ آپ کی فوجیں دمشق کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ لیکن میں بے وجہ خون خرابہ پسند نہیں کرتا۔ اس لئے درخواست کرتا ہوں کہ اپنی فوجوں کی پیش قدمی روک دیجئے تاکہ ان باتوں پر غور ہو سکے جو آپ نے آج ہی ذریعہ تار ہمارے آگے پیش کی ہیں۔ میں اپنی حکومت کا ایک افسر ان معاملات میں حکومت دمشق کی طرف سے گفتگو کرنے کے لئے آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں۔"

"فیصل"

فیصل کے اس خط کے جواب میں بیروت کے فرانسیسی جنرل کی طرف

سے دو صورتیں فیصل کے آگے پیش ہوئیں "شام چھوڑ دو، یا ہم سے جنگ کرو" فیصل نے ۲۴ر جولائی کو پھر لکھا ہے۔

"ہم جنگ نہیں کرنی چاہتے لیکن آپ کے آخری مطالبہ کو اگر ہم تسلیم کرلیں۔ توہم یقیناً خانہ جنگی میں مبتلا ہوجائیں گے اور میری حکومت کے سارے ممبروں کی اور خود میری جان خطرہ میں ہوگی۔ ہم آپ کے ۱۴۔ جولائی کے الٹی میٹم کی شرائط تمام وکمال تسلیم کرنیکو تیار ہیں بلکہ چار شرطیں ہم پوری بھی کرچکے ہیں اور باقی شرائط بھی ہم نہایت وفاداری سے پوری کردیں گے۔ اگر آپ کی فوجیں شام کے ان مقامات سے ہٹ جائیں جن پر وہ اس وقت قابض ہیں۔

"فیصل"

فیصل کے اس انتہائی عاجزانہ خط کے جواب میں بیروت کے فرانسیسی گورنر کا نہیں بلکہ اس کے ماتحت فوجی مشن کے صدر کرنل تولات کا یہ مختصر اور رسمی مراسلہ ۲۷۔ جولائی کو فیصل کو پہونچتا ہے:۔

"میں حکومت فرانس کا یہ فیصلہ "یور رائل ہائی نس" کے گوش گذار کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے یور رائل ہائینس مع اپنے متعلقین اور ذاتی اسٹاف کے حجاز ریلوے کے ذریعہ دمشق چھوڑدیں۔ اسٹیشن پر یور رائل ہائی نس اور متعلقین کے لئے ایک اسپیشل ٹرین موجود ہے۔ جو کل ۲۸۔ جولائی ۱۹۲۰ء کی صبح پانچ بجے یور رائل ہائنس کو لیکر روانہ ہو جائے گی"

لیکن جب فیصل نے حکومت فرانس کے اس مراسلے پر بھی عمل نہ کیا تو ۳۱۔ جولائی کو فرانسیسی ہوائی جہازوں سے دمشق پر فیصل کے خلاف چھپے ہوئے

اشتہارات پھینکے، اور دھمکی دی کہ اگر ۲۔ اگست ۱۹۲۰ء تک فیصل شام کی سرحد سے باہر نہ ہو گیا تو فرانسیسی فوجیں دمشق پر چڑھائی کر دیں گی۔

اس آخری تنبیہہ کے بعد بچارے فیصل کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار باقی نہ رہا کہ دوسرے ہی دن اپنے متعلقین اور اسٹاف کے ساتھ دمشق سے حیفا روانہ ہو جائے۔

تاریخ میں شاید کسی فاتح کی اس درجہ بے بسی کی کوئی نظیر نہیں ملے گی کہ جس سرزمین کو وہ اپنی تلوار کے زور سے فتح کرے اور جہاں کی بادشاہت کو وہ اپنا جائز حق سمجھے وہاں سے اپنے منظفر و منصور داخلہ کے صرف بارہ مہینے بعد اس بری طرح نکالا جائے!

فیصل شام کا فاتح تھا، اپنی تلوار کے زور سے اس نے یہ ملک حاصل کیا تھا.......... اور اسلامی ممالک کی نظروں میں حقیر ہو کر اس نے یہ فتح حاصل کی تھی۔ اپنی ذات اور اپنی قوم پر آڑے وقت میں ترکوں سے غداری کا الزام لیکر یہ معرکہ سر کیا تھا۔ اس توقع کے ساتھ اپنی قوم کو مدت کی چھنی ہوئی دولت آزادی سے مالا مال کر دے گا، اور صدیوں بعد ایک زبردست اور باجبروت آزاد عرب سلطنت کی بنیاد ڈال دے گا۔ لیکن افسوس کہ اس کی یہ توقع پوری نہ ہو سکی۔ شام ترکوں کی غلامی سے آزاد ہوا تو فرانس کی غلامی میں چلا گیا، اور فیصل فاتح ہو کر مفتوح بن گیا!!

لیکن فیصل کی اب بھی برطانیہ سے توقعات وابستہ تھیں اور فی الحقیقت اس انتہائی مایوسی کے عالم میں برطانیہ ہی اس کا آخری سہارا رہ گیا تھا

—— جنرل البنی اس وقت مصر میں تھا فیصل حیفا سے فوراً مصر روانہ ہوگیا، اس خیال سے ساتھ کہ شاید البنی شام کے معاملہ میں اس کی مدد کرسکے لیکن اب زمانہ امن کا تھا البنی سوائے "ڈھارس" کے فیصل کو اور کچھ نہ دے سکا۔ فیصل البنی سے مایوس ہوکر لندن پہنچا، یہاں کی فضا بدل چکی تھی، اور حکومت برطانیہ کسی قیمت پر راضی نہیں تھی کہ اپنے حلیف فرانس کو ناراض کرے اور اُصولاً وہ فیصل اور فرانس کے معاملات میں مداخلت کر بھی نہیں سکتی تھی۔ اس لئے کہ جنگ عظیم کے بعد عراق و عرب تقریباً سارے کا سارا کسی نہ کسی انداز سے برطانیہ کے زیر اقتدار آگیا تھا۔ اور اس مال غنیمت میں فرانس کو صرف ایک چھوٹا سا ٹکڑا شام کا ملا تھا۔ اب اس چھوٹے سے ٹکڑے میں بھی اگر برطانیہ فرانس کے اقتدار کو چیلنج کر بیٹھتا تو یہ اس کی سراسر زیادتی ہوتی۔ جس کے بعد اس کو مجلس اقوام میں شرمندہ ہونا پڑتا۔ یہی وجہ تھی کہ برطانیہ نے فیصل کو خواہ مخواہ فرانس سے سر منڈھنے کی کوشش نہیں کی، اور نہ شام سے اُسے نکالے جانے کے واقعہ کو کوئی اہمیت دی۔ لیکن حکومتِ برطانیہ چونکہ فیصل کو بھی کورا نہیں ٹال سکتی تھی اس لئے اس نے پوری توجہ سے فیصل کی بپتا سُنی اور جہاں تک زبانی ہمدردی اور ڈھارس کا تعلق تھا، اس میں اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ لیکن فیصل کی مشکلات کا کوئی فوری حل اس کے پاس نہ تھا۔ اور نہ فوراً ہی کوئی حل وہ دریافت کرسکی۔

جس زمانہ میں حکومت فرانس فیصل سے اُلجھ رہی تھی اسی زمانہ میں برطانیہ کے لئے بھی عراق میں مشکلات پیدا ہوگئی تھیں۔ ترکی کے ان جنوبی مشرقی صوبوں کو فتح کرنے کے بعد برطانیہ نے انھیں اپنے انتداب میں لے لیا تھا، اور جنگ

عظیم کے خاتمہ کے بعد سے وہاں برابر برطانیہ کا ہائی کمشنر حکومت کر رہا تھا۔
۱۹۲۰ء میں عراقیوں کو اپنی صحیح حالت کا احساس ہوا۔ ان میں کچھ بیداری پیدا
ہوئی اور انھوں نے حکومت برطانیہ سے یہ مطالبہ کرنا شروع کیا کہ عراق کو عراقیوں
کے حوالے کر دیا جائے اور برطانیہ اگر چاہتی ہے تو اپنا اثر حکومتِ عراق پر رکھ
سکتی ہے۔ اس مطالبہ کی آواز جب لندن پہونچی تو حکومت برطانیہ نے اپنے
ہائی کمشنر کو لکھا کہ عراقیوں کے ذمہ دار وفد سے گفتگو کرے اور ان کے کم سے کم
مطالبات دریافت کرے۔ ہائی کمشنر نے اس حکم کے مطابق عراق کے
ذمہ دار افراد کے ایک وفد کو باریاب ہونیکا موقع ضرور دیا۔ لیکن حرکت یہ کی
کہ اس وفد میں کچھ اپنے آدمی بھی شامل کر دیئے، اور جب یہ وفد عراق میں
حکومتِ خود اختیاری کا مطالبہ لے کر ہائی کمشنر کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ
ہائی کمشنر نے نہایت صفائی کے ساتھ وفد کو یہ جواب دیدیا کہ حکومت خود اختیاری
یا ذمہ دار حکومت عراق کے لئے بہت دور کی منزل ہے، جس تک پہنچنے
کے لئے عراق کو ابھی بہت سارا راستہ طے کرنا باقی ہے۔

ہائی کمشنر کے اس کورے جواب کے بعد عراق میں برطانیہ کے خلاف باقاعدہ
ایجی ٹیشن شروع ہو گیا۔ بلکہ عراق کے بعض علاقوں میں کھلم کھلا بغاوت
ہو گئی۔ حکومت برطانیہ نے اس شورش کو دبانے کے لئے امدادی فوج عراق
بھیجی، جس نے شورش پسندوں کے گاؤں کے گاؤں تباہ کر دیئے اور
ہزاروں آدمیوں کو اس جرم میں جیلوں میں ٹھونس دیا۔ بظاہر شورش ختم ہو گئی
لیکن عراق کی حکومت کا مسئلہ اب بھی وہیں کا وہیں رہا۔ عراق کے باشندے
اس کے لئے کسی طرح تیار نہیں تھے کہ برطانیہ ان پر حکومت کرے، ان
کی دلیل یہ تھی کہ ہم نے ترکوں کے خلاف اس لئے جنگ نہیں کی تھی کہ ہم

ترکوں کی غلامی سے نکل کر برطانیہ کی غلامی میں آجائیں بلکہ ہم نے آزادی کی خاطر جنگ کی تھی اور برطانیہ کا ہم سے وعدہ بھی یہی تھا کہ ہماری آزادی تسلیم کرلی جائے گی۔ اب جبکہ جنگ ختم ہو چکی ہے۔ برطانیہ کو چاہیئے کہ ہماری آزادی تسلیم کرے۔

فیصل جس وقت لندن پہونچا ہے، عراق کا یہ قضیہ حکومت برطانیہ کے آگے پیش تھا، اور اس وقت تک حکومت برطانیہ نے یہ طے نہیں کیا تھا کہ عراق کا طرز حکومت کس انداز کا تجویز کیا جائے۔

اس نوبت پر بغاوتِ عرب کا بانی اور فیصل کا پرانا دوست کرنل لارنس جو جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد اپنی خوشی سے گوشۂ گمنامی میں چلا گیا تھا ایک دفعہ پھر اسٹیج پر نمودار ہوا تا کہ اس آڑے وقت میں اپنے دوست کے کام آسکے۔ لارنس نے اس موقع پر اخباروں میں متعدد مضامین لکھے اور فیصل کے حقوق ثابت کرنے میں اپنا پورا زور صرف کر دیا۔ فیصل کی حمایت میں اس مسلسل پروپیگنڈے کا نتیجہ یہ ہوا کہ برطانوی عوام کو فیصل کے معاملہ سے ہمدردی پیدا ہوگئی، اور لندن کی فضا میں ابتداءً جو سرد مہری پائی جاتی تھی وہ جاتی رہی۔ اس حد تک کامیابی کے بعد لارنس نے فیصل کے معاملہ کو سلجھانے کی ایک اور تجویز سوچی۔ اس نے کچھ دنوں کے توقف کے بعد لندن کے مشہور اخبار ذی ٹائمس میں عراق کی سیاسی کشمکش پر ایک زبردست مقالہ لکھا جس میں برطانیہ کی پالیسی پر نہایت سختی سے اعتراضات کئے اور یہ ثابت کیا کہ حکومت برطانیہ لاکھوں پونڈ ہفتہ وار بے وجہ عراق پر خرچ کرتی رہی ہے۔ جس سے سلطنت برطانیہ کو فائدہ کے بجائے نقصان پہنچ رہا ہے اور سیاسی کشمکش علیحدہ برطانیہ کے گلے کا ہار بنی ہوئی ہے، جسے کسی طرح برطانوی ہائی کمشنر نہیں سلجھا سکتا۔ اسکے بعد اس نے ایک ایک کر کے ان مشکلات کو

برطانوی پبلک کے آگے پیش کرنا شروع کر دیا جو عراق میں برطانوی حکومت قائم رکھنے کی صورت میں پیش آنی لازمی تھیں، اور یہ مشکلات ایسی تھیں جنہیں حکومت برطانیہ لاکھوں پونڈ صرف کر کے بھی ادا نہ کر سکتی تھی۔

لارنس کی یہ تدبیر کارگر ہوگئی۔ برطانوی پبلک میں ہر طرف عراق کے نقصان دِہ مصارف کا چرچا ہونے لگا، اور پارلیمنٹ میں بھی کئی مرتبہ عراقی حکومت کی پالیسی کو چیلنج کیا گیا۔ اسقدر زمین ہموار کرنے کے بعد لارنس نے پھر فیصل کے معاملہ کو اُٹھایا۔ "ٹائمس" میں اس موضوع پر اس نے ایک زبردست مقالہ شائع کرایا۔ جس میں وہ لکھتا ہے :۔

"انگلستان میں عام طور پر یہ احساس پایا جاتا ہے کہ فرانس نے فیصل کو جو شام سے بیدخل کر دیا، جہاں اسے احسان مند شامیوں نے تخت نشین کیا تھا یہ فیصل کے اس احسان کا جو جنگ عظیم میں اس نے ہم پر کئے تھے اچھا بدل نہیں ہو سکتا۔ فی الحقیقت یہ خیال ہی ہمارے لیئے سوہانِ رُوح ہے کہ ہم احسان کا بدلا اُتار نے میں اپنے ایک عرب دوست سے پیچھے رہ گئے۔

حجاز کی بغاوت کو کامیاب بنانیکا سہرا در اصل فیصل ہی کے سر ہے۔ جس نے اپنی جرأت اور اپنے سیاسی تدبر سے کام لے کر شام اور فلسطین میں ہمیں نہایت قیمتی مدد پہونچائی فیصل نے جو عرب فوج ہماری مدد کو فراہم کی تھی اس کا کارنامہ اختصار کے ساتھ اس طرح بیان ہو سکتا ہے کہ اس نے شام کی جنگ میں تقریباً ۳۵ ہزار ترکوں کو گرفتار کر لیا۔ اور تقریباً اتنے ہی ترکوں کو ہلاک یا زخمی کیا۔ ڈیڑھ سو کے قریب ترکی توپیں چھینیں، اور ترکوں کے مقبوضہ تقریباً ایک لاکھ

مربع میل علاقے پر قبضہ کرلیا۔

ہمارے نزدیک اس وقت میں عربوں نے یہ ایسی مدد ہمیں دی ہے کہ ہم اسے نظرانداز نہیں کرسکتے۔ بلکہ ہم عربوں کے مقروض ہیں اور ہمارا فرض ہے کہ ہم انھیں اس کا صلا دیں اور فیصل جو عربوں کا لیڈر ہے وہ دوہرے اعزاز و اکرام کا مستحق ہے کہ اس نے نہایت وفاداری اور نہایت سرگرمی کے ساتھ ایلنبی کی ماتحتی میں ہماری مدد کی ہے۔

ہمیں یہ شکایت نہیں ہے کہ فرانس نے فیصل کے ساتھ کیا سلوک کیا، اس لئے کہ فرانس کو برطانیہ کے مقابلہ میں عرب میں صرف ایک ٹکڑا ملا ہے۔ علاوہ اس کے فرانس نے جو کچھ فیصل کے ساتھ شام میں کیا وہی ہم عراق میں کررہے ہیں۔ اس اعتبار سے ہمیں کیا حق ہے کہ ہم فرانس پر کوئی اعتراض کرسکیں۔

البتہ عراق کی طرزِ حکومت کا معاملہ اس وقت ہمارے زیرِ غور ہے اس میں شک نہیں کہ وہاں حکومت کرنے کے لئے ہمیں ایسے انگریز افسر مل جائیں گے جو عربوں سے زیادہ اچھی طرح انتظام کرسکیں گے لیکن یہ ہماری غلطی ہوگی، ایسی ہی غلطی جیسی کہ اس وقت عراق میں ہم سے سرزد ہورہی ہے، جس کے باعث ہر ہفتے ایک لاکھ پونڈ ہم پر جرمانہ ہورہا ہے۔ ہم اس وقت ہر حیثیت سے قوی ہیں ہمیں چاہئے کہ ہم کھلے دل سے اپنی غلطی کا اعتراف کرلیں اور عراق میں نئے خاندان کی بادشاہت قائم کرکے اس غلطی کا کفارہ ادا کریں جو ابتک ہم سے ہوتی رہی ہے اور اس طرح تاریخ کا ایک نیا ورق اُلٹ دیں ؎

لارنس کے اس مقالہ نے فیصل کے مسئلہ کو دارالعوام میں ایک قطعی صورت میں پیش کر دیا۔ اور چونکہ اس میں کافی وزن بھی تھا اس لئے حکومت برطانیہ نے اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی حامی بھرلی۔

۱۹۲۱ء میں برطانوی کابینہ میں تبدیلی ہوئی، ونسٹن چرچل وزیر نوآبادیات مقرر ہوئے۔ کرنل لارنس اگرچہ عملی سیاست سے کنارہ کش ہو چکا تھا لیکن چرچل نے بہ اصرار اُسے اپنے شعبہ میں بحیثیت مشیر کھینچ لیا۔

لارنس کے محکمہ نوآبادیات میں پہونچنے کے تھوڑے ہی دنوں بعد عراق کا معاملہ سُلجھ گیا۔ اور حکومت برطانیہ نے فیصل کو عراق کا بادشاہ تسلیم کر لیا۔

اس طرح شام کا تخت چھن جانے کے بعد فیصل کو عراق کا تخت مل گیا۔ اور اس معاملہ میں بھی اسی شخص نے فیصل کی مدد کی جس نے ترکوں کے خلاف عربوں کی کامیاب بغاوت میں فیصل کو مدد دی تھی۔

عراق کا تخت فیصل کو پیش کر کے گویا انگریز فیصل کے قرض سے ادا ہو گئے اور واقعہ یہ ہے کہ مع سود کے ادا ہو گئے۔ اس لئے کہ شام کے ساتھ تو محض مذہبی روایات وابستہ تھیں۔ لیکن عراق کو تمدنی اور سیاسی دونوں حیثیتوں سے شام ہی پر نہیں سارے حجاز پر فوقیت حاصل تھی۔

اس سرزمین کے لئے نہ صرف اس کا پُر عظمت ماضی ہی سرمایہ امتیاز ہے بلکہ مستقبل میں بھی ایک آزاد عرب سلطنت کے قیام کی توقعات اگر پوری ہو سکتی ہیں تو محل و قوع کے اعتبار سے اسی سرزمین سے پوری ہو سکتی ہیں۔

صدیوں اس سرزمین پر عباسیوں نے حکومت کی اور اب صدیوں بعد اس پر ہاشمیوں کو اقتدار ملا ———— عباسیوں کا جانشین ہاشمیوں کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟

حکومت برطانیہ نے جب یہ طے کر لیا کہ عراق کا تخت فیصل کو پیش کر دیا جائے تو اتمام حجت کے لئے یہی تجویز اس نے عراقیوں کے آگے رکھدی۔ ۱۹۲۱ء میں برطانیہ کے وزیر نو آبادیات ونسٹن چرچل دورے پر مصر پہونچے۔ وہیں عراقیوں کا ذمہ دار وفد ان سے ملا۔ اور اس نے برطانیہ کی پیش کردہ تجویز اس شرط کے ساتھ منظور کر لی کہ اگر ملک کی اکثریت فیصل کے حق میں ہوئی تو فیصل کو عراق کا بادشاہ تسلیم کر لیا جائیگا۔

وفد کی منظوری کے بعد حکومت برطانیہ کی طرف سے فیصل کو باقاعدہ عراق کا تخت پیش کیا گیا۔ اس شرط کے ماتحت کہ عراق پر بدستور برطانوی انتداب قائم رہے گا۔ لیکن فیصل نے اس شرط کو منظور نہیں کیا، بلکہ اپنی طرف سے دو شرطیں حکومت برطانیہ کے آگے پیش کر دیں، ایک یہ کہ عراق کی حکومت خود مختار ہوگی۔ دوسری یہ کہ انگریزوں نے جو قوانین رائج کر رکھے ہیں وہ یک قلم منسوخ کر دیئے جائیں گے۔ بڑی ردّ و قدح کے بعد برطانیہ نے فیصل کی دونوں شرطیں بطور بنیاد بحث تسلیم کر لیں اور فیصل جو اس وقت اٹلی میں تھے بغداد آ گئے۔

۱۱۔ جون ۱۹۲۱ء کو ملک کے ذمہ دار افراد کی ایک مجلس شوریٰ منعقد ہوئی۔ اور اس مجلس نے فیصل کو ۹۶ فیصدی آرا کی حمایت سے اپنا بادشاہ منتخب کر لیا۔

۲۳۔ اگست ۱۹۲۱ء کو بڑے اهتمام کے ساتھ بغداد میں امیر فیصل کی رسم تاجپوشی ادا ہوئی۔ اور جلالت الملک شاہ فیصل نے نہایت تزک و احتشام سے سلاطین عباسیہ کے تخت پر جلوس فرمایا۔ اس موقع پر برطانوی کمشنر

نے شاہ جارج پنجم کا تار امیر فیصل کی خدمت میں پیش کیا۔ جس میں شاہ جارج نے جلالت الملک کو تخت نشینی کی مبارکباد دی تھی۔

سلطنت عراق قدیم ترکی سلطنت کے تین صوبوں بغداد، بصرہ اور موصل پر مشتمل ہے۔ ان میں موصل کے صوبہ کو اس کے تیل کے چشموں کے باعث بڑی اہمیت حاصل ہے۔ برطانیہ بھی اسی صوبہ کے باعث عراق سے تعلق رکھنے پر مصر رہا۔ اور ترکوں کو بھی ان تینوں صوبوں میں موصل ہی سے ہمیشہ دلچسپی رہی۔

کل آبادی عراق کی ۲۸ لاکھ ۴۹ ہزار ہے۔ اس میں سُنی مسلمان ۱۱ لاکھ اور شیعہ ۱۴ لاکھ ہیں۔ ان کے علاوہ تقریباً ۸۷ ہزار یہودی اور ۸۷ ہزار عیسائی آباد ہیں۔ عیسائیوں میں ایک فرقہ "آشوریوں کا بھی تھا جو جنگ عظیم کے دوران میں عراق کی سرحد کے اندر آبسا تھا۔ اس فرقہ نے حکومت عراق کو بہت دِق کیا، اور ملک کے نظم ونسق میں بڑے رخنے ڈالے۔ لیکن بالآخر حکومت عراق اس فتنے کے استیصال میں کامیاب ہوئی اور اب عراق میں آشوریوں کی تعداد برائے نام ہے۔

عراق کے سُنی اور شیعوں میں تعلقات روادارانہ ہیں۔ اگرچہ بعض اوقات عقائد کا اختلاف فساد کی صورت بھی اختیار کر جاتا ہے۔

شیعوں اور سُنیوں کے علاوہ عراق میں دو سیاسی پارٹیاں بھی ہیں۔ ان میں سے ایک پارٹی وحدت عربیہ کی حمایت میں ہے، اور دوسری اس کے خلاف ہے۔ سیاسی اقتدار کے لئے ان دونوں پارٹیوں کی کش مکش عراق کی سیاست کو ہمیشہ مدّوجزر میں رکھتی ہے۔

امیر فیصل نے اپنی باعدہ تاجپوشی کے بعد حکومتِ برطانیہ سے اپنی ان شرائط کی تکمیل کا مطالبہ کیا جن پر تاجپوشی کے وقت حکومت برطانیہ نے غور کرنے کا وعدہ کر لیا۔ اس سلسلہ میں حکومتِ عراق اور حکومتِ برطانیہ کے درمیان بڑی طویل گفتگو رہی اور بالآخر ۱۹۲۳ء میں عراق اور برطانیہ میں یہ معاہدہ ہو گیا کہ:۔

"عراق جیسے ہی مجلس اقوام کا ممبر منتخب ہو جائے گا برطانوی انتداب عراق پر سے اُٹھا لیا جائے گا۔ لیکن ہر صورت میں یہ مدت ۱۹۲۸ء سے زیادہ طویل نہ ہو گی۔"

اس معاہدے کے بعد گویا عراق کی خودمختاری کی ایک مدّت معیّن ہو گئی۔ اب عراق کے لئے اس مدت میں یہ ثابت کرنا رہ گیا کہ وہ خود مختار حکومت کا اہل اور مجلسِ اقوام میں نشست حاصل کرنیکا مستحق بھی ہے یا نہیں۔ چنانچہ امیر فیصل نے اس معاہدہ کے فوراً ہی بعد عراق کی رائے عامہ کی تربیت بھی شروع کر دی اور ملک کے نظم و نسق میں اصلاح کی طرف بھی توجہ کی۔

شروع ۱۹۲۴ء میں عراق کو ایک نیا دستور عطا ہوا جسکی رُو سے ملک میں ایک اسمبلی اور ایک سنٹ کے قیام کی منظوری دی گئی۔ اس دستور میں امیر فیصل اور اس کے جانشینوں کو ملک کا جائز بادشاہ تسلیم کیا گیا، اور سنٹ کے ممبروں کی نامزدگی شاہ عراق کی مرضی پر چھوڑی گئی۔ البتہ اسمبلی کے ممبروں کے انتخاب کا حق ملک کو دیدیا گیا۔ اگرچہ بالکل ابتدائی اصلاحات تھیں، لیکن اس نئے دستور کے نفاذ کے بعد عراق نے آئینی ترقی کی طرف بہر حال پہلا قدم اُٹھا لیا۔

ہم پچھلے صفحات میں بتا چکے ہیں، موصل سے ترکوں کو بھی تعلق تھا اور

برطانیہ کو بھی دلچسپی تھی، چنانچہ جب کمال اتاترک کی ماتحتی میں ترکی جمہوریہ عالم وجود میں آئی تو اس نے لیگ اقوام سے مطالبہ کیا کہ موصل کا علاقہ ترکی جمہوریہ کے سپرد ہونا چاہیئے۔ اس لئے کہ موصل کو جنگ عظیم کے دوران میں انگریزوں نے فتح نہیں کیا ہے بلکہ حالتِ صلح میں ان کی فوجیں موصل پر قابض ہوئی ہیں جو اصولاً جائز نہیں قرار دیا جاسکتا۔ لیکن لیگ اقوام میں برطانوی اثر کافی تھا اس لئے ترکوں کا یہ مطالبہ پورا نہ ہوسکا۔ اور عراق کو کم سے کم ۲۵ برس کیلئے برطانیہ کی ضمانت میں دے کر موصل کو عراق کی سرحد میں شامل کردیا گیا۔

لیگ اقوام کے اس تصفیہ کے بعد موصل پر سے ترکوں کا دعویٰ اُٹھ گیا اور اُسے براہِ راست برطانیہ سے تعلق ہوگیا۔ برطانیہ کو موصل سے زیادہ موصل کے تیل سے دلچسپی تھی اس لئے اس نے اس علاقے میں اپنے اقتدار کو زیادہ سے زیادہ بڑھانا شروع کردیا جس کے باعث عراق کو برطانیہ سے شکایت پیدا ہوئی اور یہ شکایت بطور احتجاج برطانوی پارلیمنٹ تک پہونچی، عراقیوں نے برطانیہ کو اپنا وعدہ یاد دلایا کہ اس نے سنہ ۱۹۲۸ء تک عراق کو آزاد حکومت تسلیم کرلینے کا اقرار کیا ہے۔ لیکن موصل کے متعلق جو پالیسی حکومت برطانیہ نے اختیار کر رکھی ہے وہ اس وعدے کے خلاف ہے۔ اس کے جواب میں برطانیہ نے ایسا انداز اختیار کیا جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ابھی عراق سے اپنا انتداب اُٹھانے کے مسئلہ کو ٹالنا چاہتی ہے۔ اس پر عراق میں برطانیہ کے خلاف پھر ایک مرتبہ ایجی ٹیشن شروع ہوگیا، اور بہت جلد اس ایجی ٹیشن نے ایسی صورت اختیار کرلی کہ سارے ملک میں برطانیہ کے خلاف بغاوت کا اندیشہ پیدا ہوگیا اور فیصل کی حکومت بے بس نظر آنے لگی۔

اس صورتِ حال سے بچنے کے لئے حکومت عراق اور حکومتِ برطانیہ

کے درمیان ۱۹۲۷ء میں دوبارہ گفت وشنید ہوئی اور برطانیہ نے عراق کو آزاد سلطنت کی حیثیت سے تسلیم کر لیا، اور اس کے جواب میں عراق نے اس کا اقرار کر لیا کہ عراق اپنی خارجہ حکمت عملی میں برطانوی ہائی کمشنر کے "مشورے" کا پابند رہے گا۔

ابتداءً برطانیہ کو عراق سے فوراً انتداب اٹھا لینے میں دو وجوہ سے تامل تھا۔ ایک وجہ تو موصل کا تیل تھی اور یہی وجہ اہم بھی تھی، اور دوسری "آشوریوں" کے توطن کا مسئلہ تھا۔ موصل کے تیل پر عراق اور برطانیہ میں باہم سمجھوتہ ہو گیا، اور موصل کے تیل پر برطانیہ کو اقتدار مل گیا، رہا آشوریوں کا معاملہ ۱۹۲۷ء میں اور اس کے بعد بھی اس مسئلہ کی جو صورت قائم رہی اس کے پیش نظر برطانیہ کو اس کے متعلق چونکہ کوئی اندیشہ نظر نہ آیا اس لئے اس نے آشوریوں کے معاملہ کو عراق کی حکومت کے سپرد کر کے عراق کی آزادی کے مطالبہ کو تسلیم کر لیا اور اس معاہدے کے چار برس بعد حسب وعدہ عراق کو مجلس اقوام کا ممبر بھی بنا دیا۔

۱۳۔ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو خود مختار عرب سلطنت کی حیثیت سے عراق کا مجلس اقوام میں باقاعدہ داخلہ ہوا، اور اس موقع پر مجلس اقوام کے سکریٹری نے یہ اعلان کیا:-

> "آج ہماری مجلس میں ایک نئی آزاد حکومت داخل ہو رہی ہے جس کے بعد ہماری مجلس کی خود مختار حکومتوں کی تعداد جو اب تک ۵۲ تھی ۵۳ ہو گئی"

عراق کی خود مختاری کے اعلان کے ساتھ ہی آشوریوں کی چھوٹی سی اقلیت

کی حفاظت کا مسئلہ اُٹھا اس لئے کہ عربوں اور آشوریوں کے تعلقات ابتدا ہی سے ناگوار تھے، اور آشوریوں کو جو عراق کے باشندے نہیں تھے یہ اندیشہ تھا کہ عربوں کی آزاد سلطنت میں ان کے سیاسی اور سماجی حقوق محفوظ نہ رہ سکیں گے۔ چنانچہ مار شمعون جو ان کا قومی لیڈر تھا وہ آشوریوں کے قومی مطالبات لے کر لیگ اقوام میں پہونچا کہ آشوریوں کی قومی انفرادیت تسلیم کر لیجائے۔ عراق میں بسنے کے لئے انھیں ایک علاقہ دیا جائے اور آشوریوں کا حاکم مار شمعون کو بنا دیا جائے جو ان کا مذہبی پیشوا بھی ہے۔

لیگ اقوام آشوریوں کے ان مطالبات کو تسلیم نہیں کر سکتی ہے، اس لئے کہ اول تو عراق ایک آزاد سلطنت تھی اور اس سلطنت کی مرضی کے خلاف اسکی سرحدات کے اندر لیگ آشوریوں کو کوئی علاقہ دینے کی مجاز نہیں تھی۔ دوسرے مار شمعون کو اصولاً آشوریوں کا حاکم نہیں تسلیم کر سکتی تھی اس لئے کہ ایسا کرنے سے حکومت عراق کے اقتدار میں فرق آتا تھا۔ چنانچہ لیگ نے مار شمعون کو ہدایت کی کہ بجائے لیگ اقوام کے وہ خود حکومت عراق سے اس معاملہ میں گفتگو کرے، اور آپس میں سمجھوتے کی کوئی صورت نکال لے۔

لیکن مار شمعون اور اس کے ساتھیوں نے یہ صحیح اور صاف راستہ اختیار کرنے کے بجائے حکومت عراق کے خلاف بغاوت کر دی۔ حکومت عراق نے فوجی قوت سے اس بغاوت کو دبایا۔ اور ہزاروں آشوریوں کو بے دریغ تہ تیغ کر ڈالا۔

آشوری، دراصل قدیم سلطنت آشوریہ کے نام لیوا ہیں۔ جو صدیوں سے ترکی سرحد پر کردوں اور ارمنوں کے درمیان "ہکیاری" علاقہ کے پہاڑوں میں آباد چلے آتے تھے۔ ۱۹۱۶ء میں جنگ عظیم کے دوران میں زار کی سلطنت نے انھیں ترکوں

کے خلاف اُبھارا روس کی باقاعدہ فوج میں تو انھیں بھرتی نہیں کیا لیکن رات کے وقت ترکوں کے گاؤں پر حملہ کرکے انھیں تباہ و برباد کر دینے کا کام ان کے سپرد کیا گیا۔ آشوریوں نے یہ کام بڑی خوبی سے انجام دیا، اور سارے علاقے میں ترکوں پر مسلسل شبخون مار کر انھیں بدحواس کر دیا۔ لیکن آشوریوں کی بدقسمتی سے ۱۹۱۷ء میں خود روس میں بغاوت ہو گئی اور آشوریوں کے ساتھ روسیوں کی ساری دلچسپیاں ختم ہو گئیں۔ اب آشوریوں کی پوزیشن بہت نازک تھی، اپنی حرکتوں سے اُنھوں نے ترکوں کو اپنا دشمن بنا لیا تھا اور حمایتی ان کا کوئی آس پاس رہا نہ تھا۔ اس لئے آشوری فوراً ترکی علاقہ سے عراق کی طرف انگریزوں کی پناہ میں آ گئے۔ انگریزوں نے ان آشوری پناہ گزینوں کے لئے "باقوبہ" میں ایک کیمپ قائم کر دیا۔ جہاں یہ دو برس تک برطانیہ کے "مہمان" رہے۔ اس دو برس کے عرصہ میں حکومتِ برطانیہ نے یہ طے کر لیا کہ آشوریوں کے فوجی دستے بنائے جائیں تاکہ عراق سے برطانوی فوجوں کی روانگی کے بعد یہ ان کی قائم مقامی کر سکیں۔ اس طرح آشوری برطانوی فوج میں بھرتی ہوئے اور اکثر موقعوں پر بڑے اچھے سپاہی ثابت ہوئے۔ لیکن برطانوی فوج میں بھرتی ہونے کے بعد ہی در اصل ان کا دماغی توازن بگڑ گیا اور وہ اپنے آپ کو بھی برطانیہ کے ساتھ عراق کا فاتح سمجھنے لگے۔ اس غلط فہمی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اور عربوں کے تعلقات بگڑ گئے، اور رواداری کا احساس طرفین سے جاتا رہا۔

۱۹۲۷ء میں حکومتِ برطانیہ نے عراق کی خود مختاری کا مطالبہ تسلیم کر لیا، اور ۱۹۳۲ء میں اپنا انتداب عراق سے اُٹھا لینے کا وعدہ کر لیا۔ اب آشوریوں کو اپنے متعلق فکر پیدا ہوئی۔ لیکن چار سال کا زمانہ چونکہ کافی

طویل تھا۔ اس لئے آشوریوں نے برطانیہ کے اس اعلان کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ البتہ ۱۹۳۲ء کے شروع میں جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ اسی سال کے اکتوبر تک عراق پر سے برطانوی اقتدار اٹھ جائیگا اور عراق خود مختار ہو جائے گا۔ تو انھیں تشویش پیدا ہوئی۔ ان کا لیڈر مارشمیون، لیگ اقوام میں جنیوا پہنچا اور جب وہاں بھی اس کی شنوائی نہیں ہوئی تو وہ بغداد واپس آ گیا اور یہاں آ کر اس نے آشوریوں کے فوجی دستوں کو بطور احتجاج برطانوی فوج سے بے تعلق ہو جانے پر آمادہ کر دیا۔ برطانیہ پر یہ دھمکی کارگر ہو گئی، اور اس نے اپنی وساطت سے مارشمیون اور حکومت عراق کے درمیان آشوریوں کی آبادی کے مسئلہ پہ گفت و شنید شروع کرا دی۔

آشوریوں کی آبادی کا مسئلہ بڑا بہت پیچیدہ۔ جس علاقے میں یہ جنگ عظیم سے پہلے رہا کرتے تھے وہ جمہوریہ ترکیہ کے ماتحت تھا، اور جنگ عظیم میں ترکوں کے ساتھ آشوریوں نے جو حرکت کی تھی اس کے بعد ترک اس کے روادار نہیں تھے کہ یہ لوگ پھر اس کی سرحد میں آ بسیں۔ ایران کو آشوریوں سے کوئی ہمدردی نہیں تھی جو اپنے علاقے میں انھیں پناہ دیتا۔ آ جا کر عراق رہ گیا تھا۔ جہاں آشوریوں کو پناہ مل سکتی تھی۔ لیکن عراق ان کے لئے کوئی علاقہ مخصوص کرنے کو تیار نہیں تھا۔

چنانچہ طویل گفت و شنید کے بعد حکومت عراق نے فیصلہ کیا کہ عراق کے سرحدی علاقوں میں جہاں جہاں آشوریوں کو جگہ ملے پھیل جائیں۔ یہ علاقے چونکہ کردوں کی آبادی سے گھرے ہوئے تھے اس لئے حکومت عراق نے آشوریوں کو اپنے ساتھ ہتھیار رکھنے کی بھی اجازت دیدی۔

حکومت عراق کے اس فیصلے کو حکومت برطانیہ نے بھی تسلیم کر لیا، اور

سوڈان سے ایک انگریز افسر عراق بلایا کہ وہ آکر اپنی نگرانی میں آشوریوں کو سرحدی گاؤں میں آباد کردے۔ لیکن مارشمیون اور اسکے ساتھی حکومت عراق کے اس فیصلے سے مطمئن نہیں ہوئے۔ اور چپکے چپکے حکومت عراق کے خلاف بغاوت کی تیاریاں کرنے لگے۔ آشوریوں کو اصل میں اپنی فوجی قوت کا زعم تھا۔ اسی سال ان کے دس ہزار جوان انتداب کے خاتمہ کے بعد برطانوی فوج سے علیحدہ ہوئے تھے ان کے دماغوں میں یہ ہوا تھی کہ عرب ان کی منظم جماعت کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ اور خود عربوں کو بھی یہ اندیشہ تھا کہ لڑائی میں آشوریوں کے سامنے ان کی پیش نہ جائے گی۔ ان مسلسل غلط فہمیوں کے باعث آشوری دب کر حکومت عراق سے سمجھوتہ کرنیکو تیار نہ ہوئے۔

جولائی سنہ ۱۹۳۳ء میں آشوریوں کی ایک جماعت جس میں ۸۰۰ آشوری مرد شامل تھے، عراق کی سرحد عبور کرکے شام میں داخل ہوگئی۔ اس خیال کے ماتحت کہ شاید حکومت فرانس ان کو وہاں بس جانیکی اجازت دیدے۔ لیکن حکومت فرانس بجائے اس کے کہ انھیں اپنے علاقے میں بسنے کی اجازت دیتی ان کی اپنی سرحد پر موجودگی ہی سے بدحواس ہوگئی، اور حکومت عراق کو لکھا کہ ان ہتیار بند آشوریوں کو فوراً عراق واپس طلب کرلے۔ عراق نے حقوق ہمسائیگی کا خیال کرتے ہوئے مزید آشوریوں کو شام جانے سے روک دیا اور شام کی حکومت کو لکھا کہ جو آشوری اس کے علاقے میں آگئے ہیں ان سے ہتیار لےکر انھیں عراق واپس کردے۔ لیکن حکومت فرانس نے نہ معلوم کس وجہ سے آشوریوں کے ہتیار نہیں لئے بلکہ انھیں ہتیار سمیت عراق کے علاقے میں واپس کردیا۔ فرانس کی اس فروگذاشت کا نتیجہ یہ ہوا کہ آشوریوں کے

...۱۹ اہتیار بند جوان جب شام سے مایوس ہو کر دجلہ پار آ گئے تو انھوں نے مایوسی اور غصے میں "فیش خیبر" کی عراقی چوکی پر حملہ کر دیا۔ اور وہاں کے عراقی گارڈ کا خاتمہ کر کے خود چوکی کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ ڈالا۔

اس زمانہ میں عراق کی شمالی فوجوں کی کمان بکر صدیقی پاشا کے پاس تھی جو آشوریوں کی دشمنی میں بہت بدنام تھا۔ اس پاشا کو جب آشوریوں کی اس حرکت کا علم ہوا تو...... بغداد کو اطلاع کئے بغیر اپنی فوجیں لے کر فیش خیبر پر چڑھ گیا۔ اور اس کے بعد آشوریوں کا جو حشر ہوا وہ وہی تھا جو ترکی کے مشہور جنرل قرہ بکر پاشا نے ارمنوں کا کیا تھا۔

تین دن تک پہاڑوں میں آشوریوں اور بکر صدیقی پاشا کی فوج میں لڑائی ہوتی رہی اور تین دن بعد وہ سارا علاقہ آشوریوں سے صاف تھا۔

اس لڑائی کے دوران میں موصل اور بغداد کے درمیان ہر قسم کے ذرائع رسل و رسائل بند تھے، اور ٹیلیفون اور تار برقی کی لائنیں بھی کاٹ دی گئی تھیں۔ جس کے باعث پایۂ تخت کو اس لڑائی کا تین دن تک بالکل علم نہ ہو سکا۔ اور علم ہوا بھی تو اس وقت جب ساری لڑائی ختم ہو چکی۔

امیر فیصل اس وقت یورپ کی سیاحت میں مصروف تھے اور ان کے ولی عہد غازی بغداد میں ان کی نیابت کر رہے تھے۔

بعض واقعہ نگاروں نے آشوریوں کے قتل عام کا الزام غازی پر لگایا ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ غازی گو اس وقت ولی عہد تھا۔ لیکن حکومت کے نظم و نسق میں اس کو اس قدر دخل حاصل نہیں تھا۔ واقعات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آشوریوں سے لڑنے کی ذمہ داری صرف بکر صدقی

پاشا پر ہے، اور یہی پاشا ان کے استیصال کا موجب ہوا ہے۔

عربوں اور آشوریوں کی اس ٹکر سے طرفین کی غلط فہمیاں دور ہوگئیں اور آشوریوں کی آبادی کا مسئلہ جو اس دوران میں اس قدر پیچیدہ ہوگیا تھا نہایت آسانی سے حل ہوگیا۔ اس لڑائی میں جتنے آشوری بچ رہے تھے انھوں نے چپ چاپ اپنے ہتیار حکومت عراق کے حوالے کر دیئے۔ اور جہاں انھیں جگہ ملی یا جو جگہ ان کے لئے منتخب کی گئی بلا حیل وحجت یہ وہاں جا بسے۔

مغربی ممالک نے اس قتل عام کے خلاف بڑا شور مچایا۔ اور حکومت عراق پر سخت سے سخت اعتراضات کئے۔ لیکن واقعات سے چونکہ یہ ثابت ہو چکا تھا کہ زیادتی ابتداءً آشوریوں کی طرف سے ہوئی تھی اس لئے کچھ دنوں بعد یہ معاملہ رفع دفع ہوگیا۔

آشوریوں کے استیصال کے ساتھ ہی عراق کی ساری الجھنیں دور ہو چکی تھیں اور شاہ فیصل اطمینان سے اپنا اصلاحی پروگرام ملک میں نافذ کرنا چاہتے تھے۔ لیکن افسوس کہ موت نے اتنی فرصت نہ دی۔ ۲ ستمبر ۱۹۳۳ء کو جب وہ دوسری مرتبہ یوروپ کی سیاحت کے لئے بغداد سے روانہ ہوئے تو پھر انھیں زندہ بغداد آنا نصیب نہ ہوا۔ سوئٹزرلینڈ کے ایک مقام "برن" میں یکایک حرکت قلب بند ہو جانے سے ان کا انتقال ہوگیا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

شاہ فیصل کے بعد شاہ غازی تخت نشین ہوئے۔ لیکن اس بادشاہ میں وہ جوہر نہیں تھا جو شاہ فیصل میں پایا جاتا تھا۔ ان کے زمانے میں بکر صدقی پاشا نے فوجی قوت کے بل پر نومبر ۱۹۳۶ء میں حکومت پر قبضہ کر لیا اور ملک کا ڈکٹیٹر بن بیٹھا۔ شاہ غازی برائے نام عراق کے بادشاہ رہے۔ لیکن اس کا دورِ حکومت زیادہ دنوں قائم نہیں رہا۔ ایک ہی برس کے اندر اندر جولائی ۱۹۳۷ء میں ایک سپاہی کی گولی سے یہ ہلاک ہو گیا۔ اور عراق میں پھر دستوری طرز کی حکومت قائم ہو گئی۔

اپریل ۱۹۳۹ء میں خود شاہ غازی کو موٹر کا حادثہ پیش آیا اور یہ غریب بھی راہی ملک بقا ہو گیا۔ اس کی جگہ اب اس کا لڑکا فیصل دوم کے نام سے عراق کا بادشاہ ہے۔ اور چونکہ یہ ابھی کم سن ہے۔ اس لئے شاہ غازی مرحوم کے چچا علی جو فیصل دوم کے نانا بھی ہوتے ہیں ان کے ریجنٹ مقرر ہوئے۔

فیصل کے متعلق کرنل لارنس کی رائے تھی کہ "یہ بظاہر نہایت زندہ دل مرنجان مرنج اور بے پروا قسم کا انسان نظر آتا ہے۔ لیکن فی الحقیقت یہ بڑا زبردست "ڈپلومیٹ" اور مصلحت شناس مدبر ہے جو سخت سے سخت زمانے میں بھی اپنے حواس ٹھیک رکھتا ہے۔

جنگِ عظیم کے دوران میں اور اس کے بعد ایک سے زیادہ موقعوں پر اس کی سیاسی سمجھ بوجھ اور مصلحت اندیشی کا تجربہ ہوا۔ خصوصاً پیرس کی صلح کانفرنس میں تو فیصل نے اپنی حاضر جوابی اور انتہائی مدبرانہ انداز سے یورپ کے سیاست دانوں کو بدحواس کر دیا۔ لیکن اسی کے ساتھ فیصل نہایت بااصول اور ایماندار شخص ہے۔ اس نے ایک مرتبہ اپنی پالیسی متعین کر لی۔

اور تمام عمر اسی پر قائم رہا۔"

لارنس اگرچہ اسلامی دنیا میں ایک بدنام ترین شخصیت ہے۔ لیکن فیصل سے اس کی ذاتی دوستی تھی جس کو لارنس نے آخر وقت تک نباہا۔ مدتوں یہ فیصل کے ساتھ رہا۔ شام میں عرب پیشقدمی کے دوران میں اس کے ساتھ کام کیا۔ اور اسی لئے اوروں سے زیادہ قریب سے اُسے فیصل کے مطالعہ کا موقع مل گیا۔ اور چونکہ اس نے فیصل کے متعلق یہ رائے اس وقت ظاہر کی ہے جب وہ عرب کے معاملات سے بے تعلق اور انگلستان کی عملی سیاست سے کنارہ کش ہو چکا تھا۔ اس لئے ہمارے نزدیک فیصل کے متعلق اس کی یہ رائے باوجود اس کی غیر ثقہ شخصیت کے ذاتی اثر اور سیاسی مصالح سے پاک، نہایت سچّی اور ایماندارانہ ہے۔ جس کی تصدیق آج بھی فیصل کی سیرت اور اس کے کارناموں سے ہو سکتی ہے۔

پیرس کی صلح کانفرنس اور انگلستان کے سفر کے دوران میں فیصل کی "حاضر دماغی" اور حاضر جوابی کے بہت سے لطیفے مشہور ہیں۔ مثلاً فیصل جب صلح کانفرنس میں عربوں کے مطالبات پیش کرنے پیرس پہونچا تو دوسرے ہی دن "ہوٹل ڈی ویلے" میں اس نے فرانس کے بعض سیاست دانوں کی دعوت کی۔ اس دعوت کے اختتام پر فرانس کے ایک مشہور سیاست داں "موسیو دوبو" نے فیصل کو خوش کرنے کے لئے مشرق قریب کے حالات پر ایک مبالغہ آمیز تقریر کی جس میں عربوں کے مطالبات کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ اور فیصل کے ذاتی کارناموں کو بہت کچھ سراہا۔ اس تقریر کے ختم ہونے کے بعد مراقش کے سفیر نے پوچھا

کہ تقریر کیسی رہی؟"

فیصل نے بڑی معصومیت سے جواب دیا:۔

"آپ نے دیکھا موسیو دوبو کے دانت کتنے خوبصورت ہیں"۔

ایک اور موقع پر دس فرانسیسی سیاست دانوں کی کونسل میں عرب مطالبات زیر بحث تھے۔ فیصل نہایت خاموشی سے ایک کونے میں بیٹھا یہ بحث سنتا رہا آخر میں ایک نہایت جوشیلے مدبر موسیو پکاں نے ایک زبردست تقریر کی اور اپنی تقریر میں بار بار یہ جتایا کہ شام کے علاقہ سے جنگ صلیبیہ کے زمانہ سے فرانس کو تعلق ہے۔ اس لئے فرانس کسی قیمت پر اس علاقہ سے دست بردار نہیں ہو سکتا۔

جب موسیو پکان کی تقریر ختم ہو گئی اور اسی کے ساتھ کونسل کا اجلاس بھی برخواست ہو گیا تو فیصل نے اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے موسیو پکان سے نرم اور خلیق انداز میں سوال کیا:۔

"معاف کیجئے تاریخ پر مجھے کچھ اچھا عبور نہیں ہے۔ کیا آپ ازراہ عنایت یہ بتا سکتے ہیں صلیبی جنگوں میں فتح کس کی ہوئی تھی آپ کی یا ہماری؟"

پیرس صلح کانفرنس کے خاتمہ کے بعد جب امیر فیصل پیرس سے رخصت ہونے لگے تو پیرس کے ایک اخبار کا نمائندہ ان کی خدمت میں یہ معلوم کرنے کے لئے حاضر ہوا کہ مغربی سیاست دانوں کے متعلق امیر کا کیا خیال ہے۔ یہ سوال اس اعتبار سے بہت اہم تھا کہ یورپ میں سیاست دانوں سے گفتگو کرنے کا امیر فیصل کے لئے یہ پہلا اتفاق تھا۔ امیر فیصل نے اس سوال کا یہ دلچسپ جواب دیا:۔

"مغرب کے سیاست داں بالکل عہد حاضر کی رنگین نقاشی کی طرح ہیں۔ انھیں گیلری میں ٹانگ کر دُور سے ان کی زیارت کرنی چاہیئے"

پیرس سے جب فیصل لندن پہونچے تو حکومت برطانیہ نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی۔ اپنی حکومت کے مختلف شعبوں کا فیصل کو معائنہ کروایا اور ان کے اعزاز میں ڈنر اور لنچ کی کئی ضیافتیں کیں ایک ایسی ہی ضیافت کے موقع پر لارڈ بالفور نے (جو فلسطین کو وطن یہود بنانے کے ذمّہ دار ہیں) فیصل سے یہ معلوم کرنے کی خواہش کی کہ "حکومت برطانیہ کے متعلق امیر کا کیا خیال ہے"۔

فیصل نے فوراً جواب دیا:۔

"آپ کے اس سوال سے میرے دماغ میں صحرا کے ایک کارواں کی تصویر کھنچ گئی ـــــ اگر آپ دور سے کسی کارواں کو صحرا میں گذرتا ہوا دیکھیں تو آپ کو پیچھے سے یہ سارا کارواں صرف ایک اونٹ نظر آئیگا لیکن جب آپ قریب آئیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ ایک اونٹ کی مہار دوسرے اونٹ کی دُم سے بندھی ہوئی ہوگی اور جب سو پچاس اونٹوں کے زنجیرے کو آپ طے کرکے کارواں کے سرے پر پہونچیں گے تو آپ کو پہلے اونٹ کی مہار ایک چھوٹے سے گدھے کی دُم سے بندھی ہوئی نظر آئے گی جو اونٹوں کے اس سارے کارواں کی صحرا میں رہنمائی کررہا ہوگا"۔

لارڈ بالفور مدّت تک حیران رہے کہ امیر فیصل نے کس کو گدھا بنایا لیکن کبھی ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ امیر کے اس جواب کا کیا مفہوم تھا۔ اور حکومت برطانیہ پر یہ کس طرح چسپاں ہوا۔

فیصل کا ایک اور لطیفہ انگلستان کے نامور شاعر کپلنگ کے ساتھ بھی مشہور ہے فیصل جب دمشق سے نکالے جانے کے بعد لندن پہونچے تو اور لوگوں کے ساتھ "رڈیارڈ کپلنگ" بھی ان کی ملاقات کو آئے۔ سر رونلڈ اسٹورس بھی اس صحبت میں موجود تھے۔ ان کا بیان ہے کہ کپلنگ نے امیر سے پے درپے اونٹوں کے متعلق سوال کرنے شروع کر دیئے۔ ان کا اوسط قد، رنگ نسل، قسمیں۔ حجاز میں ان کی اہمیت وغیرہ وغیرہ غرض اونٹوں سے متعلق جتنے سوال ہو سکتے تھے کپلنگ نے ایک ایک کرکے امیر سے پوچھ ڈالے۔ ابتداً تو فیصل اخلاقاً کپلنگ کے سوالوں کا جواب دیتے رہے۔ لیکن جب یہ سلسلہ کسی طرح ختم ہونے ہی میں نہیں آیا تو فیصل نے کپلنگ کے سامنے ہی سر رونلڈ سے عربی میں پوچھا:۔

"کیا اس شخص نے مجھے اونٹوں کا سوداگر سمجھا ہے "

فیصل نہایت صلح جو اور مرنج و مرنجان شخص تھے۔ عراق کی سرحدیں تین اسلامی ممالک سے ملتی ہیں فیصل نے تخت نشین ہوتے ہی ان تینوں ہمسایہ سلطنتوں سے دوستانہ معاہدے کر لئے۔

جنگ عظیم کے زمانہ میں فیصل نے ترکی سلطنت کے خلاف بغاوت کی تھی۔ لیکن شاہ عراق کا ترکی جمہوریہ سے کوئی اختلاف نہ تھا چنانچہ تخت نشینی کے بعد ہی اُنھوں نے ترکوں سے اپنی صفائی کر لی۔ دوسری سلطنت نجد و حجاز تھی۔ عبدالعزیز ابن سعود اور ان کے والد شریف حسین میں ایک مدت سے لڑائی چلی آتی تھی اور اسی لڑائی کا یہ نتیجہ تھا کہ ابن سعود

نے موقع پاکر شریف حسین کو حجاز سے نکال باہر کیا۔ اور خود سلطانِ نجد و حجاز بن بیٹھا تھا۔ لیکن فیصل کو ابن سعود سے کوئی پرخاش نہیں تھی۔

حجاز کا معاملہ جب یکسو ہو گیا اور ابن سعود باقاعدہ سلطان نجد و حجاز تسلیم کر لیا گیا۔ فیصل نے اس سے بھی صلح کر لی۔ ان دونوں امیروں کی یادگار ملاقات خلیج فارس میں ایک جہاز پر ہوئی تھی جس میں ایک دوسرے کو گلے لگا کر ان دونوں نے اپنے خاندانی اختلافات کو بھلا دیا اور آئندہ کیلئے ایک دوسرے کے حلیف بن گئے۔

تیسری سلطنت عراق کے برابر ایران کی ہے۔ فیصل نے رضا شاہ سے بھی دوستی کر لی، اور خود طہران جا کر شاہ سے نیاز حاصل کیا۔

لیکن ان سب سے گہرا تعلق عراق کا برطانیہ کے ساتھ تھا۔ اور فیصل نے ساری عمر اس تعلق کو پوری وضعداری کے ساتھ نباہ ڈالا۔ اگرچہ اس دوران میں بہت سی باتیں عراق میں برطانیہ کی مرضی کے خلاف ہوئیں اور فیصل نے حکمتِ عملی سے دباؤ ڈال کر ایسی مراعات بھی اپنے حق کے طور پر برطانیہ سے حاصل کر لیں جنھیں برطانیہ عراق کو دینا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود فیصل نے اپنے سے برطانیہ کو کبھی شکایت نہ پیدا ہونے دی۔ بلکہ اس کے برخلاف حکومتِ برطانیہ آخر وقت تک فیصل کو اپنا سچا دوست سمجھتی رہی اور لندن میں فیصل کی مدارات ہمیشہ ایک دوست کی طرح کرتی رہی۔ نومبر ۱۹۳۳ء میں جب بمقام برن حرکت قلب بند ہونے سے یکایک فیصل کا انتقال ہوا ہے، انگلستان کے سارے اخبارات نے برطانیہ کے اس دوست کا سوگ منایا۔ اس کی یاد میں بڑے اچھے اچھے آرٹیکل لکھے اور اس پر افسوس ظاہر کیا کہ فیصل کے انتقال کے باعث عراق کی ترقی اور اصلاحات

کا کام ادھورا رہ گیا، اور یہ واقعہ تھا۔ فیصل نے عراق کی اصلاح اور ترقی کا ایک طویل پروگرام مرتب کیا تھا۔ اگر وہ کچھ دنوں اور زندہ رہتے تو عراق بھی ترکی اور ایران کی طرح اصلاحاتِ جدیدہ سے مالا مال ہو جاتا۔

امیر فیصل اور ان کے والد شریف حسین کی انگریز دوستی اور ان کے ان کارناموں کو جو انھوں نے جنگ عظیم کے دوران میں انجام دیئے غیر عرب اسلامی ممالک کسی اور نظر سے دیکھتے ہیں۔

ان کے نزدیک یہ ترکوں سے کھلی ہوئی غداری تھی کہ ایسے وقت میں جب ترک جنگ عظیم میں سب طرف سے گھرے ہوئے تھے۔ شریف حسین اور ان کے لڑکوں نے دشمنوں سے سازباز کر کے ان پر پیچھے سے وار کیا۔ اور ترکی قوتِ مدافعت کو مجروح کر کے اسے دشمنوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

غیر عرب اسلامی ممالک کا یہ نقطۂ نظر ان حالات کے پیشِ نظر جن کے ماتحت شریفیوں نے ترکوں کے خلاف اعلانِ جنگ کیا ہے یقیناً غلط نہیں کہا جا سکتا۔ اس لئے کہ اب یہ کھلا ہوا راز ہے کہ برطانیہ ہی کے روپئے اور ہتیار کی مدد سے عربوں نے ترکوں سے جنگ کی اور برطانیہ ہی کی شہ پر عربی فوجیں حجاز کی سرحد سے آگے بڑھ کر شام کے ترکی پوزیشن کو کمزور کرنے کا باعث بنیں۔ اور یہ بھی کوئی چھپی ہوئی بات نہیں ہے کہ شریف حسین نے اپنی اس کارگذاری کے صلے میں برسوں برطانیہ سے بیس ہزار پونڈ ماہوار وظیفہ بھی لیا۔ ان شواہد کی موجودگی میں شریفیوں کے خلاف یقیناً الزام سخت ہو جاتا ہے۔ لیکن، اس کے باوجود انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ شریفیوں پر فردِ جرم لگانے

سے پہلے ان کے اپنے نقطۂ نظر کا بھی جائزہ لے لیا جائے۔ اور یہ جانچا جائے کہ اس میں شریفیوں کی صفائی کی کتنی گنجائش موجود ہے۔

عرب بغاوت کی تاریخ پوری تفصیلات کے ساتھ آج منظرِ عام پر آچکی ہے۔ جس کی روشنی میں عرب بغاوت کے اسباب اور اس کی صحیح نوعیت کا تعین کرنا مشکل نہیں رہا۔ چنانچہ ان ہی تفصیلات کی مدد سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جنگ عظیم کے دوران میں شریفیوں نے ترکوں کے خلاف اس لئے بغاوت نہیں کی تھی کہ ترکوں کا جوا اپنے کندھوں سے اتار کر کسی اور قوم کا جوا اپنے کندھوں پر رکھ لیں۔ بلکہ اس بغاوت کا اصلی مقصد جو دوران بغاوت میں بھی ان کے دماغوں میں برابر قائم رہا اور جس کا وہ بار بار اظہار بھی کرتے رہے ہیں۔ سرزمین عرب کی آزادی تھا۔

عرب مدت سے اس نعمت سے محروم تھے، اور مدت سے اپنے قلب کی گہرائیوں میں اس تمنا کو پرورش کرتے رہے تھے کہ دنیا کی آزاد قوموں کے درمیان ان کی بھی جگہ نکل سکے۔ جنگ عظیم میں برطانیہ نے اسی نعمت کا ان سے وعدہ بھی کیا تھا اور عرب صرف اسی شرط پر ان کے ساتھ ہوئے تھے کہ عربوں کی آزاد سلطنت کی تعمیر میں برطانیہ ان کی مدد کریگا۔۔۔۔۔۔ آزادی کی تمنا کرنا اور اس کے لئے جاں فروشی پر آمادہ ہوجانا یقیناً کسی نقطۂ نظر سے معیوب نہیں کہا جاسکتا!

آزادی بخشی نہیں جاتی بلکہ زور بازو سے حاصل کی جاتی ہے۔ عربوں نے بھی اسے اپنے قوت بازو سے حاصل کیا۔ اپنی تلوار کے زور سے چھینا

——— یہ عربوں کی بدقسمتی ہے کہ اپنی آزادی کے لئے انھیں ترکوں سے لڑنا پڑا جو اتفاق سے مسلمان بھی ہیں۔ اگر یہ اسلامی رشتہ ترکوں اور عربوں کے درمیان نہ ہوتا تو عربوں کی آزادی کی جدوجہد کے متعلق اسلامی ممالک کا یہ نقطۂ نظر بھی نہ ہوتا۔

لیکن اس کے باوجود عربوں کی بغاوت پر اصولاً اب بھی کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔ عربوں اور ترکوں میں مذہب کے نام پر جنگ نہیں ہوئی اور نہ عربوں نے مذہب کو آگے رکھ کر ترکوں سے بغاوت کی بلکہ عربوں اور ترکوں میں محض سیاسی اقتدار کے لئے یہ جنگ ہوئی تھی جس کا عرب متعدد مرتبہ دورانِ جنگ میں اظہار کر چکے ہیں۔ اگر ترک مسلمان ہونے کے باوجود مدتوں مسلمان عربوں کو سیاسی حیثیت سے اپنے زیر اقتدار رکھنے میں حق بجانب تھے تو عرب بھی جو ترکوں ہی کی طرح اپنی ایک قومی انفرادیت رکھتے ہیں موقع ملتے ہی ترکوں کے اس سیاسی اقتدار کے جوئے کو اپنے کندھوں سے اُتار پھینکنے میں غیر حق بجانب نہیں ہو سکتے!

اعتراض البتہ برطانیہ کے ساتھ سودا کرنے پر ہو سکتا ہے۔ برطانوی روپیہ اور اسلحہ کی مدد اور برطانیہ کی فوجی طاقت کی رہنمائی میں عربوں کا اپنے مقصد اعلیٰ کے حصول کی جدوجہد کرنا سراسر اسلامی خودداری کے خلاف تھا۔

اسی طرح عربوں نے اپنی آزادی کے لئے جو وقت مقرر کیا تھا وہ بھی صحیح نہ تھا ——— حالتِ امن میں عرب اپنی قومی آزادی کا ہر وقت ترکوں سے مطالبہ کر سکتے تھے، اور ان کے مطالبے

میں اسلامی ممالک بھی یقیناً ان کے ہمنوا ہوتے لیکن ایسے وقت میں جبکہ ترک اپنے سے بڑی طاقت سے نبرد آزما تھے اور اس لڑائی پر ان کی زندگی اور موت کی بازی لگی ہوئی تھی۔ عربوں نے ترکوں کے خلاف ہتھیار اٹھا کر ترکوں کے دشمنوں کو تقویت دی۔ یورپ و ایشیا کی واحد اسلامی سلطنت کو نقصان پہونچایا اور ــــ خود بھی گھاٹے میں رہے۔

آج عربوں کو برطانیہ سے یہ شکایت ہے کہ ۱۹۱۶ء میں اس نے شریف حسین سے جو معاہدہ کیا تھا وہ پورا نہیں کیا۔

جس معاہدے کا عرب آج ذکر کر رہے ہیں اس کی نوعیت یہ تھی کہ قط الامارا پر برطانیہ کو پہلے ہی حملے میں ترکوں نے شکست فاش دی تھی اور برطانوی کمانڈر کو گرفتار کر کے قسطنطنیہ بھیجدیا۔ برطانیہ اس شکست سے بدحواس تھا۔ شریف حسین مول تول پر اڑے ہوئے تھے۔ برطانیہ نے وقت کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے شریف حسین سے گول مول سا وعدہ کر لیا، مقصد یہ تھا کہ عرب کسی طرح بغاوت تو کریں، ترکی پر پیچھے سے ضرب تو لگائیں۔ لیکن کیا برطانیہ اپنے اس وعدے کو حرف بحرف پورا کرنا بھی چاہتا تھا؟ اس کے متعلق عربوں کے دشمنوں کا نہیں بلکہ عرب بغاوت کے روح رواں، عربوں کے جگری دوست اور برطانیہ کے دست راست کرنل ٹامس ایڈورڈ لارنس کا بیان یہ ہے:ـــ

"عرب بغاوت جھوٹی توقعات کے ماتحت شروع ہوئی تھی۔ شریف حسین کی مدد حاصل کرنے کیلئے ہماری وزارت نے سر ہنری میک ماہن، (ہائی کمشنر مصر) کے واسطے سے یہ وعدہ کر لیا تھا کہ (اپنے حلیف

فرانس کے مفاد کا لحاظ رکھتے ہوئے) شام اور عراق میں بھی عرب حکومت کے قیام کی حمایت کی جائے گی۔

لیکن وسیلن کی شرط میک ماہن اور شریف حسین سے پوشیدہ رکھی جو فرانس، برطانیہ اور روس کے درمیان ایک خفیہ معاہدے کے ذریعہ طے ہوئی تھی۔ اور جس کی رو سے ان علاقوں کے بعض حصوں پر ان حلیفوں کا قبضہ اور سارے علاقہ پر ان کا اثر و اقتدار تسلیم کر لیا گیا تھا۔

اس چال بازی کی اطلاع عربوں کو ترکوں سے ملی لیکن مشرق میں چونکہ شخصیتوں پر اعتماد زیادہ کیا جاتا ہے، اس لئے عربوں نے مجھے اپنا مخلص دوست پا کر مجھ سے یہ خواہش کی کہ میں ان افواہوں کی تردید اور برطانوی وعدوں کی توثیق کروں۔

مجھے میک ماہن کے وعدوں اور "سائیکس پیکاٹ" معاہدے کا پہلے سے کوئی علم نہیں تھا۔ جو دورانِ جنگ میں برطانوی دفترِ خارجہ کے بعض شعبوں نے کئے تھے۔ لیکن میں اس قدر بیوقوف بھی نہیں تھا جو یہ نہ سمجھ سکتا کہ اگر اس جنگ میں ہمیں کامیابی ہوئی تو عربوں سے جو ہم نے وعدے کئے ہیں ان کی وقعت ایک ردی کے کاغذ سے زیادہ نہ ہوگی۔

اگر میں عربوں کا ایماندار مشیر ہوتا تو میں انھیں میدانِ جنگ سے اپنے گھروں کو واپس کر دیتا اور کبھی ایسے بیکار اور مہمل وعدوں پر انھیں اپنی جانوں کو خطرے میں نہ ڈالنے دیتا۔

لیکن صورت یہ آپڑی تھی کہ صرف عربوں کا جذبۂ آزادی ہی مشرقی

جنگ میں ہماری فتح کا ضامن ہو سکتا تھا۔ اس لئے میں نے انھیں یقین دلایا کہ برطانیہ نے جب کبھی کسی سے کوئی وعدہ کیا اسے ہمیشہ اور حرف بحرف پورا کیا۔

لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس کے بعد میں نے اور عربوں نے جو کارنامے اس جنگ میں کئے ان پر بجائے فخر کرنے کے آج میں بے انتہا نادم اور سخت شرمندہ ہوں"

"Seven Pillars of wisdom."

کرنل لارنس کا یہ اعتراف اس قدر صاف اور صریح ہے کہ اس پر کسی تنقید کی ضرورت نہیں۔ البتہ اس اعتراف کی روشنی میں شام وحجاز کی جنگ میں عربوں کی صحیح پوزیشن ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ جس کے بعد ہمیں یہ تصفیہ کرنے میں مطلق زحمت نہیں رہتی کہ آزادی کے نشہ میں سرشار مگر سادہ لوح عرب مغرب کی شاطرانہ سیاست کا شکار ہو گئے۔ خود بھی بیوقوف بنے اور ترکوں کی اسلامی سلطنت کو بھی نقصان پہونچایا۔

لیکن ہمارے خیال میں آج ہمیں اس تلخ حقیقت کو یاد رکھنے کی ضرورت نہیں، عربوں نے جنگ عظیم میں ترکوں کو جو نقصان پہونچایا تھا اسے ترکوں نے نہ صرف اپنے فطری تہور اور شجاعت کے بل پر پورا کر لیا۔ بلکہ اپنی سرحدوں پر پہلے سے زیادہ طاقتور اور باوقار ترکی سلطنت قائم کر لی۔ اور عربوں کو اپنی حماقت سے جو نقصان پہونچا تھا اُسے کسی حد تک امیر فیصل نے اپنے ذاتی تدبّر اور شخصی اثر سے عراق میں ایک "نیم آزاد سلطنت" قائم کر کے پورا کر دیا۔

عراق اور ترکی جمہوریہ میں آج صلح ہے۔ نہ صرف صلح ہے بلکہ ان

دونوں ملکوں میں "حلیفانہ" معاہدہ ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ تاریخ نے ترکوں اور عربوں کے تعلقات کا ایک نیا ورق اُلٹا ہے۔ جس میں قرنیہ یہ ہے کہ پچھلی تلخ نوائیوں کے اعادہ کی گنجائش نہ ہوگی۔

عرب اگرچہ آزاد اس وقت بھی نہیں کہے جا سکتے، لیکن ترکوں کی حکومت سے یہ بہر حال آزاد ہو چکے ہیں اور اتفاق سے اس وقت انھیں ایسے مواقع بھی حاصل ہیں۔ جن سے وہ فائدہ اُٹھا کر اپنے قومی اعزاز و وقار کو بڑھا سکتے ہیں۔ اگر عربوں نے صحیح معنی میں اپنی اصلاح اور ترقی کی کوشش کی تو ہمیں یقین ہے کہ خود ترک جو کبھی عربوں کے نزدیک ان کے سدّراہ تھے اب اخلاقی حیثیت سے عربوں کی امداد کرنے میں تامل نہ کریں گے اور ایک ترک ہی نہیں بلکہ سارے عالم اسلام کی ہمدردیاں عربوں کے ساتھ ہونگی۔

سلطان عبد العزیز ابن عبد الرحمٰن الفیصل آل سعود

نجد کا ایک حکمراں، لیکن شکست خوردہ اور جلاوطن خاندان کا نام لیوا ___ فطرتاً شجیع اور زبردست قوتِ ارادی کا مالک سردار قبیلہ جس نے اپنی تنہا کوششوں اور خداداد صلاحیتوں کی مدد سے اپنے خاندان کو قعر ذلت سے نکالا، اپنے قدیم طاقتور خاندانی رقیب کو پامال کیا، اور نہ صرف اپنے جدّ اعلیٰ کی سلطنت کو دشمنوں سے چھین لینے میں کامیاب ہوا بلکہ عملاً سارے نجد و حجاز اور اطراف و جوانب کا بادشاہ بن بیٹھا!

ابن سعود کو عام طور پر ایک قسمت آزما انسان سمجھا جاتا ہے۔ اور یہ صحیح بھی ہے ______ اس کی زندگی کے بکثرت واقعات ایسے ہیں جن میں اس کا عزم و ارادہ عواقب و نتائج کے امکانات و احتمالات سے بے نیاز نظر آتا ہے۔ اور اس کے بیشتر کارنامے ایسے ہیں، جن کی کوئی منطقی توجیہ نہیں ہو سکتی۔

مختصر یہ کہ ناکامیوں اور کامیابیوں کے درمیان، اس کی ساری زندگی جزر و مد کا ایک ناہموار سلسلہ نظر آتی ہے جو پچھلے دس برس پہلے تک آشنائے سکون نہ تھی۔

لیکن یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس کی ذات میں ایسی خوبیاں اور

بڑائیاں جمع ہیں جو سخت سے سخت آزمائشوں اور انتہا سے گذری ہوئی مایوسیوں میں بھی ختم نہ ہوئیں ــــــــــ شجاعت وشہامت اس کے خمیر میں گندھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ خود اعتمادی اور مستقل مزاجی اس کی جبلت محسوس ہوتی ہے۔ غیر متنزلزل عزم اور بے پناہ قوت ارادی اس کی فطری خصوصیت ثابت ہوتی ہے، اور دراصل یہی وہ بڑائیاں ہیں جن سے اس کی غیر معمولی شخصیت تعمیر ہوئی اور جو ایک ایک کرکے اپنے سارے دشمنوں پر فتح مند اور آج سارے عرب پر چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔

عبدالعزیز نومبر ۱۸۸۰ء کی ایک صبح ریاض کے محل میں پیدا ہوئے ان کے والد عبدالرحمٰن اپنے خاندان کے تیسرے بیٹے تھے۔ اس لئے اس وقت ریاض کی حکومت عبدالرحمٰن کے دو بڑے بھائیوں کے درمیان باعثِ نزع بنی ہوئی تھی۔

محمد ابن سعود اعظم اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ تھے، جنھوں نے وہابی عقیدے کے بانی محمد ابن عبدالوہاب کے ساتھ مل کر عرب وسطیٰ میں ایک بڑے علاقہ کو اپنا زیرنگیں کیا اور ریاض، کو اپنی سلطنت کا پائے تخت بنایا۔ اور ترکوں کے اقتدار سے آزادی کا اعلان کر دیا۔ ترکوں کو عرب میں سعودیوں کا بڑھتا ہوا اثر پسند نہ آیا خصوصاً وہابی عقائد کی تبلیغ واشاعت سے انھیں مذہبی حیثیت سے سخت اختلاف ہوا۔ اُنھوں نے اس نئے فتنے کے استیصال کیلئے مصر سے ترکوں کی ایک زبردست تادیبی فوج بھیجی جس نے محمد ابن عبدالوہاب کو گرفتار کرکے قسطنطنیہ پہونچا دیا۔ اور ابن وہاب کے مددگار ابن سعود کی فوجوں کا قلع قمع کر ڈالا۔

اس ضرب سے سعودی مدت تک نہ سنبھل سکے۔ اور ان کی ساری قوت
سمٹ کر ریاض اور اطراف کے چند دیہات تک محدود رہ گئی۔
۱۸۸۰ء میں جب عبدالعزیز پیدا ہوئے ہیں، اسی چھوٹی سی حکومت
کے لئے عبدالعزیز کے چچا عبداللہ اور سعود کے درمیان معرکے پڑ رہے تھے۔

اسی زمانہ میں سعودیوں کے ہمسایہ قبائل "شمّار" اپنے منچلے سردار
محمد ابن رشید کی ماتحتی میں متحد ہو کر بڑے طاقتور ہو گئے تھے۔ انھوں نے
اطراف و جوانب کا بڑا علاقہ فتح کر کے اپنی ایک حکومت بھی قائم کر لی تھی۔ جس کا
پایہ تخت "حائل" تھا۔
ابن رشید نے سعودیوں میں جب پھوٹ دیکھی تو ریاض پر چڑھ دوڑا
اور معمولی سے مقابلہ کے بعد اس کو فتح کر لیا۔ لیکن اس فتح کے بعد عبدالرحمٰن
سے اس نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ اس لئے کہ عبدالرحمٰن بظاہر بے ضرر،
ریاض میں بہت با اثر شخصیت کے مالک اور وہابیوں کے امام تھے۔
البتہ ریاض میں ابن رشید اپنی طرف سے شہر کے انتظام کے لئے ایک
نائب مقرر کر گیا۔
یہ عبدالعزیز کے ہوش کا زمانہ تھا، ابتداً تو کچھ دنوں عبدالعزیز نے
جنھیں ان کے والد ابن سعود کہا کرتے تھے، ریاض کے مدرسہ میں علوم دین
کی ابتدائی کتابیں پڑھیں لیکن فی الحقیقت ان کی تعلیم و تربیت ان کے
والد نے اپنے ہاتھ میں رکھی جو خود بھی بڑے پکّے وہابی تھے اور ابن سعود کو
بھی ایسا ہی اٹھانا چاہتے تھے۔
عبدالرحمٰن اپنے خاندان کی پامالی سے بہت غمگین اور ملول رہا کرتے

تھے۔ اور آل رشید کی ماتحتی توان کے لئے سوہان روح تھی۔ اکثر اوقات وہ عالم اضطراب میں ابن سعود کو سعود اعظم کی فتوحات اور سلطنت کا حال سنایا کرتے۔ اور یہ تمنا کیا کرتے تھے کہ کاش اتنی بڑی سلطنت اس وقت بھی آل سعود قائم کرسکیں۔

کچھ دنوں بعد آل رشید کی ماتحتی عبدالرحمٰن کے لئے ناقابل برداشت ہوگئی، اور انھوں نے آل رشید کی حکومت کے خلاف بغاوت کرکے اس کے نائب کو گرفتار کر لیا۔ اہل ریاض نے اس بغاوت میں عبدالرحمٰن کا پوری طرح ساتھ دیا۔ ابن رشید کو جب عبدالرحمٰن کی بغاوت کا حال معلوم ہوا تو وہ فوراً اپنے قبیلے کے ساتھ ریاض پہونچا۔ آٹھ دن تک عبدالرحمٰن اور ابن رشید میں مقابلہ ہوتا رہا۔ لیکن آخر میں عبدالرحمٰن کو شکست ہوئی۔ اس شکست کے بعد بھی عبدالرحمٰن اور آل رشید میں سمجھوتا ہوگیا۔ لیکن یہ سمجھوتا بھی زیادہ دنوں قائم نہ رہ سکا۔ عبدالرحمٰن نے پھر آل رشید کے خلاف علم جہاد بلند کر دیا۔ لیکن اس مرتبہ اہل ریاض نے ان کا ساتھ نہیں دیا اور ابن رشید نے آسانی سے ریاض کا محاصرہ کر لیا۔ اب کے اس کا ارادہ تھا کہ عبدالرحمٰن اور ان کے سارے خاندان کو ٹھکانے لگا دے تاکہ روز روز کی شورشوں سے نجات مل جائے اس کا حال عبدالرحمٰن کو بھی معلوم ہوگیا وہ یہ سنتے ہی رات کی تاریکی میں اپنے اہل و عیال، ضروری سامان اور اپنے لڑکے ابن سعود کے ساتھ چھپ کر ریاض سے نکل بھاگے۔

آل رشید کے چنگل سے بچ نکلنے کے بعد عبدالرحمٰن مدتوں صحرا میں سرگرداں رہے، کوشش ان کی یہ تھی کہ کوئی بدوی قبیلہ ان کی مدد کو تیار ہو جائے۔ تو وہ اس کی مدد سے پھر ابن رشید سے مقابلہ کرکے ریاض پر قبضہ

کرلیں۔ لیکن اپنی کوششوں میں انھیں کامیابی نہ ہوئی۔ اس لئے مجبور اور سب طرف سے مایوس ہوکر "کویت" آگئے۔

"کویت"، عراق اور حجاز کے درمیان ترکوں کے ماتحت ایک چھوٹی سی عرب ریاست تھی۔ لیکن چونکہ خلیج فارس اس کا بندرگاہ ہے۔ اس لئے تجارتی اعتبار سے یہ بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس زمانے میں محمد شیخ کویت تھا اس نے عبدالرحمٰن کو بڑے اعزاز سے لیا اور ان کا کچھ وظیفہ بھی مقرر کردیا۔ لیکن کچھ دنوں بعد یہ وظیفہ بند ہو گیا۔ اس وقت عبدالرحمٰن کو علم ہوا کہ یہ وظیفہ شیخ کویت کی معرفت عبدالرحمٰن کو ترک دیا کرتے تھے۔

اصل میں اس وقت ترکوں کو عرب وسطیٰ میں ابن رشید کی بڑھتی ہوئی طاقت ناگوار گذرنے لگی تھی اور وہ چاہتے تھے کہ عبدالرحمٰن کو ابھار کر جو ابن رشید کا پرانا رقیب تھا ابن رشید کی طاقت توڑ دیں۔ لیکن ترکوں کو اس چال میں کامیابی نہیں ہوئی۔ عبدالرحمٰن ابن رشید سے بدلا ضرور لینا چاہتے تھے۔ لیکن ترکوں سے وہ اس معاملہ میں مدد لینے کے روادار نہ تھے۔ اس لئے کہ عبدالرحمٰن کو خود ترکوں سے نفرت تھی۔ جب ترکوں کو اپنی اس چال میں ناکامیابی ہوئی تو وہ مدتوں شیخ کویت کی معرفت عبدالرحمٰن کو وظیفہ دیتے رہے اس توقع میں کہ شاید یہ کسی وقت راہ راست پر آجائیں، لیکن اس میں بھی انھیں کامیابی نہ ہوئی تو وظیفہ اُنھوں نے بند کر دیا۔ عبدالرحمٰن پر جب اس وظیفہ کا حال کھلا تو وہ شیخ سے بہت ناراض ہوئے۔ لیکن اقامت مستقلاً کویت ہی میں رکھی۔

یہ ابن سعود کے عنفوان شباب کا زمانہ تھا۔ کویت کا شہر، دریا فواحر

صحرا کی بدویانہ زندگی کے بعد نوجوان ابن سعود کو جنت ارضی معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اپنے والد کی سخت تربیت کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ یہاں بھی لہو و لعب میں مبتلا نہ ہونے پائے۔ اس کے برخلاف شیخ کویت اور اس کے بھائی مبارک کی صحبت میں ملکی سیاست کو سمجھنے اور اپنی حالت پر غور کرنیکا مادہ ان میں پیدا ہو گیا۔

کچھ دنوں بعد کویت میں حالات بدل گئے۔ شیخ محمد اپنے بھائی شیخ مبارک کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ اور اس کی جگہ شیخ مُبارک ہی کویت پر تخت نشین بھی ہوا۔ شیخ مُبارک اور ابن سعود میں کافی دوستی تھی۔ ابن سعود کو اس کی تخت نشینی کے بعد یہ توقع ہو گئی کہ وہ آلِ رشید سے مقابلہ کرنے میں اسکی مدد کریگا۔

اسی دَوران میں "شمّار" کا مشہور سردار محمد ابن رشید بھی انتقال کر گیا، اور اس کی بجائے عبدالعزیز ابن رشید سردار مقرر ہوا۔ لیکن عبدالعزیز میں قبائل کو متحد رکھنے کی وہ صلاحیت نہیں تھی جو محمد ابن رشید میں تھی۔ نجدیوں نے بہت جلد اس کمزوری کو بھانپ لیا اور کویت میں عبدالرحمٰن کو لکھا کہ وہ فوراً نجد آ کر آلِ رشید سے مقابلہ کی تیاریاں کریں نجدی ان کا ساتھ دینے کو تیار ہیں۔ اس اطلاع کے ملتے ہی ابن سعود مارا مارا نجد پہونچا۔ لیکن وہاں جا کر معلوم ہوا کہ نجدیوں کے ساتھ دینے کی اطلاع غلط تھی۔ اسے آل رشید کے مقابلہ میں نجدیوں کو کوئی مدد نہیں مل سکے گی۔ مایوس اور نا امید ہو کر ابن سعود پھر کویت واپس آ گیا۔ لیکن اب کے اس نے شیخ مُبارک کو بڑی مشکل سے اس پر آمادہ کیا کہ وہ آل رشید کے مقابلہ میں اسکی مدد کریگا۔

لیکن ابھی مبارک ابن سعود کو مدد دینے کے متعلق سوچ ہی رہا تھا

کہ خود وہ ایک مصیبت میں مبتلا ہو گیا۔ شیخ مبارک نے اپنے بھائی کو قتل کیا تھا اور خود بادشاہ ہو جانے کے بعد اس نے برطانیہ سے تعلقات بڑھا لئے تھے۔ ترکوں کو شیخ کویت کی یہ حرکت ناپسند تھی کہ وہ برطانیہ کو کویت میں قدم جمانیکا موقع دے۔ چنانچہ ترکوں نے شیخ کویت کو سزا دینے کیلئے عبدالعزیز ابن رشید کو مقرر کیا اور اسے یہ لالچ دیا کہ کویت اس کو دلا دیا جائیگا۔ اس کے علاوہ اسے یہ بھی شہ دی کہ شیخ کویت نے اس کے پرانے دشمن آل سعود کو پناہ دے رکھی ہے چنانچہ عبدالعزیز اپنی فوج لئے کویت کی طرف بڑھا۔ شیخ مبارک بہت گھبرایا، اس لئے کہ کویت میں کوئی فوج نہیں تھی جو ابن رشید سے مقابلہ کرتی اور وہاں کوئی قلعہ نہ تھا جس میں شیخ قلعہ بند ہو جاتا۔ لیکن ابن سعود نے شیخ کی ہمت بندھائی۔ اور اطراف و جوانب سے شیخ کویت کی حمایت میں کچھ فوج اکٹھی کر کے ابن رشید کے مقابلہ کو کویت سے آگے بڑھا۔ دونوں فوجوں میں مقابلہ ہوا اور ابن سعود کو پہلے ہی دن شکست فاش ہو گئی۔ شیخ کویت نے یہ حال دیکھ کر فوراً انگریزوں سے معاہدہ کر لیا اور انکی حمایت میں چلا گیا۔

عبدالعزیز ابن رشید جب ابن سعود کی فوج کو شکست دیکر کویت کی طرف بڑھا تو انگریزوں نے اسے دھمکی دی کہ شیخ انکی پناہ میں ہے اگر وہ شیخ پر حملہ کرے گا تو انگریز اس سے لڑیں گے۔ عبدالعزیز ابن رشید اس دھمکی کے بعد واپس ہو گیا اور کویت ترکوں کی قیادت سے نکل کر انگریزوں کے زیر اقتدار آ گیا۔

عبدالعزیز ابن رشید کی مراجعت کے بعد ابن سعود نے پھر شیخ کویت سے امداد کی درخواست کی، شیخ تازہ حالات سے ڈرا ہوا تھا۔ فی الفور ابن سعود

کو امداد دینے پر راضی نہ ہوا۔ لیکن جب ابن سعود نے بہت اصرار کیا تو شیخ نے اسے تیس اونٹ، تیس بندوقیں اور دو سو ریال سونے کے دیکر کویت سے رخصت کر دیا۔

ابن سعود تیس اونٹ لے کر اپنے والد اور اپنے خاندان سے رخصت ہوا۔ اور تیس نوجوان جن میں اکثر اسی کے خاندان کے افراد تھے اپنے ساتھ لیکر ریاض کی طرف روانہ ہو گیا۔

ابتداً ابن سعود کو بڑی کامیابی ہوئی عجمان اور آل رشید کی دو چوکیوں کو پے در پے اس نے شکستیں دیں۔ جس سے بہت سا لوٹ کا مال اس کے ہاتھ لگا، لوٹ کا حال سن کر اطراف و جوانب کے بہت سے بدوی بھی اس سے آملے اور کچھ نوجوان ریاض سے اس کی مدد کو آ گئے۔ لیکن کچھ ہی دنوں بعد حالات پھر بدلے ابن سعود کو ہر طرف سے دشمن قبائل نے دبانا شروع کیا۔ مال غنیمت جو جمع تھا وہ خرچ ہو گیا، صحرا کے بدوی اسے چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اور اس کے ساتھ صرف وہ لوگ رہ گئے جو کویت سے اس کے ساتھ آئے تھے۔ یا دس نوجوان ریاض کے تھے اور حبشی غلام تھے۔

ابن سعود کی اس خستہ حالی کی خبر کویت پہونچی تو عبدالرحمٰن اور شیخ مبارک دونوں نے ابن سعود کے پاس قاصد بھیجے کہ وہ فوراً کویت کو واپس آ جائے۔ نوجوان ابن سعود کو ناکام کویت جانا گوارا نہ ہوا۔ اس نے قاصد کے ذریعے یہ یادگار پیغام اپنے والد کو بھیجا:-

"میں اب اس کو زیادہ عرصہ برداشت نہیں کر سکتا کہ ہمارے ملک پر ابن رشید قابض رہے اور ہمارا خاندان دربدر ٹھوکریں کھاتا پھرے۔ میں اب ریاض پر اپنے سر کی بازی لگاؤنگا اور اس وقت تک واپس نہ

نہ آؤں گا جب تک فتح نہ حاصل کر لوں۔

ناکامی سے بہر حال موت بہتر ہے۔"

ابن رشید کی باقاعدہ فوجوں کے مقابلہ میں چالیس جانبازوں کے مختصر سے گروہ کے ساتھ اس قدر زبردست عزم ابن سعود کی ایسی حیرت انگیز جسارت ہے جس کی نظیر فی الحقیقت کسی تاریخ میں نہیں مل سکتی لیکن وہ اپنے اس عزم میں کامیاب بھی ہوا اور اپنی چالیس جانبازوں کی مدد سے اس نے اپنے قدیم خاندانی دشمن سے چھین بھی لیا۔

واقعہ یوں ہوا کہ اس عزم کے بعد کہ یا تو ریاض فتح کر یگا یا اسی کوشش میں اپنی جان دیدیگا۔ ابن سعود نے صحرا کے چکر دار راستے سے رات کی تنہائیوں میں اپنے چالیس جانبازوں کے ساتھ ریاض کا رُخ کیا۔ دن کو یہ گروہ پہاڑیوں میں چھپا رہتا تاکہ صحرائی قبائل اسے نہ دیکھنے پائیں، اور رات کی تاریکی میں یہ سفر کیا کرتا۔ اس طرح منزلیں طے کرتا ہوا ایک رات یہ گروہ ریاض کے نواح میں پہونچ گیا۔ یہاں ابن سعود نے اپنی سواری کے جانور چھوڑ دیئے۔ اور ان کی حفاظت غلاموں کے سپرد کر دی اور انھیں یہ ہدایت کی کہ اگر چوبیس گھنٹے تک ابن سعود اور اس کے ساتھیوں کی انھیں کوئی اطلاع نہ ملے تو وہ کویت چلے جائیں اور عبدالرحمٰن کو اطلاع کر دیں کہ ابن سعود اور اس کے ساتھی ہلاک ہو گئے۔

اس ہدایت کے بعد جانبازوں کا گروہ نہایت خاموشی سے شہر پناہ کی دیوار تک پہونچ گیا۔ پاس سے ایک کھجور کا درخت کاٹ کر اس کا زینہ بنایا اور اس زینے کی مدد سے یہ سب شہر میں اُتر گئے۔ آدھی رات ہو چکی تھی، سارا شہر

غافل تھا۔ قلعہ کے دروازے پر البتہ سنتری گشت کرتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ ابن سعود اپنے ساتھیوں کے ہمراہ چھپتا چھپاتا گورنر کے محل تک پہونچ گیا جو قلعہ کے عین مقابل تھا۔ محل پر پہرا نہیں تھا۔ ابن سعود بڑی چالاکی سے پہلے گورنر کے برابر والے مکان میں داخل ہوا۔ اور پھر اس مکان کی چھت پر سے کود گورنر کے مکان میں پہونچا اس وقت صرف چھ آدمی اس کے ساتھ تھے اور باقی نیچے سڑک پر اس کے اشارے کے منتظر تھے، گورنر کی خواب گاہ میں ابن سعود کو گورنر کی بیوی اور بہن سوتی ہوئی ملیں۔ جنھیں ابن سعود نے کوٹھری میں بند کر دیا۔ انہی دونوں نے ابن سعود کو بتایا کہ گورنر رات کو قلعے میں سوتا ہے۔ علی الصبح قلعہ کا دروازہ کھلتا ہے اور گورنر بہت سویرے قلعہ کے دروازہ سے گھوڑے پر سوار ہو کر سیر کو جاتا ہے۔ ابن سعود نے اپنی کمیں گاہ گورنر کے اس کمرے میں بنائی جو قلعے کے چبوترہ کے بالکل سامنے تھا۔ اور اپنے سارے ساتھیوں کو بھی وہیں بلا لیا۔ علی الصبح قلعہ کا دروازہ کھلا۔ چند غلام گورنر کا گھوڑا لیے ہوئے آتے نظر آئے۔ ابن سعود تیار ہو گیا۔ جیسے ہی گورنر برآمد ہوا ابن سعود ایک جست میں کمرے سے باہر اور دوسری جست میں نعرہ مار کر گورنر کے اوپر تھا۔ گورنر اس غیر متوقع حملہ سے گھبرا سا گیا۔ لیکن بہت جلد اس نے اپنے حواسوں پر قابو پا لیا اور ابن سعود پر تلوار کا وار کیا۔ ابن سعود نے وار خالی دیکر گورنر کو دبوچ لیا۔ اور ابن سعود کے ساتھیوں نے گارڈ کے سپاہیوں کو جو انتہائی بدحواسی میں حالات کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ گولیوں کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ اس ہڑبونگ میں گورنر نکل بھاگا، لیکن ابن سعود کے بھائی کی تلوار سے مارا گیا۔ قلعہ کے چالیس سے زیادہ سپاہی ابن سعود کے ساتھیوں نے کاٹ ڈالے، اور جو باقی بچے وہ بھاگ گئے۔

صبح اہل ریاض کو ابن سعود کی جانبازی کا حال معلوم ہوا۔ یہ لوگ خود آل رشید سے تنگ آگئے تھے۔ انھوں نے ابن سعود کو خوش آمدید کہی اور خود ہی آل رشید کی بقیہ فوجی چوکیوں پر حملہ کر کے اس کی فوجوں کو بھگا دیا۔ اور اس طرح کئی برس بعد ریاض پر سعودیوں کا دوبارہ قبضہ ہو گیا۔

ریاض فتح ہونے کے بعد ابن سعود نے کویت سے فوراً ہی اپنے والد عبدالرحمٰن کو بلایا اور ریاض کا تخت انھیں پیش کر دیا۔ لیکن عبدالرحمٰن اس تخت سے ابن سعود ہی کے حق میں دست بردار ہو گئے۔ کیونکہ اس کا مستحق فی الحقیقت ابن سعود سے زیادہ اور کوئی نہ تھا۔

سعودیوں کی اس فتح کے ساتھ آل رشید سے معاملہ ختم نہیں ہوا بلکہ فتح ریاض کے فوراً بعد آل رشید اور سعودیوں میں دو معرکے اور پڑے لیکن پانسہ پلٹ چکا تھا۔ آل رشید کو دونوں معرکوں میں شکست فاش ہوئی اور ابن سعود ہر معرکے میں مظفر و منصور رہا۔ اطراف و جوانب کے قبائل جو اب تک ابن سعود کا ساتھ دینے میں متامل سے تھے، جوق جوق ابن سعود کے جھنڈے کے نیچے جمع ہونے لگے اور تھوڑے ہی دنوں میں صحرا کے اکثر قبائل اور نجد کا جنوبی حصہ ابن سعود کے زیر اقتدار آگیا، اور ابن سعود باقاعدہ ان قبائل کا سردار بن گیا۔

آل رشید سے پھر بھی چھیڑ چھاڑ جاری رہی۔ لیکن اب کے اس چھیڑ چھاڑ کی صورت دوسری تھی۔ پہلے آل رشید سعودیوں کو دبایا کرتے تھے۔ اب ابن سعود نے آل رشید کو دبانا شروع کیا۔ جنوبی نجد کو زیر کرنے کے

بعد ابن سعود شمالی نجد کی طرف متوجہ ہوا اور "قاسم" کا زرخیز علاقہ جو مدت سے آل رشید کے زیر اقتدار چلا آتا تھا فتح کر لیا۔ اس فتح کے بعد عملاً سارا نجد ابن سعود کے زیر نگیں آ گیا، اور نجدیوں نے اسے متفقہ طور پر امیر نجد تسلیم کر لیا۔

اس نوبت پر ابن سعود کی راہ میں ایک اور مشکل پیش آئی۔ ترکی حکومت جو دور سے بیٹھی آل رشید اور سعودیوں کے معرکے دیکھ رہی تھی وسطی عرب میں سعودیوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو دیکھ کر گھبرائی اور اس نے آل رشید کو فوجی مدد دے کر پھر ابن سعود کے مقابل کر دیا۔ ترکی فوجوں کی مدد سے آل رشید نے قاسم پر حملہ کر دیا۔ ابن سعود نے مدافعت کی اور شکست کھائی۔ لیکن اسکے کچھ ہی دنوں بعد ابن سعود دوسری مرتبہ آل رشید اور ترکی فوجوں کے مقابل ہوا۔ اور انھیں بُری طرح پسپا کر دیا۔ اس شکست کے بعد بصرہ کے ترکی گورنر نے ایک زبردست ترکی فوج ابن سعود کے مقابلے کیلئے بھیجنے کی تیاری شروع کر دی۔ ابن سعود ان تیاریوں کا حال سنکر گھبرایا اور کویت کے شیخ مبارک کو بیچ میں ڈال کر ترکوں سے اس شرط پر صلح کر لی کہ ترکوں کا ایک ڈویژن قاسم کے علاقہ میں مقیم رہے گا۔ ترکوں سے صلح کر لینے کے بعد ابن سعود کو کسی قدر اطمینان ہوا اور اس نے نجد میں اپنے پوزیشن کو اور زیادہ مضبوط بنانا شروع کر دیا۔

ترکوں اور سعودیوں کی صلح کے بعد بھی آل رشید نے دم نہ لیا۔ کچھ دنوں بعد عبدالعزیز ابن رشید خود ایک چھوٹی سی فوج کے ساتھ ابن سعود کے علاقہ میں در آیا اور دیہات لوٹنے شروع کر دیئے اس مرتبہ وہ ابن سعود سے مقابلہ نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ دیہاتوں کو لوٹ کر اپنے علاقے میں واپس ہو جانا چاہتا تھا۔ لیکن ابن سعود کو جیسے ہی اپنے علاقے میں ابن رشید کی

تاخت کا حال معلوم ہوا وہ برق صفت تیزی سے آل رشید پر جا پڑا اور دم کی دم میں اس کی چھوٹی سی فوج کو کاٹ کر رکھ دیا۔ اس لڑائی میں عبدالعزیز ابن رشید بھی مارا گیا۔ جس کے باعث آل رشید کی رہی سہی قوت بھی ختم ہو گئی۔ ابن رشید کی جانشینی پر آل رشید میں معرکے پڑنے شروع ہوئے۔ اور سعودیوں کو اپنی شمالی سرحد کی طرف سے اطمینان ہو گیا۔

لیکن یہ اطمینان زیادہ دنوں قائم نہ رہ سکا۔ ایک دفعہ پھر آل رشید نے ابن سعود کے خلاف سر اٹھایا اور اب کے شیخ مبارک حاکم کویت نے بھی خفیہ طور پر ان کی مدد کی جو خود بھی ابن سعود کو اس قدر طاقتور دیکھنا پسند نہ کرتا تھا۔ بغاوت بہت جلد قاسم کے علاقہ میں پھیل گئی، اور جو شہر ابن سعود نے فتح کئے تھے وہ اس کے ہاتھ سے جاتے رہے، لیکن ابن سعود اس بغاوت سے ذرا نہ گھبرایا، اپنی فوجوں سمیت فوراً موقع پر پہونچا اور کئی دن کی مسلسل لڑائی کے بعد بالآخر بغاوت کو پوری طرح کچلنے اور اپنے شہر واپس لینے میں کامیاب ہو گیا۔ اس دفعہ اس بری طرح اس نے آل رشید کو کچلا تھا کہ ان میں مدتوں سر اٹھانے کا حوصلہ باقی نہ رہا۔

ابن سعود آل رشید کو کچل کر مظفر و منصور ریاض پہونچا ہی تھا کہ اسے نجد کے جنوب میں ایک اور خطرے کا علم ہوا، نجد و حجاز کے درمیان کاروان کے رستہ میں ایک چھوٹا سا علاقہ ہے "قبیہ" اس علاقہ پر قبضہ کے سلسلے میں شریف حسین اور ابن سعود کے درمیان اختلاف ہوا۔ شریف حسین اس پر اپنا قبضہ بتاتا تھا اور ابن سعود اسے نجدی کہتا تھا۔ یہ قضیہ بڑھتے بڑھتے نازک صورت اختیار کر گیا۔ شریف حسین نے اپنے لڑکے عبداللہ کی ماتحتی میں فوجیں

بھیجدیں کہ عتیبہ پر قبضہ کر لے، اس کے جواب میں ابن سعود نے اپنے بھائی سعد کو مقابلے کے لئے بھیجا۔ دونوں فوجوں میں مقابلہ ہوا۔ سعودیوں کو شکست ہوئی اور سعد گرفتار ہو گیا۔ ابن سعود اس شکست کا بدلہ لینے کی تیاری ہی کر رہا تھا کہ جنوبی نجد میں یکایک اس کے خلاف بغاوت کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ ابن سعود کے بڑے چچا کے لڑکوں نے جو اپنے آپ کو سلطنت نجد کا اصلی وارث سمجھتے تھے۔ قبیلہ "عجمان" کی حمایت میں ابن سعود کے خلاف بغاوت کر دی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ریاض پر ہجوم کر آیا۔ ابن سعود اس نئی افتاد سے گھبرایا۔ اس لئے فوراً شریف حسین سے صلح کر لی اور عتیبہ شریف حسین کے حوالے کر کے ریاض کی طرف واپس چلا، راستہ میں ابن سعود اور اس کے چچا کے لڑکوں میں مقابلہ ہوا۔ گھمسان کا رن پڑا، باغیوں کو مکمل شکست ہوئی اس کے چچا کے لڑکے صحرا کی طرف بھاگ گئے۔ بدویوں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ لیکن ابن سعود نے ان لوگوں کو شکست فاش دینے کے بعد بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا، جو بدوی اس بغاوت میں شریک ہوئے تھے ان کے گاؤں کے گاؤں تباہ کر ڈالے قبائل کے قبائل اپنی بندوقوں سے بھون ڈالے جو بغاوت میں ان کے سرغنہ تھے۔ انھیں چھانٹ چھانٹ کر اور چن چن کر پھانسی پر لٹکا دیا۔ غرض اس بری طرح ابن سعود نے اہل قبائل کو اس بغاوت کی سزا دی کہ سارا نجد کانپ اٹھا اور ایک مدت تک کے لئے امن و امان کی صورت پیدا ہو گئی۔

یہ زمانہ ۱۹۱۳ء کا تھا جبکہ ترکوں پر بلقان کی ریاستوں نے چڑھائی کر دی تھی، جس سے خود ترکوں کی زندگی کو خطرہ پیدا ہو گیا تھا اس موقع پر

ترکوں نے عرب سے بھی اپنی فوجیں طلب کر لی تھیں اور جہاں ضرورت محسوس ہوئی برائے نام چھوڑ دیں۔ علاقہ قاسم کی ترکی فوج بھی واپس قسطنطنیہ طلب کر لی گئی۔ اور ساحلی علاقوں میں "الحصا" پر ترکوں کا قبضہ تھا اور وہاں ترکوں کا ایک گورنر رہا کرتا تھا۔ جس کی ماتحتی میں ایک ترکی ڈویژن ہوا کرتا تھا۔ لیکن جنگ بلقان میں اس علاقہ کی ترکی فوج بھی قسطنطنیہ بھیجدی گئی اور "حصار" کے پائے تخت "حفوف" میں ترکوں کی فوج برائے نام رہ گئی۔ ابن سعود کو ترکوں سے ہمیشہ سے پرخاش تھی اس وقت اسے موقع مل گیا کہ وہ ترکوں کی اس ذراسی فوج کو ٹھکانے لگا کر سارے صوبہ الحصا پر قبضہ کرے۔ اس نے فوراً مگر چپکے چپکے لڑائی کی تیاریاں شروع کر دیں، اور ایک رات سات ہزار نجدی سپاہیوں کے ساتھ الحصا کی طرف چکر دار راستہ سے کوچ کر دیا اپنا رُخ چونکہ ابن سعود نے دوسری طرف رکھا تھا اس لئے حصا کی ترکی فوجیں ابن سعود کی صحیح منزل مقصود سے بے خبر رہیں۔ ابن سعود نے دس میل کا چکر دے کر ایک رات اپنی فوج "حفوف" کے سامنے لا اتاری اور راتوں رات شہر پناہ پھاند کر اپنے سپاہی لئے سوتے ہوئے ترکوں پر جا پڑا۔ جب وقت تک ترکوں کو اچھی طرح خطرہ کا احساس ہوا اس وقت تک شہر پر ابن سعود کا قبضہ ہو چکا تھا اور ترکوں کا گورنر مسجد میں قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ لیکن بعد میں ابن سعود نے اس کو امان دی اور حفوف سے اپنے ساتھیوں سمیت ساحل سمندر تک جانے کی اجازت دیدی تاکہ وہ بصرہ اور وہاں سے قسطنطنیہ چلا جائے۔

حفوف کی فتح کے بعد ترکوں کے لئے اس کے سوا چارہ کار نہ رہا کہ وہ ابن سعود سے صلح کر لیں۔ حصار کو نجد میں شامل کر لینے کی اجازت دیدیا

اور اس پر ابن سعود کی قیادت تسلیم کرلیں۔ اس کے جواب میں ابن سعود نے اپنے اوپر ترکوں کا اقتدار تسلیم کر لیا۔

یوروپ میں جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی، ترکی جرمنی کے ساتھ ہو گیا تھا۔ برطانیہ نے عرب میں ریشہ دوانیاں شروع کر دیں۔ شریف حسین سے سودا ہونے لگا، کویت کا شیخ تو تھا ہی برطانیہ کی حمایت میں۔ ابن سعود کا بڑھتا ہوا اقتدار دیکھ کر انگریزوں نے اسے بھی اپنی طرف کر لینا چاہا۔ برطانیہ کے کئی پیغامبر ریاض پہونچے، ابن سعود کو روپیہ کا بھی لالچ دیا، اور یہ بھی یقین دلایا کہ برطانیہ اسے آزاد عرب سردار تسلیم کرے گی ابھی ابن سعود کوئی فیصلہ نہیں کرنے پایا تھا کہ ترکوں نے پھر آل رشید کو ابھار کر ابن سعود کے مقابل صف آرا کر دیا۔ مقصد یہ تھا کہ ابن سعود انگریزوں سے معاملہ نہ کرنے پائے۔

آل رشید عبدالعزیز ابن رشید کے انتقال کے بعد اگرچہ نجی جھگڑوں میں پھنس گئے تھے۔ لیکن اس موقع پر وہ متحد ہو کر ابن سعود کے مقابل ہوئے "جارب" پر ان کی فوجیں جمع ہونی شروع ہوئیں۔ ابن سعود یلغار کرتا ہوا جارب پہونچا اور بے تکلف دشمن پر جا پڑا۔ دوپہر سے شام تک بڑی گھمسان کی لڑائی رہی۔ دونوں میں کسی کے ہاتھ بھی میدان نہ آیا۔ شام کے قریب ابن سعود کی فوجوں میں ابتری پیدا ہوئی۔ ابن سعود نے اپنی فوجوں کا حوصلہ بڑھانا چاہا لیکن صورت حال بگڑ چکی تھی۔ سعودی فوجوں کے قدم اکھڑ گئے۔ آل رشید ہر طرف سے ان پر برسنے لگے۔ جو بچ سکے وہ بھاگے جو نہ بچ سکے وہ آل رشید کی تلوار کے گھاٹ اتر گئے۔ ابن سعود جارب سے شکست خوردہ جب واپس ریاض آیا تو اسکے ساتھ صرف مٹھی بھر آدمی تھے۔

اس لڑائی میں شکسپیئر نامی وہ انگریز پیغامبر بھی مارا گیا جو برطانیہ کی طرف سے ابن سعود کے نام پیغام لایا تھا، اور جس نے ابن سعود کی تنبیہہ کی باوجود صحرا کی یہ لڑائی دیکھنے پر اصرار کیا تھا۔

جارب کی شکست سے نجد میں ابن سعود کے اقتدار پر کاری ضرب لگی۔ "عجمان"، جو مدت سے اس تاک میں تھے کہ ابن سعود کو کمزور پا کر بغاوت کر دیں۔ چپکے چپکے حملہ کی تیاریاں کرنے لگے۔ آل رشید بھی جارب کی فتح سے چونکہ ان کے دل بڑھ گئے تھے۔ اس لئے قاسم کے علاقہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ لیکن شمال یا جنوب کسی طرف سے مخالف قبائل نے ابن سعود پر فی الفور حملہ نہیں کیا بلکہ اس کی طاقت کا اندازہ کرتے رہے تاکہ حملہ کا کوئی صحیح وقت متعین کر سکیں۔ ابن سعود شکست کھانے کے بعد بھی بہت طاقتور تھا۔ اور عجمان اور آل رشید اسے آسانی سے زیر نہیں کر سکتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب برطانوی فوجیں قط الامارا پر دوبارہ حملہ کر کے اسے فتح کر چکی تھیں، اور بے تکلف بغداد کی طرف بڑھتی جا رہی تھیں۔ ابن سعود نے ابھی تک یہ طے نہیں کیا تھا کہ وہ جنگِ عظیم میں کس کی حمایت کرے۔ لیکن آل رشید کے حملہ کے بعد جو ترکوں کے اشارے اور امداد سے کیا گیا تھا۔ ابن سعود کو فیصلہ کرنے میں آسانی ہو گئی۔ وہ فوراً ریاض سے الحصا پہنچا اور الحصا کے بندرگاہ "اجائر" میں اس نے برطانیہ کے ساتھ معاہدہ کر لیا اس معاہدہ کی رُو سے برطانیہ نے اس کو نجد کا آزاد حکمران تسلیم کر لیا۔ اور ابن سعود نے یہ عہد کر لیا کہ وہ برطانیہ یا اس کے حلیفوں پر حملہ نہ کرے گا۔ اور نہ اس کے دشمنوں کو مدد دیگا۔ اس معاہدہ کے بعد برطانیہ نے ابن سعود کو پانچ ہزار پونڈ ماہوار دینے منظور کئے۔ اور اس کی فوج کے لئے

بہت سے انگریزی ہتھیار بھی بھیجے۔

اس معاہدہ سے فارغ ہو کر ابن سعود عجمان کی طرف متوجہ ہوا۔ اس قبیلے نے اسے سخت بے چین کر رکھا تھا۔ ابن سعود چاہتا تھا کہ آل رشید کی طرح جلد سے جلد اس کا بھی قلع قمع کر ڈالے۔ ابن سعود اخوان کا ایک دستہ اور اپنے جاں نثار قبائل کی تھوڑی سی فوج لے کر عجمان کی طرف چلا۔ راستے میں کھجور کے جنگل میں ان دونوں فوجوں کا رات کی تاریکی میں مقابلہ ہوا۔ عجمان نے ابن سعود کو دھوکا دینے کے لئے اپنی تھوڑی سی فوج تو سامنے رکھی لیکن فوج کا بڑا حصہ جنگل میں چھپا دیا۔ جیسے ہی ابن سعود نے اپنے سامنے کی فوج پر حملہ کیا عجمان نے ابن سعود کی فوج کو پیچھے سے گھیر لیا۔ رات کی تاریکی میں دوست دشمن کی تمیز جاتی رہی، گھمسان کا رن پڑا، ابن سعود کا بھائی سعد جو اس کے برابر ہی لڑ رہا تھا ہلاک ہو گیا۔ خود ابن سعود بھی زخمی ہو گیا۔ سعودیوں کو بری طرح شکست ہوئی اور وہ عجمان کے علاقے سے پسپا ہو جانے پر مجبور ہو گئے۔

ابن سعود کی اس شکست کے بعد بدوی قبائل میں بھی اس کے خلاف ایک حرکت پیدا ہوئی آل رشید نے قاسم کے علاقہ پر حملہ کر دیا۔ لیکن ابن سعود کے نائب نے جو "بریدہ" میں مقیم تھا آل رشید کو شکست دیدی جس کے بعد آل رشید کی پیشقدمی رک گئی۔ لیکن ابن سعود ابھی تک دشمنوں میں گھرا ہوا تھا۔ عجمان نے اپنی کچھ فوج بھیج کر الحصا کے پائے تخت حفوف کا محاصرہ بھی کر رکھا تھا۔ ابن سعود کو اس دشمن کے مقابلہ میں فوراً کوئی تدبیر کرنی تھی ورنہ اندیشہ تھا کہ سارا نجد اس کے ہاتھ سے نکل جائیگا۔

ابن سعود نے ریاض میں اپنے والد کو لکھا کہ مزید فوج بھیجے، انگریزوں

سے ہتھیار طلب کئے، اور شیخ کویت سے مدد مانگی۔ عبدالرحمٰن نے ریاض سے فوجیں اکٹھی کر کے ابن سعود کو بھیج دیں، انگریزوں نے ہتھیار دیئے شیخ کویت نے اپنے لڑکے سلیم کی ماتحتی میں کچھ فوج بھیجی اس طرح ابن سعود دوبارہ لڑائی کیلئے تیار ہو کر حفوف کی طرف بڑھا تاکہ عجمان کے محاصرے کو توڑ ڈالے۔ یہاں عجمان کو شکست دینے میں ابن سعود کامیاب ہو گیا۔ لیکن اس معرکہ میں اس کی ٹانگ میں ایک گولی لگ گئی اور وہ گھوڑے سے گر پڑا۔ اس کے باڈی گارڈ کے سپاہی بمشکل اسے اس کے ڈیرے تک اٹھا کر لائے۔ اسی کے ساتھ یہ اور افتاد پڑی کہ شیخ مبارک کا لڑکا سلیم ابن سعود سے ٹوٹ کر عجمان سے جا ملا۔ ابن سعود اس فتح کے بعد بھی دشمنوں کے نرغے میں تھا۔

لیکن اس کے کچھ دنوں بعد حالات بدلے۔ کویت میں مبارک کا انتقال ہو گیا سلیم اپنی فوجوں سمیت کویت چلا گیا۔ ابن سعود کو ریاض سے فوجوں کی اور انگریزوں سے ہتھیاروں کی مدد مل گئی۔ اس نے اب کے بڑی تیاری سے عجمان سے جنگ چھیڑ دی۔ تقریباً چھ مہینے حصا کے مختلف علاقوں میں عجمان اور ابن سعود کی فوجوں میں گھمسان کی لڑائیاں ہوتی رہیں۔ لیکن فتح و شکست کئی دن تک برابر تلتی رہی۔ چھ مہینے بعد دفعتہً عجمان میں ضعف کے آثار پیدا ہوئے ابن سعود نے ان کی کمزوری کو بھانپا۔ اپنی طرف سے لڑائی میں شدت پیدا کر دی۔ عجمان کے قدم اکھڑے ابن سعود کی فوجوں نے گھیر گھیر کر انھیں کاٹنا شروع کر دیا۔ رحم کا اب کوئی کام نہ تھا۔ گاؤں کے گاؤں سعودیوں نے جلا دیئے اور جہاں مخالف قبیلے کا جو فرد ملا اسے کاٹ کر رکھ دیا۔ کچھ عجمان حصا چھوڑ کر بھاگ گئے اور کویت کے شیخ سے پناہ لی۔ ابن سعود نے شیخ کویت سے

مطالبہ کیا کہ ان لوگوں کو واپس کردے، کویت پر اس وقت مُبارک کا بیٹا جابر حکمراں تھا اس نے ابن سعود کی درخواست نہ مانی اور جو عجمان اس کی پناہ میں تھے، انھیں واپس دینے سے انکار کر دیا۔ ابن سعود مجبور ہوگیا، کویت پر انگریزوں سے معاہدہ کے بعد وہ حملہ نہیں کرسکتا تھا اس لئے حقًا واپس آگیا۔ یہاں اس نے بچے کھچے مخالف قبائل کے افراد کو ٹھکانے لگاکر اور عجمان قبیلے کو بالکل پامال کرکے مظفر و منصور ریاض واپس ہوا۔ عجمان کی پامالی کے بعد اب نجد میں ابن سعود کے اقتدار کو چیلنج کرنیوالا کوئی نہیں تھا۔

یہ ۱۹۱۷ء کا زمانہ تھا، عراق برطانیہ نے فتح کرلیا تھا۔ شام کی طرف برطانیہ کی ماتحتی میں شریف حسین کی فوجیں پیشقدمی میں مصروف تھیں۔ ابن سعود عجمان کو پامال کرکے ایک مرتبہ پھر عرب وسطےٰ میں صاحب اقتدار و حکمران بن گیا تھا، برطانیہ کی توجہ کا مرکز بنا، برطانیہ چاہتی تھی کہ ابن سعود شام کی طرف پیشقدمی میں شریف حسین کی مدد کرے، چنانچہ برطانیہ نے ابن سعود کی خدمت میں ایک وفد سنٹ جان فلبی کی ماتحتی میں ریاض بھیجا تاکہ وہ ابن سعود کو برطانیہ کی مدد پر راضی کرے۔ لیکن ابن سعود نے یہ تجویز پسند نہیں کی، اور اس نے صاف صاف وفد سے کہدیا کہ انگریزوں اور ترکوں کے درمیان اس نے غیر جانب داری کی پالیسی اختیار کر رکھی ہے وہ بہتر ہے۔ انگریز اسے غیر جانب دار رہنے کے لئے روپیہ دیتے ہیں اور وہ اسی کو پسند کرتا ہے کہ دونوں حریفوں کے درمیان غیر جانبدار رہے۔

اسی دوران میں ۱۹۱۸ء آگیا، اور اپنے ساتھ ابن سعود کے لئے کچھ نئی مشکلات لایا۔ شریف حسین جواب شاہ حسین ہوگیا تھا۔ اس نے ابن سعود کو نہایت ہتک آمیز انداز میں لکھا کہ ابن سعود شاہ حسین کی بیعت کرے اور "عتیبہ" سے اپنا دعویٰ اٹھا

ورنہ جنگ کی جائے گی۔ شریف حسین کے اس چیلنج پر ابن سعود کو بہت غصہ آیا
اور اس کے ماتحت سردار بھی شریف حسین سے لڑنے پر آمادہ ہو گئے۔ لیکن جان فلبی
نے جو اب ریاض میں انگریزوں کی طرف سے ابن سعود کے مشیر کی حیثیت سے
رہتا تھا ابن سعود کو سمجھایا کہ شریف حسین انگریزوں کا دوست ہے اور ابن سعود کا
انگریزوں سے معاہدہ ہے۔ اگر ابن سعود نے شریف حسین پر حملہ کر دیا تو اس کا اثر اس
معاہدہ پر پڑیگا۔ جو اس نے انگریزوں سے کیا ہے اور یہ سمجھا جائیگا کہ ابن سعود
غیر جانبداری سے پھر گیا اور انگریزوں کے دشمنوں کے ساتھ مل گیا۔ فلبی کے
اس کہنے سننے کا ابن سعود پر اثر ہوا اور اس نے شریف حسین کے چیلنج کو نظر انداز
کر دیا۔ لیکن شریف حسین جس پر بُری طرح اپنی طاقت کا نشہ سوار تھا خاموش
نہ بیٹھا۔ اس کے کچھ دنوں بعد نجد کے ایک سرحدی مقام "خرما" پر قبضہ کرنے کے
لئے اپنے آٹھ سو سپاہی بھیج دیئے۔ لیکن ان سپاہیوں سے اہل خرما نے
مقابلہ کیا اور انھیں مار بھگایا اور ساتھ ہی ابن سعود کو لکھا کہ وہ فوراً مدد کو پہونچے۔
شریف حسین کی اس حرکت سے ابن سعود مارے غصہ کے بدحواس ہو گیا۔
اور نجدی اخوان جو اب کافی طاقتور جماعت کی صورت اختیار کر گئے تھے سخت
مشتعل ہو گئے اور انھوں نے ابن سعود سے مطالبہ کیا کہ شریف حسین کے خلاف
فوج کشی کی جائے، چنانچہ ابن سعود نے اس مرتبہ ساری مصلحتوں کو بالائے
طاق رکھ کر شریف حسین سے مقابلہ کی تیاریاں شروع کر دیں لیکن فلبی
پھر درمیان میں آگیا اور اس نے اونچ نیچ سمجھا کر ابن سعود کا غصہ ٹھنڈا کر دیا۔
معاملہ بظاہر رفت و گذشت ہوا لیکن کچھ دنوں بعد شریف حسین نے خرما پر ایک
اور فوجی حملہ کیا۔ اس دفعہ بھی اہل خرما نے اس کا حملہ پسپا کر دیا اس حملہ کی
خبر سے ابن سعود کا مارے غم و غصہ کے بُرا حال ہو گیا۔ اس کے سردار اور

سپاہی سب شریف پر حملہ کرنے کے لئے بے چین ہو رہے تھے اور وہ خود بھی شریف کو ان حملوں کا جواب دینے کے لئے بیتاب تھے۔ لیکن برطانیہ کا معاہدہ اس کے گلوگیر تھا اور فلبی اس کے پاؤں میں زنجیر بن گیا تھا جس کے باعث ابن سعود حرکت کرنے ہی سے بے بس ہو رہا تھا۔ فلبی کی رائے سے ابن سعود نے شریف کے نام ایک احتجاج نامہ روانہ کیا جس میں شریف حسین سے درخواست کی وہ خرما پر فوجی تاخت بند کر دے اس سے آپس کے تعلقات خراب ہونیکا اندیشہ ہے لیکن شریف حسین نے ابن سعود کا یہ خط بے پڑھے آسے واپس کر دیا، شریف حسین کے اس ہتک آمیز طرز عمل کے بعد ابن سعود سے ضبط مشکل ہو گیا، سارے نجد میں اس کے خلاف چہ میگوئیاں ہونے لگیں خرما والوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ ابن سعود نے روپئے کے عوض اپنا قومی وقار ہی انگریزوں کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ اخوان بگڑ گئے، عجمان نے سر اٹھایا، آل رشید نے بھی جو ترکوں سے ملے ہوئے تھے حرکت شروع کی اور شیخ کویت نے آل رشید کو ابن سعود سے لڑنے کے لئے روپے سے مدد کر دی غرض ابن سعود کے اطراف و جوانب اور خود اس کی فوج میں شورش اور بغاوت کے آثار دکھائی دینے لگے۔

فلبی اب بھی ابن سعود کو روک رہا تھا اور یہ کوشش کر رہا تھا کہ ابن سعود کی توجہ شریف حسین سے ہٹا کر آل رشید کی طرف پھیر دے جو ترکوں کے دوست ہونے کے باعث انگریزوں کے دشمن تھے۔ اس مرتبہ فلبی کو ابن سعود کے ہموار کرنے میں سخت کوشش کرنی پڑی اور یہ وعدہ کرنا پڑا کہ انگریز شریف حسین کو خرما پر دوبارہ حملہ کرنے سے روک دینگے۔ اس اقرار کے بعد ابن سعود نے آل رشید پر حملہ کیا، اور ایک ہی حملے میں انھیں "حائل" میں محصور ہو جانے پر مجبور کر دیا۔ اس جنگ میں لوٹ کا بہت سامان سعودیوں کے حصے میں آیا جس سے ابن سعود

کی فوج کسی قدر مطمئن ہو گئی۔ آل رشید نے ابن سعود کو صلح کا پیغام دیا۔ ابن سعود نے چند شرائط کے ماتحت صلح منظور کر لی اور ریاض واپس آ گیا۔

آل رشید پر فتح پانے کے کچھ ہی دنوں بعد ترکوں نے ہتیار ڈال دیئے اور سارے عراق و عرب پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ جنگ عظیم ختم ہو گئی۔ لیکن جنگ کے خاتمے کے ساتھ ہی عرب میں انفلوئنزا اور پلیگ کی وبا پھیل گئی۔ ہزاروں آدمی ایک ایک دن میں اس وبا کی نذر ہو گئے۔ ریاض بھی اس سے محفوظ نہ رہا اور ابن سعود کا خاندان بھی اس زد سے نہ بچ سکا۔ اس کا پہلا لڑکا "ترکی" جو اس کا جانشین اور ولی عہد بھی تھا پلیگ سے انتقال کر گیا اسکی ماں جو ملکہ تھی دو دن میں چٹ پٹ ہو گئی۔ ان دونوں کی موت کا ابن سعود پر بہت برا اثر ہوا اور مارے غم کے وہ گوشہ نشین ہو گیا۔ لیکن حالات نے اسے بہت دنوں گوشہ نشین نہیں رہنے دیا شروع ۱۹۱۹ء میں شریف حسین نے جو شام کی فتح کے بعد عرب میں کافی با اثر ہو چکا تھا عتبہ کو فتح کرنیکی تیاریاں شروع کر دیں اخوان اس خبر سے بالکل بے لگام ہو گئے۔ انھوں نے ابن سعود کو گوشہ نشینی سے باہر کھینچ نکالا، اور مطالبہ کیا کہ شریف حسین کے خلاف وہ ان کی رہنمائی کرے۔ جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی یہ عذر باقی نہ تھا کہ شریف انگریزوں کا حلیف ہے، ابن سعود فوراً راضی ہو گیا اور چپکے چپکے اس نے اخوان کی زبردست فوج چھپواں طریقہ سے خرما میں بھیج دی اور اپنے آپ حلیف قبائل کی ایک طاقتور فوج لیکر عتبہ کی طرف چلا۔ ادھر شریف حسین نے اپنے لڑکے عبداللہ کی ماتحتی میں چار ہزار تربیت یافتہ فوج جو آلات جدیدہ سے مسلح بھی تھی خرما کی طرف روانہ کر دی۔ شریف کی فوج خرما کے آگے نخلستان میں خیمہ زن ہو گئی اہل

دھوکے میں ابن سعود کی فوجیں ابھی دور ہیں ان کے پہونچنے میں کئی دن لگیں گے۔
لیکن جس رات شریف کی فوج نخلستان میں خیمہ زن ہوئی اسی رات کی تاریکی میں اخوان نے جو خرما میں اور اس کے آس پاس چھپے بیٹھے تھے ان پر شبخون مارا اور شریفی فوج کے سنبھلتے سنبھلتے انھوں نے آدھی سے زیادہ فوج کاٹ کر رکھدی، جو باقی رہے انھوں نے حملہ کرنا چاہا لیکن حملہ اسقدر اچانک اور کامیاب ہوا تھا کہ شریفی فوج کے قدم نہ جم سکے اور وہ مکّہ کی طرف بھاگی۔
رحم یا امان کا اخوان کے آگے سوال ہی نہیں تھا انھوں نے بھاگتے ہوئی فوج کے بھی ٹکڑے اڑا دیئے اور اس طرح شریف حسین کی چار ہزار فوج میں سے صرف ایک سو سپاہی جن کے آگے آگے عبداللہ تھا۔ اخوان سے اپنی جان بچا کر مکہ پہونچ سکے۔

شریف حسین کی یہ بڑی تربیت یافتہ اور تجربہ کار فوج تھی جس کا یہ حشر ہوا۔ اس فوج کے تباہ ہوتے ہی حجاز میں ہل چل مچ گئی۔ سعودیوں کے حوصلے بڑھ گئے۔ اب مکّہ، طائف اور مدینہ ان کے سامنے تھا اور کوئی طاقت ایسی نہیں تھی جو اسے روک سکتی۔

شریف حسین نے انگریزوں سے مدد مانگی لیکن اب انگریزوں کی کوئی خاص غرض شریف سے اٹکی ہوئی نہیں تھی۔ انھوں نے ابن سعود کے خلاف شریف حسین کی مدد کرنے کے مطالبہ کو ٹالا اور صاف جواب نہ دیا۔

خرما پر شریف حسین کی فوجوں کو شکست دینے کے بعد اگرچہ حجاز پر حملہ کی راہیں اس کے لئے کھل گئی تھیں، لیکن ابن سعود نے نہایت صبر سے کام لیا اور فوری حملہ کرنے کے بجائے اس نے انگریزوں کا رُخ معلوم

کرنا چاہا۔ ابتداءً تو برطانیہ نے ابن سعود کو دبایا کہ وہ شریف حسین سے نہ اُلجھے لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد اس کا انداز بدل گیا۔ عراق میں برطانیہ کے خلاف بغاوت ہو گئی تھی، شام سے فرانسیسیوں نے فیصل ابن حسین کو نکال دیا تھا۔ انگلستان میں عراق کے اخراجات پر اعتراضات ہو رہے تھے۔ حکومت پر زور ڈالا جا رہا تھا کہ عرب اور عراق پر بیکار روپیہ اور آدمی نہ صرف کئے جائیں۔ ابن سعود نے یہ رنگ دیکھ کر برطانیہ کی پالیسی کو بھانپنے کے لئے پہلے آل رشید کو چھیڑا، آل رشید نے ترکوں کے بعد شریف حسین اور شیخ کویت سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ ابن سعود کے حملے کے ساتھ ہی آل رشید نے شریف حسین سے مدد مانگی۔ شریف حسین نے برطانیہ سے ابن سعود کی شکایت کی اور زور ڈالا کہ ابن سعود کو آل رشید پر حملہ کرنے سے روکا جائے۔ لیکن اب انگریزوں نے عرب میں ایک قطعی پالیسی متعین کر لی تھی، اُنھوں نے صاف جواب دیدیا کہ ان اندرونی جھگڑوں میں وہ مداخلت نہ کریں گے۔ اس جواب کے بعد آل رشید نے شیخ کویت سے امداد کی درخواست کی۔ لیکن سلیم کا انتقال ہو چکا تھا جو ابن سعود کا دشمن تھا اس کا لڑکا احمد شیخ کویت تھا۔ اس نے ابن سعود سے بگاڑ نامناسب نہ سمجھا اور آل رشید کو مدد دینے سے انکار کر دیا۔

دونوں طرف کے اس کورے جواب کے بعد آل رشید بالکل ابن سعود کے رحم و کرم پر تھے، اور ابن سعود کی فوجیں شمالی قبائل کو زیر کرتی بے تکلف حائل پر بڑھی چلی جا رہی تھیں۔ حائل کے قریب آل رشید نے ابن سعود کا ہلکا سا مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی حائل پر آسانی سے ابن سعود کا قبضہ ہو گیا۔ شمالی قبائل کے بہت سے افراد بھاگ کر عراق میں فیصل کے پاس چلے گئے جو بچے اُنھوں نے ابن سعود کی اطاعت کر لی۔ ابن سعود مظفر و منصور

ریاض کو لوٹا۔ ایک میل آگے جاکر اس کے والد عبدالرحمٰن اور علمائے ریاض نے اس کا استقبال کیا۔ آج تک سعودیوں کو حائل فتح کرنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ ابن سعود ہی کے سر یہ سہرا رہا اس نے اپنے خاندان کے پرانے دشمن کے پایہ تخت کو زیر نگیں کر لیا اور آل رشید کو بالکل پامال کر ڈالا۔ اس فتح کے بعد ابن سعود کا خطاب سلطان نجد و ملحقات ہوا۔

آل رشید کی قوت کو ہمیشہ کیلئے ختم کرنے کے بعد ابن سعود جنوب کی طرف متوجہ ہوا تاکہ شریف حسین سے بھی اپنا پرانا قضیہ چکا ڈالے۔ انگریزوں کی غیر جانبداری آل رشید سے مقابلہ میں ظاہر ہو چکی تھی، اور فلبی نے بھی جواب بجائے برطانوی سفیر کے ابن سعود کا مشیر خاص ملکہ نفس ناطقہ بنا ہوا تھا۔ ابن سعود کو یہ یقین دلا دیا تھا کہ انگریز شریف حسین سے سخت ناراض ہیں اس لئے کہ شریف شام اور فلسطین پر غیر ملکی اقتدار تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں ہے اور بار بار اس مسئلے کو اُٹھا کر وہ برطانوی مدبروں کو زچ کر رہا ہے۔

ابن سعود نے اس موقعے سے فائدہ اُٹھانے اور اپنے پرانے دشمن شریف حسین سے نمٹنے کا تہیہ کر لیا۔ لیکن ابھی اس کی تیاریاں مکمل نہیں ہوئی تھیں کہ یکایک اس پر سوداوی بخار کا حملہ ہوا اور وہ صاحب فراش ہو گیا۔ بخار کا حملہ سخت تھا علاج اگرچہ بڑی توجہ سے کیا گیا۔ لیکن پھر بھی بخار کے اُترتے اُترتے کئی دن لگ گئے اور جب بخار اُترا تو معلوم ہوا کہ ابن سعود کی بائیں آنکھ پر اپنا اثر چھوڑ گیا جس سے آنکھ کی روشنی جاتی رہی۔ آنکھ کے علاج میں بھی دیر لگی، ایک شامی ڈاکٹر نے آپریشن کیا اور آنکھ میں کسیقدر روشنی آگئی۔ غرض بیماری کے دس ناگہانی حملے کے باعث ایک سال گذر گیا اور ابن سعود اپنی مرضی کے خلاف

خاموش پڑے رہنے پر مجبور رہا۔

جب تندرست ہو گیا تو پھر شریف حسین سے مقابلہ کا مسئلہ اس کے سامنے آیا۔ حالات اس ایک برس میں بہت کچھ بدل گئے تھے، شریف حسین اور انگریزوں کے درمیان بہت سے مسائل میں رنجش پیدا ہو گئی تھی فیصل اور عبداللہ نے بہت کوشش کی کہ شریف کی انگریزوں سے صفائی ہو جائے، لیکن شریف حسین کے طرزِ عمل کے باعث جب صفائی نہ ہو سکی تو شریف حسین کے یہ دونوں لڑکے بھی باپ سے علیحدہ ہو گئے تھے، خود مکہ اور مدینہ میں شریف حسین کے خلاف فضا پیدا ہو گئی تھی اور باہر کے مسلمان بھی اس کی بد انتظامی کی خبر سُن سُن کر اس کے خلاف ہونے لگے تھے۔

ابن سعود کے لئے یہ بڑا اچھا موقع تھا، لیکن اس نے پھر بھی بڑی احتیاط سے کام لیا۔ حسین سے وہ آل رشید کی طرح مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ مسلمانوں کے متبرک مقامات مکہ اور مدینہ چونکہ شریف حسین کے قبضہ میں تھے۔ اس لئے ان مقامات پر حملہ کرنے کے لئے پہلے مسلمانانِ عالم کو ہموار کر لینا اس کے لئے ضروری تھا۔

اس کی ابتدا اس نے ریاض سے کی وہاں وہابیوں کی ایک زبردست کانفرنس اس کے والد عبدالرحمٰن کی صدارت میں ہوئی جس نے بالاتفاق حسین کے خلاف فیصلہ کیا اور ابن سعود سے درخواست کی کہ وہ حسین پر حملہ کر کے مکہ اور مدینہ کو "مشرکین" کے قبضہ سے نکال لے۔ اس فیصلہ کے بعد ابن سعود نے ریاض میں حافظ وہبہ کی صدارت میں ایک کمیٹی بنائی اور عالم اسلام میں حسین کے خلاف اور ابن سعود کی حمایت میں پروپیگنڈے کا کام اس کے سپرد کیا۔ اور ان سب ابتدائی مراحل کو طے کر کے ابن سعود شریف حسین سے آخری مقابلے کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔

عراق اور شرق اردن پر فیصل اور عبداللہ حکمراں تھے۔ شریف حسین سے لڑائی کی صورت میں ان دونوں کی طرف سے نجد پر حملہ کا اندیشہ تھا۔ ابن سعود نے اخوان کے کچھ دستے احتیاطاً عراق کی سرحد پر اور کچھ دستے شرق اردن کی سرحد پر بھیج دیئے۔ اس کے بعد عتیبہ کے امیر کی ماتحتی میں ایک زبردست فوج "طرابہ" کے راستے طائف پر حملہ کرنے کیلئے بھیجدی۔

عراق اور شرق اردن کی سرحدوں پر فیصل اور عبداللہ کی فوجوں نے اخوان سے سخت مقابلہ کیا اور انھیں بہت نقصان پہونچایا لیکن اسی دوران میں عتیبہ کے امیر کی فوجیں برابر کامیابی سے طائف کی طرف بڑھتی رہیں اور بغیر کسی سخت معرکہ کے اسے فتح کر لیا۔ طائف میں اس وقت حجازیوں کی تھوڑی سی فوج تھی اور شریف حسین کا بڑا لڑکا علی وہاں موجود۔ علی وہابیوں کے حملہ کی تاب نہ لاکر وہاں سے فرار ہو گیا اور اہل طائف نے وہابیوں پر شہر کے دروازے کھول دیئے۔ لیکن جیسے ہی وہابی شہر میں گھسے انھوں نے قتل عام کا حکم دیا اور تین سو شہریوں کو قتل کر ڈالا۔ اس فتح کی خبر سے مکہ میں بڑی پریشانی پھیل گئی۔ شریف حسین وہابیوں سے لڑنا چاہتا تھا لیکن اس کے جھنڈے کے نیچے انتہائی کوشش کے باوجود کوئی حجازی قبیلہ لڑنے کو تیار نہ ہوا۔ اہل شہر نے شریف حسین پر زور دیا کہ وہ علی کے حق میں تخت سے دستبردار ہو جائے تاکہ وہابیوں سے صلح کی گفتگو کی جا سکے۔ ابتداءً شریف حسین اس پر راضی نہ ہوا، لیکن جب دیکھا کہ اس کے سوا کوئی اور چارہ کار بھی نہیں ہے تو وہ علی کے حق میں دستبردار ہو گیا اور خود اسی وقت اپنے اہل و عیال اور ضروری سامان کے ساتھ موٹر میں بیٹھکر جدہ چلا گیا۔ جدہ سے وہ عقبہ

پہونچا اور عقبہ سے انگریزوں کی پناہ میں جزیرۂ قبرص چلا گیا۔
حسین کے مکہ سے چلے جانیکے بعد وہابیوں کو کسی نے مطلق روکنے کی کوشش نہیں کی، علی برائے نام حکمراں تھا طائف سے جب نجدیوں کو مکہ کی طرف بڑھتے دیکھا تو اس نے بھی مکہ چھوڑ دیا، اور جدہ کی راہ لی۔ اہل مکہ نے بے چوں وچرا شہر وہابیوں کے حوالہ کر دیا۔ کیونکہ انھیں ڈر تھا کہ ذراسی بھی مخالفت سے کہیں طائف کی طرح یہاں بھی قتل عام نہ ہو جائے۔ مکہ پر قبضہ کرنے کے بعد وہابیوں نے مکہ کے گرد کے مزارات اور قبے توڑ دیئے، اور قبروں کو پامال کر ڈالا۔ مکہ کی فتح کے بعد سعودی فوجوں کے حوصلے اتنے بڑھ گئے تھے کہ ان کی پیشقدمی کو روکنا ناممکن ہو گیا تھا مکہ کے اطراف وجوانب کے شیوخ نے فوراً ان کی اطاعت قبول کر لی اور دور دور کا علاقہ بے لڑے بھڑے ان کے قبضہ میں آگیا، البتہ جدہ اور مدینہ پر ابھی تک سعودیوں کا قبضہ نہ ہو سکا تھا۔
اسی دوران میں حج کا زمانہ آگیا، ابن سعود نے اعلان کیا کہ مسلمان حج کیلئے رابغ کے راستے آسکتے ہیں اور ابن سعود ان کی حفاظت کا ذمہ دار ہوگا۔ لیکن اس کے باوجود اس سال زائرین کی تعداد بہت ہی کم رہی۔ حج کے بعد جدہ اور مدینہ کے خلاف سعودیوں کی جنگی کارروائیاں شروع ہوئیں۔
اگست ۱۹۲۵ء میں نجدی فوجیں مدینہ کی طرف بڑھیں راستہ میں قدیم مزارات اور زیارت گاہوں کو تباہ و برباد کرتی گئیں۔ مدینہ پر سعودیوں کا ہلکا سا مقابلہ کیا گیا۔ سعودیوں نے شہر پر گولے اور گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ شہر والوں کو اندیشہ ہوا کہ یہ وہاں آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آبرو کا کے ساتھ گستاخی نہ کریں، اس لیے ۵ دسمبر ۱۹۲۵ء کو شہر سعودیوں کے حوالہ کر دیا۔ اس احتیاط کے باوجود ابن الرفاعی نہیں گنبد خضرا پانچ سعودی

گولیوں کے نشان پائے گئے۔ مدینہ کے بعد علی نے جدّہ بھی سعودیوں کے حوالہ کر دیا اور ۲۵ر دسمبر کو ابن سعود نے اعلان کر دیا کہ حجاز پورے طور پر فتح ہو گیا۔

دوران جنگ میں جب کبھی ممالک مقدسہ کی طرز حکومت کا مسئلہ چھیڑا ابن سعود نے یہ یقین دلایا کہ مکہ اور مدینہ میں جمہوری وضع کی حکومت ہوگی اور عالم اسلام کے نمایندے یہاں کے انتظام کیلئے ایک مجلس منتخب کرینگے یہ اعلان اتنی مرتبہ ہوا تھا کہ ابن سعود کے لئے اس سے پھر جانے کا کوئی موقع نہ تھا۔ چنانچہ جنوری ۱۹۲۶ء کو حج کے موقع پر مکہ میں موتمر اسلامی کے نام سے چند اسلامی ممالک کے نمایندوں کا اجتماع ہوا لیکن اس انداز سے کہ کسی غیر ممالک کے نمایندہ کو اس موتمر میں منہ کھولنے تک کی اجازت نہیں دی گئی۔ نجدیوں نے اس نام نہاد موتمر میں یہ تجویز پیش کی کہ ابن سعود کو حجاز کا والی اور بادشاہ تسلیم کر لیا جائے۔ اور دوسرے ممالک کے نمایندوں سے رائے لئے بغیر ہی اس کا بھی اعلان کر دیا کہ ابن سعود کو حجاز کا بادشاہ منتخب کر لیا گیا۔

اس موقع پر ہندوستان سے بھی ایک وفد اس موتمر میں گیا تھا جس کے صدر سید سلیمان ندوی اور ممبروں میں محمد علی مرحوم تھے۔ اس زمانہ میں محمد علیؒ ابن سعود کے حمایتیوں میں تھے۔ لیکن جب انھوں نے موتمر کا یہ رنگ دیکھا کہ وہاں آزادی رائے غائب ہے، اور جمہوریت کی آڑ میں ملوکیت کی پرستش کرائی جا رہی ہے تو وہ ابن سعود کے مخالف ہو گئے اس موقع پر محمد علیؒ اور ان کے ساتھیوں نے قدیم مزارات، قبوں اور زیارت گاہوں کی تصویریں بھی لی تھیں جنھیں وہابیوں نے زمین دوز کر دیا تھا اور

ان کی دوبارہ تعمیر کی درخواست کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔
اسی موقع پر مصری محمل شریف کا وہ واقعہ بھی پیش آیا جس کے باعث مدتوں حکومت مصر اور ابن سعود کے تعلقات خراب رہے۔ یہ واقعہ اس طرح ہوا کہ مصری محمل حسب دستور جدہ سے ایک مصری فوجی دستے اور فوجی بینڈ کے ساتھ جب "منیٰ" پہونچا تو وہاں وہابیوں نے اسے گھیر لیا بعضوں نے اسے مصری بت بتایا بعضوں نے باجے پر اعتراض کیا اور پھر سارے مجمع نے مل کر فوجی دستے پر جو محمل کے ہمراہ تھا پتھر برسانے شروع کر دیئے ابتداءً تو مصریوں نے سمجھا بجھا کر اس ہنگامے کو فرو کرنا چاہا۔ لیکن جب مجمع ہر طرف سے "مشرک مشرک" کی صدا لگاتا ہوا ان پر ٹوٹ پڑا تو ان کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ رہا کہ اپنی حفاظت کے لئے ہتھیار سنبھال لیں۔ مصری دستہ نے مجمع پر اپنے بچاؤ کے لئے فیر کرنے شروع کر دیئے۔ جس سے ۲۵ وہابی ہلاک اور متعدد زخمی ہوئے۔
ابن سعود بھی اس وقت منیٰ میں تھا جب یہ خبر اسے ملی وہ فوراً موقع پر پہونچا اور اپنے اثر سے مجمع کو منتشر کر کے مصری دستے کو حفاظت سے مکہ پہونچوا دیا۔ لیکن حج کے بعد ابن سعود نے مصری حکومت سے اس کے فوجی دستے کی اس حرکت پر باز پرس کی مصر کی حکومت نے اس کے جواب میں خود وہابیوں کو ملزم ٹھیرایا، بات بڑھ گئی، دونوں حکومتوں کے درمیان کشیدگی پیدا ہو گئی اور مصریوں نے تا تصفیہ مصر سے محمل کی روانگی روک دی اور مصری حاجیوں کو بھی حج سے منع کر دیا لیکن کچھ دنوں بعد حکومت مصر اور ابن سعود میں صفائی ہو گئی اور آجکل دونوں ملکوں کے تعلقات نہایت خوشگوار ہیں بلکہ مصر نے حکومت حجاز کو کچھ روپیہ بھی قرض دے رکھا ہے۔

حجاز کے جنوب میں عسیر اور عسیر کے جنوب میں یمن واقع ہے جہاں امام یحییٰ حکمراں ہیں۔ امام یحییٰ چونکہ سنی عقائد کے مسلمان ہیں اس لئے وہابیوں سے مذہبی حیثیت سے انھیں کوئی تعلق نہیں رہا۔ ابتداءً ابن سعود اور امام یمن کے سیاسی تعلقات میں اختلافِ مذہب کے باوجود بھی کشیدگی کی کوئی وجہ پیدا نہیں ہوئی۔ لیکن ۱۹۲۶ء میں عسیر کے علاقہ پر ابن سعود اور امام یمن کے درمیان بدمزگی پیدا ہو گئی۔ عسیر کا کچھ حصّہ ابتدا ہی میں ابن سعود نے اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ اور باقی حصّے پر محمد ادریس حکمران تھا۔ جب محمد ادریس کا انتقال ہوا تو ایک طرف سے امام یحییٰ عسیر میں بڑھے اور دوسری طرف سے ابن سعود، نوبت مقابلہ تک پہنچ گئی لیکن بہت جلد آپس میں صلح صفائی ہو گئی، جتنا علاقہ امام یحییٰ لے چکے تھے وہ انھیں دیکر باقی حصے پر ابن سعود نے اپنا قبضہ جمالیا۔ لیکن اطمینان قلب ابن سعود کو اب بھی نصیب نہ ہوا، وہ سرداران قبائل جو حجاز کی جنگ میں ابن سعود کے دست راست تھے۔ اب کے اُنھوں نے ابن سعود کے خلاف بغاوت کردی، سارا نجد اور عرب وسطیٰ میں دیکھتے ہی دیکھتے بغاوت کے شعلے بھڑکنے لگے، ابن سعود کے لئے اخوان جو اسکی فتوحات کے ذمہ دار تھے اور دوسرے حلیف قبائل کے سرداروں سے جنھوں نے حجاز میں اسکی مدد کی تھی لڑنا بہت مشکل تھا، لیکن اس نے اس بغاوت کو بھی پوری مستعدی سے اُبھرنے سے پہلے ہی کچل ڈالا۔ اخوان کے گاؤں کے گاؤں تباہ کر ڈالے اور امیر عتیبہ اور دادیش کو جو بغاوت کے سرغنہ تھے گرفتار کر کے ساری عمر کے لئے قید کر دیا۔ ان سخت سزاؤں کے ساتھ نجد میں امن وامان قائم کر کے ابن سعود نظم ونسق سلطنت کی درستی کے لئے مکہ واپس آگیا۔

حجاز پر حملہ کی نیت سے جب ابن سعود نے تیاریاں شروع کیں

تو ابتداءً برطانیہ نے ابن سعود کو صلح کی بہت کچھ ترغیب دی تھی اور فلبی کے ذریعے اس پر بہت زور ڈالا تھا کہ شریف حسین سے لڑنے کی بجائے برطانیہ کو درمیان ڈال کر صلح کرلے۔ لیکن جب ابن سعود نے اس مشورے کو نہ مانا اور اس کی فوجیں حجاز کی سرحد کو پار کرکے طائف پر غیر معمولی کامیابی کے ساتھ قابض ہوگئیں۔ تو برطانیہ کو یہ یقین ہوگیا کہ ابن سعود سارے حجاز کو بہت جلد فتح کرلے گا۔ چنانچہ انھوں نے ابن سعود کے مکہ میں فاتحانہ داخلہ سے پہلے ہی اس سے ایک معاہدہ کرلیا۔ جس کی رو سے برطانیہ نے اس کو نجد و حجاز کا بادشاہ تسلیم کرلیا اور ابن سعود نے برطانیہ کو شام اور فلسطین میں آزادی دیدی عراق اور شرق اردن کی سرحدوں سے ملی ہوئی کچھ زمین سے دستبرداری کرلی اور عقبہ کے بندرگاہ پر انگریزوں کا قبضہ تسلیم کرلیا۔

غرض شریف حسین سے برطانیہ کی آخر میں جن مسائل پر رنجش ہوگئی تھی برطانیہ نے ابن سعود سے اسکی صفائی کرلی، اور اس طرح عرب کے اہم مقام اپنے قبضے میں رکھ کر باقی حصّے پر ابن سعود کو مختار بنادیا۔

ابن سعود عام عربوں کے برخلاف نہایت طویل القامت قوی الجثہ اور خوبصورت انسان ہے۔ اگرچہ اس کے لباس اور رہنے سہنے کے انداز میں انتہائی سادگی ہوتی ہے لیکن پھر بھی عام عربوں کے مجمع میں اس کی شخصیت نہایت بارعب، بااثر اور مسحورکن نظر آتی ہے۔ سفر، حضر میں صبح سویرے، اٹھتا ہے۔ رات گئے سوتا ہے، کھانا صرف دو وقت کھاتا ہے صبح و شام۔ لیکن دن بھر کافی یا چائے پینے کا عادی ہے۔ نہایت ذہین، سخت مشقت پسند اور بہت ہی چوکنا انسان ہے، کام کرنے اور احکام لکھوانے سے کبھی نہیں تھکتا، البتہ اس کے سکریٹری لکھتے لکھتے تھک جاتے ہیں۔ طبعاً نہایت متواضع اور خلیق واقع ہوا ہے دوستی

کو وضعداری سے نباہنے کا سلیقہ رکھتا ہے اور دشمنوں کو پامال کرنیکی تدبیر میں خوب جانتا ہے۔ برطانیہ سے دوستی کی اور وضعداری سے نباہ دی، آل رشید کی پامالی کا بیڑا اُٹھایا اور انھیں حرفِ غلط کی طرح مٹا کر رکھدیا۔ مصلحت اندیشی اور دور بینی اس کی فطرت میں داخل ہے۔ سیاسی صحبتوں میں اس کی گفتگو کا انداز بظاہر شدید اور غیر مصالحانہ ہوتا ہے لیکن ہمیشہ ضرورت پر اپنے قدم پیچھے ہٹا لینے کا راستہ یہ محفوظ رکھتا ہے۔ فن خطابت میں سارے عرب میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ بڑے سے بڑے اور مخالف مجمع کو چند منٹوں میں رام کر لیتا ہے۔

نظم و ضبط قائم رکھنے کے معاملے میں وہ نہایت سخت واقع ہوا ہے یہ ناممکن ہے کہ بڑے سے بڑا شخص بھی کوئی بے ضابطگی کرے اور اس کی سزا سے بچ جائے۔ ساتھ ہی وہ سخت مغلوب الغضب اور انتہائی مشتعل مزاج بھی ہے اپنی مرضی کے خلاف اگر کوئی بات دیکھ لیتا ہے تو مجرم کو اپنے ہاتھ سے سزا دیئے بغیر نہیں چھوڑتا۔

ابن سعود کے نکاح میں ہر وقت چار بیویاں رہتی ہیں، لیکن مطلقہ بیویوں کی تعداد سیکڑوں تک پہونچ چکی ہے وہ ہر مہینے، ہر ہفتے یا ہر روز اپنی خواہش کے مطابق ایک نئی شادی کرتا ہے اور دوسرے مہینے دوسرے ہفتے یا دوسرے روز طلاق دیدیا کرتا ہے۔

ابن سعود کی ان شادیوں کا مقصد بعض اوقات سیاسی مصلحت ہوتی ہے۔ مثلاً کسی طاقتور قبیلے سے رشتہ جوڑ لینا اور اسے اپنا حلیف بنا لینا وغیرہ اور بعض اوقات اپنے تعلق سے فائدہ پہونچانا مقصود ہوتا ہے جیسے اپنے بھائی سعد کی بیوی سے نکاح کرکے اس نے اسے فائدہ پہنچا دیا۔ لیکن عموماً

اس کی ان شادیوں کا مقصد "تسکینِ نفس" ہوتا ہے۔ کیونکہ ایک لونڈی سے لیکر ایک ندوی لڑکی تک سے وہ بے تکلف شادی کرلیتا ہے۔

نجد کے وہابی علما جو اس قدر کٹر واقع ہوئے ہیں کہ حجاز میں اصلاحات جدیدہ تک کو پسند نہیں کرتے اور ابن سعود کی ذات پر آئے دن وہابی عقائد کی روشنی میں احتساب کرتے رہتے ہیں اس معاملے میں بالکل خاموش ہیں۔ آجتک کسی وہابی عالم یا مفتی کو یہ جرأت نہیں ہوئی کہ مذہب کی آڑ میں ابن سعود کی اس کھلی ہوئی عیاشی پر چھپواں یا علانیہ احتساب کرے۔ چنانچہ اس وقت بھی جبکہ اس کی عمر ۶۲ برس کی ہوچکی ہے۔ اس کی شادیوں کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آیا۔

ان سیکڑوں موجودہ اور مطلقہ بیویوں سے اس کی اولاد بھی سیکڑوں ہی کی تعداد میں پہنچ چکی ہے۔ لیکن سرکاری حیثیت سے اس کے بڑے لڑکے "ترکی" کے انتقال کے بعد اس کے دو بیٹوں کا نام لیا جاتا ہے ایک سعود جو اس کا ولی عہد اور نجد کا گورنر ہے۔ دوسرا فیصل ولیعہد کا بھائی جو حجاز کے نظم و نسق کو سنبھالنے میں ابن سعود کا مددگار ہے۔

اسلامی ممالک کی طرف سے ابن سعود کی ذات پر عموماً دو الزام لگائے جاتے ہیں، ایک یہ کہ ابن سعود نے عرب کے بعض اہم مقامات پر برطانیہ کا قبضہ تسلیم کرلیا دوسرا یہ کہ سرزمین مقدس میں عیسائیوں کو دخل حاصل کرنے کا موقع دیدیا۔ پہلا الزام فلسطین اور عقبہ کے قبضہ کے متعلق ہے ابن سعود نے ایک معاہدہ کے ذریعہ عقبہ کے بندرگاہ سے دستبرداری کرلی اور دوسرا الزام اس بنا پر ہے کہ حجاز کی کانوں کا ٹھیکہ ابن سعود نے عیسائی کمپنیوں کو دیدیا ہے۔ ان دونوں الزاموں کی تردید میں ابن سعود کی حکومت اسلامی ممالک

میں اپنے ایجنٹوں کے ذریعے بہت کچھ پروپیگنڈا کر چکی ہے۔ لیکن ان سب تردیدوں اور عذرات کے باوجود جو ابن سعود کی طرف سے مسلمانوں کے سامنے پیش کئے جا چکے ہیں یہ حقیقت بہر حال اپنی جگہ قائم رہتی ہے کہ ابن سعود نے حجاز کے اہم مقامات پر برطانیہ کو قبضہ اور حجاز کی کانوں کا عیسائیوں کو ٹھیکہ دیکر حجاز مقدس میں غیر اقوام کی مداخلت کا دروازہ کھول دیا جو رسول اللہ صلعم کے حکم کے سراسر خلاف ہے۔ اسی کے ساتھ غیر وہابی مسلمانوں کو ابن سعود سے یہ شکایت بھی ہے کہ مکے اور مدینہ پر حملہ کے وقت اس کی فوجوں نے قدیم زیارت گاہیں اور مزارات تباہ کر ڈالے اور بزرگان اسلام کی ان قدیم یادگاروں کو مٹا دیا جو غیر وہابی مسلمانوں کے لئے ہمیشہ سے واجب الاحترام تھیں اور جب ابن سعود سے اسکی شکایت کی گئی اور یہ مطالبہ کیا کہ ان زیارت گاہوں کو دوبارہ تعمیر کرا دیا جائے تو ابن سعود نے اس سے انکار کر دیا۔ اسلام یقیناً وہابیت میں محدود نہیں ہے۔ اور نہ مسلمان ہونے کے لئے وہابی ہونا ضروری ہے۔ وہابیت محض ایک عقیدہ ہے۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جس طرح، فروعی مسائل پر مسلمانوں میں بہت سے عقیدے پیدا ہو گئے اسی طرح وہابیت کا عقیدہ بھی عالم وجود میں آگیا۔ ورنہ مسلمان ہونے کے لئے صرف اسلام کے بنیادی اعتقادات کا اقرار شرط ہے اور ان پر بلا کسی استثنا کے ہر خیال اور عقیدہ کا مسلمان ایمان رکھتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر غیر وہابی مسلمان فروعی عقیدے کے اختلاف کے باوجود وہابیوں سے ساتھ رواداری برت سکتے ہیں تو وہابیوں کو یہ حق کیسے حاصل ہو گیا کہ وہ غیر وہابیوں سے نفرت و حقارت کا سلوک کریں اور ان سے جبراً اپنے عقائد منوانے کی کوشش کریں۔ مکہ تنہا وہابیوں ہی کی زیارتگاہ

نہیں ہے بلکہ ہر وہ کلمہ گو مسلمان جو کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتا ہی حق رکھتا ہے کہ اپنے خیال اور عقیدے کے مطابق اس مرکز مقدس کی زیارت کرے جو اس کے مذہب کا مخرج اور منبع ہے۔

اس سے کچھ بحث نہیں کہ ملک پر حکومت کس کی ہے اور حکمراں فرقے کا عقیدہ کیا ہے۔ جہانتک ملک کے نظم و نسق کا تعلق ہے اُسے کامل آزادی دیجا سکتی ہے۔ بشرطیکہ وہ قدیم مذہبی روایات کے تحفظ کی ذمہ داری کرلے۔ لیکن یہ حق اسے ہرگز نہیں دیا سکتا کہ سیاسی اقتدار کے ساتھ وہ جبراً اپنے مذہبی عقیدہ کو بھی اپنے سے مختلف الخیال عقیدہ کے مسلمانوں کے سر منڈھتا رہے۔ مقامات مقدسہ بلاقید عقیدہ سب مسلمانوں کی ملک ہیں اور رہیں گے۔ یہ حق مذہب اسلام نے مسلمانوں کو دیا ہے ابن سعود اور اسکی وہابیت اسے مسلمانوں سے نہیں چھین سکتی!

ابن سعود کی تعلیم صرف مذہبی ہے۔ سوائے عربی کے وہ کوئی دوسری زبان نہیں جانتا اور نہ سوائے عرب کے اس نے کسی اور ملک کی سیاحت کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ملک کے انتظام کا اسے بڑا اچھا سلیقہ اور مختلف طبیعتوں پر قابو رکھنے کا اسمیں بڑا اچھا ملکہ ہے۔ حجاز کو جس وقت اس نے فتح کیا تھا تو یہاں کا انتظام نہایت ناقص تھا، حکومت کا اطراف و جوانب کے قبائل پر کوئی اثر نہیں تھا۔ حج کے ایام میں جدّہ اور مکّہ کے درمیان بدوی قبائل بے تکلف قافلوں کو لوٹ لیا کرتے تھے اور حجاز کی حکومت اسکا کچھ بگاڑ نہیں سکتی تھی، وسائل معاش ان بدویوں کا تھا نہیں ملک بھر میں لوٹ مار ان کا پیشہ تھا۔ شریف کی حکومت خود ان سے عاجز تھی لیکن ان کا قلع قمع نہیں کر سکتی تھی۔

ابن سعود نے جدہ فتح کرتے ہی ان قبائل کی بڑی سختی سے گوشمالی کی معمولی سے معمولی شکایت پر ان قبائل کے افراد کو سخت سے سخت سزائیں دیں۔ چوری ثابت ہوئی تو ہاتھ کٹوا دیا۔ لوٹ مار ثابت ہوئی تو قتل کروا دیا، غرض اسقدر ان پر نگرانی رکھی کہ انھیں بدحواس کردیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابن سعود کی فتح کے دوسرے برس جو حاجی جدہ سے مکہ پہونچے انھیں یہ دیکھکر بڑی حیرت ہوئی کہ انھیں لوٹنے والا تو درکنار ان سے کوئی خیرات طلب کرنیوالا بھی راستہ بھر انھیں نہ ملا۔

حجاز کے نظم و نسق کی درستی میں حافظ وہبہ اور جان فلبی ابن سعود کے مشیر خاص تھے انہی دونوں نے ملک کے اندرونی شعبوں کو بھی درست کیا اور بیرونی ممالک سے بھی تعلقات پیدا کئے اندرون ملک کی اصلاحات میں جدید ایجادات و اختراعات سے بھی فائدہ اٹھایا گیا۔ ٹیلیفون، تار گھر، بجلی گھر، لاسلکی کا اسٹیشن موٹر بس، ہوائی جہاز، ٹینک، مشین گنیں، غرض مکہ میں آج تہذیب جدید کی یہ ساری "برکتیں" موجود ہیں۔ ان کے علاوہ فیکٹریاں کارخانے اور ہسپتال بھی قائم ہیں اور ان میں عیسائی انجنیر اور ڈاکٹر کام کر رہے ہیں۔

لیکن یہ ساری نئی اصلاحات صرف حجاز کی حد تک ہیں نجدی ان اصلاحات کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ان کے نزدیک یہ ساری چیزیں بدعت ہیں جن کا استعمال کرنا مذہبًا حرام ہے، چنانچہ ان اصلاحات کے نفاذ کے معاملے میں وہابی علمائے کئی مرتبہ ابن سعود پر احتساب بھی کیا تھا اور اس پر زور ڈالا تھا کہ ان بدعات کو حجاز میں بھی رائج نہ کرے لیکن ابن سعود نے انھیں سمجھا بجھا کر اس معاملے میں بیجا تعصب برتنے سے روک دیا۔ ابن سعود میں سلطنت کے انتظام کا بڑا اچھا سلیقہ ہے نجد و حجاز کے وحشی قبائل کو رام کر لینا اور ان پر اپنا نائب مقرر کر کے انھیں ایک نظم و ضبط کا پابند کر دینا آسان کام نہیں لیکن ابن سعود نے یہ کام اس قدر خوبی سے

کیا کہ حیرت ہوتی ہے کہ صحرائی قبائل جو مدت سے کسی حکومت کے پابند نہیں تھے وہ کس طرح ایک باقاعدہ حکومت کے ماتحت امن وامان کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

بدوی قبائل کو قابو میں رکھنے کیلئے ابن سعود نے دو اصول اختیار کر رکھے ہیں ایک یہ کہ وہ کسی سردار قبیلہ کی معمولی سے معمولی لغزش کو بھی کبھی معاف نہیں کرتا۔ دوسرے اپنے نائبوں پر جو دُور دراز کے علاقوں میں اس کی طرف سے حکومت کرتے ہیں اور ان ذمہ دار افسروں پر جو اس کے گرد وپیش ہوتے ہیں وہ انتہائی سخت نگرانی رکھتا ہے اور ان کی معمولی سے معمولی شکایت پر بھی انھیں منظر عام پر عبرتناک سزائیں دیئے بغیر نہیں چھوڑتا۔ ایک مرتبہ برطانوی کمیشن نے ابن سعود سے شکایت کی کہ "ذلفی" کا گورنر خفیہ طور پر ترکوں کی مدد کر رہا ہے ابن سعود نے فوراً اس شکایت کی تحقیقات شروع کر دی اور جب اس پر یہ ثابت ہو گیا کہ حقیقتاً ذلفی کے گورنر کے خلاف یہ شکایت درست ہے اس نے اپنا ایک ناقہ سوار اس خط کے ساتھ گورنر کے پاس بھیجا:۔

"۔۔ او دشمن خدا تیری سازشوں کا حال مجھ پر کھل چکا ہے، تیرے لئے یہی بہتر ہے کہ تو فوراً میرے ملک سے نکل جا اور جہاں تیرا دل چاہے چلا جا۔ اگر اس حکم کے پہنچنے کے بعد تو نے ایک گھنٹہ کی بھی دیر کی تو بخدا میں تجھے زندہ نہیں دنیا میں نہیں رہنے دونگا۔"

نجد و حجاز کے دُور و دراز علاقوں کے گورنر اور شیوخ سب کو ابن سعود نے براہ راست اپنے ماتحت رکھا ہے ان لوگوں کا فرض ہے کہ اپنے علاقہ کی ہر غیر معمولی بات وہ ابن سعود تک پہنچائیں اگر کوئی شیخ اپنے علاقہ کا کوئی جرم چھپاتا ہے تو اس کا ہمسایہ شیخ اس کی رپورٹ کر دیتا ہے اور ابن سعود بلا کسی تامل کے ایک فوجی دستہ لئے اس شیخ پر جا پہنچتا ہے اور اس شیخ اور اس مجرم کو ایسی عبرتناک سزا دیتا ہے کہ سارا علاقہ کانپ اٹھتا ہے۔ دور و دراز علاقوں کے گورنروں اور شیوخ کی طرح وہ اپنے

جلو کے خاص آدمیوں اور اپنی حکومت کے ذمہ دار افسروں کے ساتھ بھی یہی سلوک کرتا ہے۔ ایک دن ابن سعود کے بھائی جلودی کے لڑکے نجاد نے جو بہت جھگڑالو اور مغلوب الغضب قسم کا نوجوان تھا ابن سعود کے باڈی گارڈ کے ایک سپاہی کو پیٹ ڈالا، ابن سعود کے پاس جب یہ شکایت پہونچی تو اس نے بے پوچھے گچھے اس نوجوان کو ایک موٹے ڈنڈے سے اس بری طرح دھنا کہ نجاد بیہوش ہو گیا اس کے بعد اس نے اس نوجوان کو اٹھا کر اپنے ڈیرے کے باہر پھینک دیا۔

اسی طرح ایک مرتبہ ایک سپاہی نے ابن سعود کی فوج کے مُلّا کی اس شکایت کی کہ یہ ملا ذاتی رنجش کے باعث اسے اور اس کے ساتھیوں کو روز ستایا کرتا ہے ابن سعود کو جواب دیا ابن سعود نے فوراً ملا کو اپنے حضور میں طلب کیا اور سپاہیوں کو ستانے کی وجہ پوچھی ملا نے کسقدر بدتمیزی سے ابن سعود کو جواب دیا ابن سعود فوراً اپنی جگہ سے اٹھا اور ملا کو اٹھا کر خیمہ کے باہر پھینک دیا اور حکم دیا کہ اس کو ایک ہفتہ جیل میں ڈالدیا جائے۔ ابن سعود کو جسقدر جلد غصہ آتا ہے اسیقدر جلد ٹھنڈا بھی ہو جاتا ہے اکثر اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر غصہ سے بدحواس ہو کر ابن سعود اپنے کسی آدمی کو بے وجہ سزا دیدیتا ہے تو ٹھنڈا ہونے کے بعد اپنی غلطی کا کھلے دل سے اعتراف بھی کر لیتا ہے اور اس شخص کو انعام واکرام سے راضی کر لیتا ہے۔ ایک مرتبہ اس کے داروغہ حضوری سے کوئی غلطی ہو گئی ابن سعود غصہ سے بدحواس ہو گیا، گرمیوں کا زمانہ دوپہر کا وقت جبکہ نجد کی سرزمین بالکل بھاڑ کا نمونہ بنی ہوئی تھی ابن سعود نے یہ انوکھی سزا اس غریب کے لئے تجویز کی کہ یہ شخص ننگے پیر اسی وقت ریاض سے الحصا کے پایہ تخت حفوف تک پیدل اور ننگے پیر روانہ ہو جائے۔ داروغہ حضوری غریب بڈھا آدمی تھا اور بڑھاپے کیساتھ مٹاپے سے بھی نڈھال ہو رہا تھا۔ اس عجیب وغریب حکم سے بہت بدحواس ہوا لیکن مجال

انکار نہ تھی مجبوراً اپنی جوتیاں ابن سعود کے سامنے چھوڑ کر ننگے پیر صحرا کی تپتی ہوئی ریت پر حضوف روانہ ہو گیا۔ لیکن شام تک ابن سعود کا غصہ ٹھنڈا ہو چکا تھا اس نے فوراً ایک تیز رفتار اونٹ اس کے پیچھے بھیجا کہ جلد اس تک پہونچے اور اسے اونٹ پر بٹھا کر واپس ریاض لے آئے۔ جب یہ داروغہ صاحب جو ساری دوپہر تپتی ہوئی ریت پر چلنے سے بدحال ہو رہے تھے ابن سعود کے حضور میں پہونچے تو ابن سعود نے ان سے بڑی مہربانی سے کلام کیا ان کو اپنے برابر بٹھایا اور نوازشات شاہانہ کے ساتھ انھیں گھر روانہ کر دیا۔ جب یہ گھر پہونچے تو دیکھا کہ ابن سعود نے ایک جوان اور خوبصورت جارجین لونڈی بھی انھیں تحفۃً بھیجدی ہے۔ جو اس غریب کیلئے موجب تفریح ہونے کے بجائے بڑھاپے میں بقیہ عمر تک سخت مصیبت بنی رہی!

ابن سعود بہت مخیّر اور مہمان نواز انسان ہے وہ جب کسی کی دعوت کرتا ہے تو دل کھول کر خرچ کرتا ہے اور مہمان کو بڑے اعزاز و اکرام سے رخصت کرتا ہے ایکمرتبہ اس کی ان فضول خرچیوں پر اس کے ایک وزیر نے احتجاج کیا ابن سعود نے یہ دلچسپ جواب دیا:-

"خزانہ نہ کبھی میرے بڑوں نے جمع کیا نہ میں کرنا چاہتا ہوں۔ سلطان عبدالحمید کا وہ لاکھوں کروڑوں روپیہ کیا ہوا جو اس نے اپنے محل میں جمع کر لیا تھا؟ اصل میں ہم جیسا بوتے ہیں ویسا ہی کاٹتے ہیں۔ اگر زمانۂ امن میں بیج اچھی طرح بوؤنگا تو زمانۂ جنگ میں مجھے بڑی اچھی فصل تیار ملے گی۔ امن وامان کے زمانہ میں میں سب کچھ اپنی رعایا کو دیدونگا حتی کہ یہ لباس بھی جو میں پہنے ہوئے ہوں اگر کوئی ضرورت مند آجائے تو نذر کر دونگا اور زمانہ جنگ میں مجھے یقین ہے کہ میری رعایا وہ سب کچھ مجھے دیدیگی جو اس کے پاس ہوگا"

ابن سعود انتہائی مشتعل مزاج اور مغلوب الغضب ہونیکے باوجود نہایت مصلحت اندیش اور دور بیں مدبر ہے۔ اس نے اپنی ذاتی تدبیروں سے نجد فتح کیا اور اپنی ہی تلوار کے زور سے اس نے حجاز پر قبضہ حاصل کیا۔ لیکن اس دوران میں ہمسایہ ممالک اور مغربی قوتوں سے اس نے اپنے تعلقات دوستانہ رکھے اور کبھی ان قوتوں کو اپنے خلاف بے وجہ شکایتوں کا موقع نہیں دیا۔ حالانکہ کویت عراق اور شرق اردن کی سرحدوں پر کئی مرتبہ اس کی فوجوں سے لڑائیاں بھی ہوئیں اور برطانوی ہوائی جہازوں نے بھی بعض موقعوں پر نجد کے قبائل پر بم برسائے لیکن یہ سارے مرحلے ابن سعود نے اس قدر جلد اور اس خوبی سے سلجھا لیئے کہ کسی موقع پر بھی بدمزگی پیدا نہ ہوئی۔

برطانیہ آج ابن سعود کا بہت لحاظ کرتا ہے اس لئے کہ اس نے ابتدا ہی سے برطانیہ کو خوش رکھا اور کبھی کوئی حرکت فاتحانہ جوش و خروش میں بھی اس سے ایسی سرزد نہیں ہوئی کہ برطانیہ کو اس سے شکایت ہوتی۔ سب سے بڑا احسان جو ابن سعود نے برطانیہ پر کیا اور جس کو خود برطانیہ بھی تسلیم کرتا ہے یہ ہے کہ ابن سعود نے شام اور فلسطین کے معاملات سے اپنے آپ کو بالکل بے تعلق رکھا۔ حالانکہ اس کے پیش رو شریف حسین نے انہی دونوں مقامات مقدسہ کے متعلق برطانیہ سے رنجش پیدا کر لی تھی۔ اور اگر ابن سعود بھی شام اور فلسطین کے متعلق شریف حسین ہی کی پالیسی اختیار کر لیتا تو برطانیہ کو فلسطین میں اور فرانس کو شام میں سخت دقتیں پیش آتیں اور تعجب نہ تھا کہ جب مغربی قوتیں چہار سالہ جنگ عظیم کے اثرات مابعد میں مبتلا تھیں۔ ابن سعود کی مداخلت سے شام اور فلسطین کی قسمتیں بھی آج پلٹی ہوئی نظر آتیں۔

شریف حسین سے ابن سعود کی سخت لڑائی تھی۔ لیکن اس کے لڑکے فیصل اور عبداللہ سے اسے کوئی رنجش نہ تھی۔ فیصل اور ابن سعود میں شخصی طور پر معانقہ بھی ہو چکا تھا اور عبداللہ سے حجاز کی فتح کے بعد ہمیشہ صلح رہی۔

یمن سے البتہ دو مرتبہ لڑائی ہو چکی ہے، ایک مرتبہ عسیر کے معاملہ میں دوسری مرتبہ اس واقعہ کے بعد جب ابن سعود پر عین طواف کعبہ کے وقت کسی شخص نے خنجر سے وار کیا تھا اور تحقیقات کے بعد وہ یمنی ثابت ہوا تھا۔ لیکن آج یمن سے بھی ابن سعود کی صلح ہے اور ان دونوں حکومتوں کے درمیان کوئی وجہ رقابت نہیں پائی جاتی۔ اسی طرح مصر سے بھی محمل کے معاملہ میں ابن سعود کو رنجش پیدا ہو گئی تھی لیکن شدت اس میں ابن سعود نے نہ پیدا ہونے دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آج مصر اور ابن سعود کے تعلقات نہایت خوشگوار ہیں اور مصری سرمایہ حجاز کی اصلاح اور ترقیوں میں بڑا کام کر رہا ہے۔

برطانیہ کے بعد عرب سے مغربی قوتوں میں سب سے زیادہ تعلق اٹلی کو ہے۔ چنانچہ اس نے جنگ عظیم کے بعد یمن سے تعلقات بڑھانے کی کوشش کی، اور آپس میں ایک تجارتی معاہدہ کر لینے میں کامیاب بھی ہو گیا۔ لیکن جب ابن سعود نے یمن پر حملہ کیا تو اٹلی نے یمن کی مدد نہیں کی بلکہ غیر جانبدار رہا۔ اٹلی کی اس مصلحت شناسی کے باعث ابن سعود اور حکومت اٹلی کے تعلقات بھی نہایت خوشگوار ہیں۔

ابن سعود وحدت عربیہ کا دل سے حامی ہے اور چاہتا ہے کہ ساری عربی بولنے والی قومیں ایک سلطنت اور ایک امیر کی ماتحتی میں آ جائیں لیکن وہ اندھا دھند اپنی اس خواہش کی تکمیل کے درپے نہیں ہے۔ شام اس

تحریک کا لیڈر رہے۔ لیکن ابن سعود اس معاملہ میں شام کی قیادت قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔

غرض ابن سعود اپنی غیر معمولی شجاعت و شہامت، تدبّر و فراست اور حاکمانہ سلیقے اور صلاحیت کے باعث اس وقت عملاً سارے عرب کا حاکم اور اپنی بعض کمزوریوں اور خامیوں کے باوجود آج ایسی زبردست شخصیت کا مالک ہے کہ مغربی قوتیں اسے نظر انداز نہیں کر سکتیں ـــــ اسی کے ساتھ اس حیرت انگیز حقیقت کا بھی اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ابن سعود نے یہ ساری کامیابیاں خود اپنے دست و بازو سے حاصل کیں اور محض اپنی خداداد صلاحیتوں کے بل پر وہ قابل رشک اعزاز اور وقار حاصل کیا جو عرب کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔

حصہ چہارم

محمد مرزا دہلوی

تعارف

اس حصہ میں مصر و مراکش کی دو نامور شخصیتوں کا تعارف کرایا گیا ہے۔
سعد زغلول پاشا اور غازی محمد بن عبد الکریم الخطابی۔

سعد زغلول مصر کے نہایت با اصول اور مصلحت اندیش سیاسی رہنما تھے جنھوں نے صحیح معنوں میں مصریوں میں سیاسی بیداری پیدا کر دی "آزادیٔ مصر" کے لئے آئینی جد و جہد کی طرح ڈالی اور ملک کے ہر طبقے اور خیال کے افراد کو اس "قومی مطالبہ" پر متحد کر دیا۔ چنانچہ مصری سیاست آج بھی انہی راہوں پر قائم ہے جو اس مدبر اعظم نے متعین کر دی۔

محمد بن عبد الکریم ریفی مجاہد ہیں، آزادیٔ وطن کے لئے انھوں نے کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا جو نصب العین اپنا مقرر کر لیا اس سے کسی لالچ یا دباؤ سے ایک ذرہ برابر بھی ہٹنا پسند نہیں کیا مسلسل چھ برس یورپ کی دو زبردست فوجی قوتوں سے بے جگری کے ساتھ مقابلہ کیا۔ اور سارے مشرقی افریقہ میں روح بیداری پھونک دی۔

اردو داں طبقے میں یہ شخصیتیں غیر معروف تو نہیں ہیں لیکن آج سے

پہلے ان کے صحیح حالات اُردو میں جمع نہیں کئے گئے تھے۔ ہم نے اس حصّے
میں ان کے کارناموں کو نہایت صحت کے ساتھ جمع کر دیا ہے اور ان کے
ساتھ ساتھ مصر و مراکش کی مختصر سی تاریخ بھی قلمبند کر دی ہے تاکہ اس کی روشنی
میں ان دونوں ملکوں کی سیاست کو سمجھنے میں مدد ملے۔ امید ہے کہ پچھلے تین
حصّوں کی طرح یہ حصّہ بھی دلچسپی سے پڑھا جائیگا۔

ناچیز

محمد مرزا دہلوی

غازی محمد بن عبد الکریم الخطابی

سعد پاشا زغلول

مصر جدید کا ہر دلعزیز اور اولوالعزم قومی رہنما ——

آزادی کا پرستار، وطن کا شیدائی، متوازن دماغ، اور مستقل مزاج سیاسی مدبر جو تمام عمر کسی بڑی سے بڑی دھمکی سے مرعوب نہ ہوا، اور کڑی سے کڑی آزمائش میں بھی پورا اُترا!

سعد زغلول، مصر کی قومی تحریک کے تیسرے رہنما اور مصطفےٰ کامل کے جانشین سمجھے جاتے ہیں۔ احمد عربی کی شکست اور مصطفےٰ کامل کی بے وقت وفات کے بعد سعد زغلول نے مصری قوم پرستوں کو اپنی قیادت میں ایک باقاعدہ سیاسی جماعت کی صورت میں منظم کیا اور ملک کی سیاست پر قبضہ کر لیا۔

اپنا سیاسی نقطۂ نظر منوانے کے لئے سعد زغلول کو مدّتوں حکومتِ مصر اور حکومتِ برطانیہ دونوں سے مقابلہ کرنا پڑا، اور واقعہ یہ ہے کہ اس دو طرفہ مقابلے میں وہ ناکام نہیں رہے۔ چنانچہ آج سیاسی حیثیت سے مصر کو جو مرتبہ حاصل ہے وہ سعد زغلول ہی کی سرگرمیوں کا نتیجہ ہے اور جن لائنوں

پر حکومت مصر اس وقت کام کر رہی ہے وہ تقریباً وہی ہیں، جنھیں سعد زغلول نے متعین کر دیا تھا۔

سعد زغلول سنہ ۱۸۶۰ء میں صوبہ "غرابیہ" کے ایک ضلع "ابیان" میں پیدا ہوئے۔ وہاں کے ایک متوسط الحال زمیندار خاندان سے ان کا تعلق تھا۔

ابتدائی تعلیم سعد زغلول کی "ابیان" ہی کے مدرسے میں ہوئی۔ لیکن اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کے لئے انھیں قاہرہ کی مشہور یونیورسٹی "جامعہ ازہر" بھیجا گیا۔ جہاں چار برس کی تعلیم کے بعد انھوں نے اعزاز کے ساتھ تکمیل تعلیم کی سند حاصل کی۔

سعد زغلول ابتدا ہی سے نہایت ذہین اور جوشیلے نوجوان تھے جامعۂ ازہر کی طالب علمی کے زمانہ میں انھیں سیاست سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ عرابی پاشا اس زمانہ میں مصر میں غیر ملکی اقتدار کے خلاف جہاد کی تیاریاں کر رہے تھے، ان کی قوم پرستانہ تحریکوں سے مصر کے نوجوانوں میں جوش و خروش پیدا ہو چلا تھا اور رفتہ رفتہ مصر کے ذمہ دار افراد بھی اس قومی تحریک کی طرف متوجہ ہونے لگے تھے۔ سعد زغلول بھی عربی پاشا کی جماعت کے ساتھ ہو گئے اور حکومت مصر اور برطانیہ کے خلاف جو مظاہرے عربی پاشا کی زیر قیادت ہوتے تھے ان میں سعد زغلول بھی برابر حصہ لیتے رہے۔

سنہ ۱۸۷۹ء میں سعد زغلول نے جامعہ ازہر سے تکمیل تعلیم کی سند حاصل کی اور سنہ ۱۸۸۰ء میں ایک نیم سرکاری مصری اخبار "آفیشل جرنل" کی ایڈیٹر مقرر ہو گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حکومت مصر نے برطانیہ کے اشارے پر عربی پاشا کو وزیر جنگ بنا دیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ عہدہ دیکر عربی پاشا کو راضی کر لیا جائے۔ تاکہ غیر ملکی اقتدار کے خلاف جو ایجی ٹیشن مصر میں جاری تھا وہ بند ہو جائے

لیکن عربی پاشا رشوت لے کر قومی تحریک کو روکنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ انھوں نے وزیر جنگ کا عہدہ تو قبول کر لیا۔ لیکن غیرملکی اقتدار کے خلاف اپنی جدوجہد کو برابر جاری رکھا۔

جب عربی پاشا وزیر جنگ ہوئے تو عربی پاشا کے اور حمایتوں کے ساتھ سعد زغلول کو بھی حکومت کے محکموں میں جگہ ملی۔ یہ ایڈیٹر آفیشیل جرنل کے بعد وزیر داخلہ کے معاون مقرر ہوئے اور اس کے کچھ ہی دنوں بعد ترقی کر کے مال کے صدر افسر کی حیثیت سے صوبہ "غزہ" میں تعینات کر دیئے گئے۔ لیکن اس عہدہ پر سعد زغلول بہت کم کام کر سکے، ۱۸۸۲ء میں عربی پاشا کے حمایتوں میں اور برطانیہ کی فوجوں میں مقابلہ ہو گیا۔ بڑا سخت معرکہ پڑا جس میں ہزاروں مصری کام آگئے۔ قوم پرست مصریوں کا محاذ ٹوٹ گیا عربی پاشا گرفتار کر لئے گئے اور ان کے حمایتیوں کو چن چن کر شہر سے نکال دیا گیا۔

عربی پاشا اور ان کے ساتھیوں پر حکومت مصر نے مقدمے چلائے جس میں ان لوگوں کا جرم بھی ثابت ہو گیا۔ لیکن عربی پاشا اور ان کے ساتھیوں کو بغاوت کے جرم میں پھانسیاں دینے کے بجائے حکومت مصر نے نہایت تدبر اور دانشمندی سے کام لیا۔ عربی پاشا کو سیلون میں نظر بند کر دیا۔ اور ان کے ساتھیوں کو بلا کسی شرط کے رہا کر دیا۔ البتہ عربی پاشا کے دوستوں اور ہوا خواہوں کو حکومت کے شعبوں سے علیحدہ کر دیا۔ ان ہی لوگوں میں جن کو حکومت مصر نے عربی پاشا کی حمایت کے جرم میں اپنے عہدوں سے علیحدہ کیا تھا سعد زغلول بھی تھے۔

سعد زغلول نے سرکاری عہدہ سے علیحدہ ہو کر وکالت شروع کر دی آدمی ذہین اور طباع واقع ہوئے تھے، اس پیشے میں بھی خوب چمکے۔ اور پانچ برس کی پریکٹس کے بعد ۱۸۹۲ء میں مصر کی عدالت کے جج بنا دیئے گئے اس عہدے پر پہونچ کر سعد زغلول کی سیاسی سرگرمیاں زیادہ نمایاں ہو گئیں اور انھوں نے ملکی سیاست میں براہِ راست حصّہ لینا شروع کر دیا۔

سعد زغلول اور مصر کی قوم پرست جماعت کی سیاسی سرگرمیوں کو اچھی طرح سمجھنے کیلئے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان ابتدائی حالات کا مختصر سا خاکہ بھی یہاں پیش کر دیا جائے جن کے باعث یوروپین قوموں کو مصر میں دخل حاصل ہوا اور جس کے مقابلہ کیلئے حریت پسند مصریوں کی اس جدوجہد کا آغاز ہوا جو "استخلاص وطن کی قومی تحریک کے نام سے منسوب کیجاتی ہے۔

مصر پر غیر ملکی اقتدار کی ابتدا ۱۷۹۸ء میں نپولین بوناپارٹ کے حملے سے ہوئی۔ فرانس کے اس منچلے جنرل نے مشرق وسطیٰ اور ہندوستان کو فتح کرنے کی ایک زبردست اسکیم تیار کی تھی اور مصر اس اسکیم کے ماتحت پہلا ملک تھا جس پر نپولین نے ۱۷۹۸ء میں قبضہ کر لیا۔ مصر فتح کرنیکے بعد ایک طرف نپولین شام اور عراق کی مہم کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ دوسری طرف برطانیہ جس کا مفاد نپولین کے اس عزم سے سخت خطرہ میں پڑ گیا تھا سلطان ترکی کو ابھار کر جو مصر کے بھی سلطان تھے شام پر فرانسیسیو کی راہ روکنے کی تدبیریں کرنے لگا۔ چنانچہ شام پر فرانسیسی اور ترکی فوجوں میں جنھیں برطانوی بحری بیڑے کی امداد حاصل تھی دو مقابلے بھی ہوئے ایک میں ترکی فوجیں کامیاب رہیں اور دوسرے مقابلہ میں نپولین کو زبردست فتح حاصل ہوئی۔ لیکن اس فتح کے بعد ہی فرانس میں حالات بگڑ گئے اور

نپولین اپنی مہم کو ادھورا چھوڑ کر فرانس روانہ ہو گیا۔

نپولین کی روانگی کے بعد فرانسیسی فوجیں کمزور ہو گئیں۔ ترکوں نے خشکی کی طرف سے اور انگریزوں نے سمندر کی طرف سے دبانا شروع کیا۔ فرانسیسی جنرل اس دوطرفہ مقابلہ کی تاب نہ لایا۔ اور مصر پر سے فرانسیسی قبضہ اٹھا لینے پر مجبور ہو گیا۔ اسی معاہدہ کو پورا کرانے کے لئے برطانوی فوجیں پہلے پہل مارچ سنہ ۱۸۰۱ء کو "ابوکبیر" کے بندرگاہ پر اتری تھیں۔ فرانسیسیوں کی شکست کے بعد مصر پر اگرچہ ترکی کا قبضہ ہو گیا تھا، لیکن یہ قبضہ برائے نام تھا، فرانسیسیوں کے جاتے ہی مصر کے مملوک اور ترکوں میں معرکے شروع ہو گئے اور انگریز کبھی ایک کے اور کبھی دوسرے کے مشیر یا مدبر کی حیثیت سے مصر ہی میں مقیم رہے۔

مملوک اور ترکوں کی لڑائی میں ترکی فوج کا البانوی النسل جنرل محمد علی پاشا بہت کامیاب رہا۔ اس کو سنہ ۱۸۰۵ء میں سلطان ترکی نے حکومت کے کلی اختیا اختیارات کے ساتھ مصر کا گورنر بنا دیا۔ محمد علی پاشا بڑا صاحب تدبیر شخص تھا۔ اس نے بہت تھوڑے عرصے میں نہ صرف مصریوں کو رام کر لیا بلکہ اپنی بحری اور بری قوت اس قدر بڑھا لی کہ بحیرۂ ایجین کی طاقتوں بلکہ خود ترکی کے لئے اس کے مقابلے ہونا مشکل ہو گیا۔

محمد علی نے اپنی بری اور بحری فوجوں کو منظم کر کے شام اور یونان میں اپنے اثرات بڑھانے شروع کر دیئے۔ عرب میں وہابیوں کا استیصال کر کے اس کی فوجیں شام کی طرف بڑھیں اس کے بحری بیڑوں نے یونان کے کئی چھوٹے چھوٹے جزیروں پر قبضہ کر لیا۔ اس نوبت پر سلطان ترکی اور محمد علی میں بعض نجی باتوں پر رنجش ہو گئی۔ محمد علی کی فوجیں شام، دمشق،

حلب فتح کرتی ہوئی قونیہ پہونچ گئیں۔ سلطان کے لئے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ وہ محمد علی سے صلح کرے اور شام اور قونیہ پر اس کا اقتدار تسلیم کرلے غرض محمد علی اس قدر طاقتور ہوگیا تھا کہ خود ترکی سلطنت کو اس کے مقابلے کی ہمت نہیں رہی تھی لیکن اس قدر طاقتور ہونے کے باوجود محمد علی نے ہمیشہ ترکی سلطنت کا اقتدار تسلیم کیا، اور اس کے جواب میں ۱۲۔ فروری ۱۸۴۱ء کو سلطان ترکی نے ایک فرمان کے ذریعے مصر کی حکومت مستقلاً محمد علی کے خاندان میں منتقل ہوتے رہنے کی منظوری دیدی۔ چنانچہ یہی خاندان آجتک مصر پر حکمران ہے۔

محمد علی نے مصر پر چالیس سال حکومت کی اور ہر حیثیت سے مصر کی اہمیت کو دوبالا کر دیا لیکن اس کے انتقال کے بعد اس کی اولاد مصر کے وقار کو برقرار نہ رکھ سکی۔

محمد علی کے پوتے عبّاس اور عباس کے چھوٹے چچا سعد کے زمانہ سے حکومت مصر پر زوال آنا شروع ہوا۔ انگریزی اور فرانسیسی قوتیں جو محمد علی کے زمانہ میں بیکسی کے عالم میں پڑی ہوئی تھیں ابھر آئیں اور ایک مرتبہ پھر حکومت مصر کی "مشیر کار" بن بیٹھیں۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں میں اگرچہ نپولین کے زوال کے بعد قومی رقابت ختم ہو چکی تھی۔ لیکن سیاسی رقابت بدستور باقی تھی۔ چنانچہ انگریزوں اور فرانسیسیوں نے مصر کی اصلاح اور ترقی کے سلسلے میں اپنے اپنے مفاد کے پیش نظر چھاں اور بہت سے مشورے "بلا کسی معاوضہ" کے حکومت مصر کے آگے پیش کئے۔ وہیں فرانس کی طرف سے سوئز کنال کو فرانس کے حوالے کرنے کی تجویز بھی سعد پاشا کے روبرو

پیش ہوئی۔ یہ تجویز برطانوی مفاد کے خلاف تھی۔ حکومت برطانیہ کی طرف سے اس کی مخالفت ہوئی اور فرانس کو اپنے "مشورے" میں کامیابی نہ ہوسکی لیکن دو ہی برس بعد یعنی ۱۸۶۹ء میں جب کہ مصر پر اسمٰعیل پاشا حکمراں تھا سوئز کنال والی تجویز پر برطانیہ اور فرانس کا اتفاق ہوگیا، بہت بڑے سرمایہ سے ایک کمپنی قائم ہوئی جس میں فرانس نے برطانیہ کو بھی حصے دیئے اور مصر کا بھی کچھ حق تسلیم کرلیا اور کنال کی تعمیر کا کام شروع کرادیا۔

لیکن مصر کے حصے ۱۸۷۵ء تک سب کے سب برطانیہ نے خرید لئے یہ حصے جو خدیو اسمٰعیل کے قبضہ میں تھے ان کی تعداد ایک لاکھ ۷۶ ہزار پونڈ ہوئی۔

خدیو اسمٰعیل نے تخت نشین ہوتے ہی انگلستان اور فرانس کے مشورے سے مصر میں بڑے پیمانہ پر جدید اصلاحات جاری کرنی شروع کردی تھیں۔ ڈاکخانے، تارگھر، مصری بندرگاہوں کی درستی، روشنی کے میناروں کی تعمیر وغیرہ وغیرہ اور ان اصلاحات کے ساتھ ساتھ سوڈان اور حبشہ پر فوج کشی بھی شروع کردی مصر کے خزانے میں اتنی سکت نہ تھی کہ ایک ساتھ تعمیری اور تخریبی سرگرمیوں کے اخراجات برداشت کرجاتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خدیو اسمٰعیل کو مغربی قوتوں سے قرض لینا پڑا لیکن قرض کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ ابتدا میں تو اسے قرض ملا لیکن جب مغربی قوموں نے دیکھا کہ ملک کے ذرائع آمدنی اتنے نہیں کہ خدیو اپنا قرض ادا کرسکے تو اس کی ساکھ بگڑ گئی، آخری جائداد اس کے پاس سوئز کے حصص تھے وہ برطانیہ کے ہاتھ بیچ ڈالے لیکن چھٹکارا قرض سے پھر بھی نہ ہوسکا۔ مغربی قومیں جن میں برطانیہ اور فرانس پیش پیش تھے قرضوں کی ادائیگی کا سوال بیچ میں رکھ کر ملک کے نظم ونسق میں دخیل ہوتی گئیں۔ سن ۱۸۷۶ء میں فرانسیسیوں

اور انگریزوں کا ایک مشترکہ کمیشن مصر کے حالات پر غور کرنے کیلئے بیٹھا، اور اس
کمیشن کی رائے سے ملک کے آمد و خرچ پر برطانیہ اور فرانس نے مشترکہ
قبضہ کر لیا۔ برطانیہ نے ملک کی آمدنی اپنی نگرانی میں رکھی اور فرانس نے ملک
کا خرچ اپنے ہاتھ میں رکھا۔ اس انتظام کے بعد اگرچہ ملک میں خدیو اور اس
کی کابینہ بدستور باقی رہی۔ لیکن ملک کا نظم و نسق بالکلیہ برطانیہ اور فرانس
کے قبضے میں آگیا اور مصر کی داخلہ اور خارجہ پالیسی پر بھی انہی دونوں کا قبضہ
ہو گیا۔ اس صورت حال سے وطن پرست مصریوں اور ترکوں دونوں کی
آنکھیں کھل گئیں۔ سلطان نے خدیو اسمٰعیل کو معزول کر کے اس کے لڑکے
توفیق کو مصر کا والی مقرر کر دیا۔ لیکن برطانیہ اور فرانس کے مشترکہ قبضہ کو مصر سے
دور کرنے کی کوئی تدبیر سلطان کی سمجھ میں نہ آئی۔ یہ حالات تھے جن سے متاثر
ہو کر مصر میں عربی پاشا کی زیر قیادت "قوم پرست" نوجوانوں کی ایک جماعت
بنی اور چپکے چپکے غیر ملکی اقتدار کے خلاف ملک میں بغاوت کی آگ بھڑکانے لگی
انگریزوں اور فرانسیسیوں نے اپنے اقتدار کے خلاف جب اس خطرے کو بڑھتا ہوا
پایا اور یہ دیکھا کہ مصر کے ذمہ دار افراد کی ہمدردیاں بھی، اس قوم پرست جماعت کے ساتھ
ہیں تو انھوں نے اس جماعت کے سرغنہ عربی پاشا کو لالچ دیکر توڑنا چاہا۔ عربی پاشا فوج
میں کرنل تھے۔ انھیں ترقی دیکر مصری فوج کا جنرل کر دیا۔ اسکے بعد انھیں نائب وزیر
جنگ بنا دیا، اور کچھ دنوں بعد انھیں مصر کے کابینہ میں شریک کر لیا۔ لیکن جب دیکھا کہ
عربی پاشا ان ذاتی ترقیوں کے باوجود برطانیہ اور فرانس سے اشتراک عمل کرنے کیلئے
تیار نہیں اور وہ اور ان کی جماعت برابر غیر ملکی اقتدار کے خلاف ایک منظم
بغاوت کی تیاریاں کر رہی ہے تو انھوں نے قوم پرستوں پر تشدد برتنا شروع
کر دیا اس تشدد کا نتیجہ یہ ہوا کہ قوم پرست بھڑک اٹھے اور انھوں نے

غیر ملکیوں کے خلاف ہتیار سنبھال لئے۔ سارے ملک میں بغاوت پھیل گئی۔ عربی پاشا کے جھنڈے کے نیچے کئی ہزار سر فروش جمع ہوکر اسکندریہ کی طرف بڑھے کہ انگریزوں اور فرانسیسیوں کی مٹھی بھر فوج کو جو وہاں حفاظت کیلئے رکھی گئی تھی کاٹ کر سمندر میں پھینک دیں۔ انگریز اس مسلح بغاوت سے گھبرائے، پہلے انھوں نے فرانس کو دعوت دی کہ برطانوی اور فرانسیسی فوجیں مل کر مصر کے باغیوں کا قلع قمع کر ڈالیں، لیکن فرانس نے برطانیہ کے ساتھ فوجی اتحاد سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد برطانیہ نے اٹلی کو دعوت دی کہ وہ اپنی فوجیں مصر بھیج دے۔ لیکن اٹلی نے بھی اس سے انکار کر دیا۔ برطانیہ چاہتا تھا کہ کسی اور یورپی قوت کو اپنے ساتھ ملا کر مصر پر فوجی قبضہ کرے تاکہ بعد کو تنہا اس پر بین الاقوامی ذمہ داری نہ رہے۔ لیکن اس وقت کوئی یوروپین طاقت اس ذمہ داری میں برطانیہ کا ہاتھ بٹانے پر آمادہ نہیں ہوئی۔ اس لئے مجبور ہوکر برطانیہ نے تنہا اپنی فوجیں اسماعیلیہ میں اتار دیں۔ تل الکبیر پر ان کا عربی پاشا کی فوجوں سے مقابلہ ہوا۔ گھمسان کا رن پڑا۔ عربی پاشا کو شکست ہوئی اور برطانیہ نے انھیں اور ان کے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا یہ واقعہ ۱۳۔ ستمبر ۱۸۸۲ء کا ہے۔

حکومت مصر کی طرف سے عربی پاشا اور ان کے ساتھیوں پر بغاوت کا مقدمہ چلایا گیا لیکن انھیں سخت سزائیں دینے کی بجائے عربی پاشا کو سیلون میں جلاوطن کر دیا۔ اور ان کے ساتھیوں کو تنبیہہ کے بعد رہا کر دیا۔

مصر کے قوم پرستوں کی قوت کو توڑنے کے بعد مصر کے نظم و نسق کی ذمہ داری بھی حکومت برطانیہ نے اپنے سر لے لی۔ آمد و خرچ کے جملہ شعبہ جات پر برطانوی افسروں نے قبضہ کر لیا اور یہ اعلان کر دیا کہ:۔

مصر کے وزیروں اور گورنروں کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ فی الحال ملک کے نظم و نسق

کی ذمہ داری حکومت برطانیہ پر ہے اور حکومت برطانیہ کو اس پر اصرار ہے
کہ اس سلسلے میں جو مناسب "پالیسی" وہ تجویز کرے اس پر عمل کیا جائے۔
جو گورنر اور مصری افسر اس پر عمل نہ کرینگے وہ اپنے عہدوں سے علیحدہ کر دیئے
جائینگے ۔"

اس اعلان کے بعد چن چن کر وہ سب مصری عہدہ دار اپنی اپنی خدمتوں سے علیحدہ کر دیئے گئے جنھیں برطانوی پالیسی سے ہمدردی نہ تھی۔ مصر پر برطانوی قبضے کا یہ عملی ثبوت تھا۔ اگرچہ اس اعلان کے فوراً ہی بعد حکومت برطانیہ نے ایک اور اعلان میں مصر کے متعلق اپنی حکمت عملی کو زیادہ واضح کرتے ہوئے بتا دیا تھا کہ:۔

"ہمارا کام مصر پر حکومت کرنا نہیں ہے بلکہ ہم مصریوں کو یہ سکھانا چاہتے
ہیں کہ حکومت کس طرح کی جاتی ہے۔ ہم صرف تدابیر بتا دیں گے اور مصری
ہماری نگرانی میں اس پر عمل کیا کریں گے ۔"

لیکن مصر کے نظم و نسق پر برطانیہ کے قبضہ کرتے ہی سلطان ترکی کو اعتراض ہوا۔ وہ اپنی سلطنت کے کسی حصے میں برطانیہ کا فوجی قبضہ پسند نہیں کر سکتے تھے۔ سلطان ترکی کے اس اعتراض کو فرانس اور روس کے رویہ سے بہت تقویت پہونچی اور بین الاقوامی صورت حال کے بگڑ جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ برطانیہ نے اس وقت فوراً اپنا ایک وفد باب عالی میں بھیجا اور یہ تجویز پیش کی کہ حکومت ترکی اور حکومت برطانیہ کا ایک ایک افسر مصر میں بھیجا جائے جو مصری نظم و نسق کی کمزوریوں کی جانچ کرے۔ اور اپنی اپنی حکومتوں کو اس کے متعلق رپورٹ کرے۔ اس رپورٹ کے بع

کوئی مناسب قدم اٹھایا جائے۔ سلطان نے یہ تجویز منظور کرلی۔ برطانوی اور ترکی وفد دریافت حال کو مصر گئے اور ۱۸۸۷ء میں انھوں نے مصر کے حالات کے متعلق اپنی اپنی حکومتوں کو رپورٹ پیش کر دی۔ اور اسی سال برطانیہ نے یہ اقرار کر لیا کہ تین برس کے اندر اندر وہ مصر سے اپنا فوجی قبضہ اٹھالے گا۔" بشرطیکہ حالات اس وقت تک پُرامن رہے"۔ برطانیہ نے چپکے سے یہ شرط معاہدے میں اس لئے بڑھادی تھی کہ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو آیندہ بھی مصر پر فوجی قبضہ قائم رکھنے میں بطور دلیل کام دے سکے۔

معاہدہ کے بعد مصر میں اصلاحات کا کام شروع ہوا۔ آمد و خرچ میں تناسب پیدا کیا گیا۔ کسانوں پر ٹیکس گھٹائے گئے۔ محکمہ انصاف اور مال میں زیادہ باقاعدگی پیدا کی گئی اور ان ساری اصلاحات میں حکومت برطانیہ اور حکومتِ مصر میں کامل اتفاق رہا۔ لیکن اس اتفاق میں کچھ دنوں بعد فرق آگیا۔ جنوری ۱۸۹۲ء میں خدیو توفیق جس کے تعلقات انگریزوں سے نہایت اچھے تھے۔ انتقال کر گیا اور اس کے بجائے، اس کا لڑکا عباس حلمی مصر کے تخت پر آیا۔ عباس حلمی نوجوان اور جوشیلا واقع ہوا تھا اس نے تخت نشین ہوتے ہی جنوری ۱۸۹۳ء میں مصطفےٰ پاشا فہمی کو جو انگریزوں کے اثر میں تھا وزارت سے علیحدہ کر دیا اور اس کی جگہ فکری پاشا کو جو قوم پرستانہ خیالات رکھتا تھا وزیر اعظم بنا دیا۔ اسی فکری پاشا کے زمانہ میں سعد زغلول مصری عدالت کے جج مقرر ہوئے۔ اور مصر کی سیاست میں عملی حصّہ لینا شروع کر دیا۔

اس زمانہ میں مصطفےٰ کامل کی قوم پرستانہ سرگرمیوں نے مصر میں ایک مرتبہ پھر ہنگامہ برپا کر دیا۔ اور چونکہ خود خدیو عباس حلمی انگریزوں کو ناپسند کرتا تھا۔ اس لئے اس تحریک کو بہت جلد اہمیت حاصل ہو گئی۔

مصطفیٰ کامل نے جب حالات کو سازگار دیکھا تو ایک زبردست سیاسی چال چلی۔ مصر کے معاملہ میں انگریزوں اور فرانسیسیوں سے رقابت پیدا ہو گئی تھی، اس رقابت کو ہوا دینے اور ان دونوں کو ایک دوسرے سے متصادم کر دینے کی یہ صورت نکالی کہ ۱۸۹۵ء میں مصطفیٰ کامل نے صدر جمہوریہ فرانس کو مصریوں کی طرف سے ایک عرضداشت بھیجی جس میں انگریزوں کے ظلم اور زیادتی اور مصریوں کی بے بسی اور مظلومی کی داستان نہایت مؤثر الفاظ میں پیش کرتے ہوئے حکومت فرانس سے یہ درخواست کی کہ وہ مصر کے معاملات میں مداخلت کرے اور مصریوں کو انگریزوں کے پنجۂ استبداد سے چھڑائے۔

اس عرضداشت کے ساتھ مصطفیٰ کامل نے ایک کارٹون بھی صدر فرانس کی خدمت میں بھیجا۔ اس کارٹون میں ایک شاندار ایوان دکھایا گیا تھا جس میں ایک تخت کے قریب ایک ملکہ کھڑی تھی اس ملکہ سے جمہوریہ فرانس مراد تھی، ملکہ کے بائیں طرف چار خواتین اپنے قومی پھریرے ہاتھوں میں لئے کھڑی تھیں ان چاروں سے ریاستہائے متحدہ امریکہ، یونان، بلجیم اور اٹلی کی سلطنتیں مراد تھیں جو فرانس کی امداد سے آزاد ہوئی تھیں۔ ملکہ کے دائیں طرف مصر کے بہت سے افراد کھڑے دکھائے گئے تھے، جن کے آگے مصطفیٰ کامل تھے جو ملکہ کے حضور میں عرضداشت پیش کر رہے تھے۔ ان کے آگے زمین پر ایک شیر ببر بیٹھا ہوا تھا جس پر ایک پریشاں حال نیم عریاں عورت بیٹھی ہوئی تھی اور اس عورت کے قریب ایک خوفناک جلاد تلوار لئے کھڑا تھا۔ پریشان حال عورت مصر تھی اور شیر ببر اور جلاد حکومت برطانیہ اس کارٹون کے ایک سرے پر ہلالی نشان اور دوسرے پر چند شعر تھے، جن میں فرانس سے امداد کی درخواست کی گئی تھی۔

اس عرضداشت اور کارٹون کی ہزاروں نقلیں فرانس کے اخباروں اور برطانوی

پارلیمنٹ کے ممبروں اور سیاست دانوں کو بھیجی گئیں، اور سارے یورپ میں تقسیم کی گئیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرانس میں مصر سے عام ہمدردی پیدا ہو گئی اور یورپ میں ایک ہلکی سی اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔

برطانیہ میں اس وقت گلیڈ اسٹون وزیر اعظم تھا۔ اس نے اس عرضداشت کے جواب میں آرمینیا کا قصہ کھڑا کر دیا۔ اور آرمینیوں پر ترکوں کے بے پناہ مظالم کا اس انداز سے ڈھول پیٹا کہ تخلیۂ مصر کی آوازیں اس شور و شغب میں دب کر رہ گئیں۔ اور دوسری طرف انگریزوں نے خدیو مصر عباس حلمی کو اس قوم پرست تحریک کے عواقب و نتائج سے اس بری طرح ڈرایا کہ خدیو انگریزوں سے صلح کرنے پر راضی ہو گیا۔ چنانچہ دسمبر ۱۸۹۵ء میں فکری پاشا اپنے عہدے سے علیحدہ کر دیئے گئے اور ان کی جگہ پھر انگریزوں کے ہوا خواہ مصطفیٰ پاشا فہمی وزیر اعظم بنا دیئے گئے، اور مصر کے نظم و نسق میں پہلے سے زیادہ مصریوں کو اقتدار دیکر اس فتنے کو کمزور کر دیا گیا۔ خدیو عباس حلمی کی اس حرکت سے قوم پرست تحریک میں کمزوری ضرور پیدا ہو گئی۔ لیکن یہ تحریک فنا نہیں ہوئی۔ مصطفیٰ کامل کی سرگرمیاں بدستور جاری رہیں بلکہ ان کو زیادہ قوی بنانے کیلئے انھوں نے ایک اخبار بھی نکال لیا۔ جس میں مصر پر انگریزی قبضہ کے خلاف نہایت سخت مضامین شائع ہونے لگے۔ مصطفیٰ کامل نے اس اخبار کے ذریعے مصر اور عالم اسلام کی بڑی خدمت کی۔ مشرق میں اہل مغرب کی سیاسی چالبازیوں پر نہایت سخت احتساب کیا اور خود مسلمانوں کے آپس کے اختلاف پر بڑی سختی سے دارو گیر کی۔

اختلاف بین المسلمین پر مصطفیٰ کامل کے ایک زبردست مقالہ کا اقتباس یہ ہے:-

"دست اسلامیہ اس گھاٹ پر پہونچ گئی ہے جس میں انسان ڈوب سکتا ہے

لیکن سیراب نہیں ہو سکتا اس کے اپنے عقائد میں اختلاف ہے وہ دنیوی معاملات میں متفرق ہے یہاں تک کہ وہ وطن، ملت، مشرب، مذہب اور خود اپنے نفس کو فراموش کر چکی ہے یہی وجہ ہے کہ وہ ایک دائمی بدبختی میں مبتلا ہے۔ ممکن ہے عام افراد قوم میں کسی کے نزدیک اس خوفناک نااتفاقی کا ثبوت کچھ مشکل ہو لیکن خواص کے لئے کچھ مشکل نہیں۔ حوادث نے ثابت کر دیا ہے اور تاریخ گواہ ہے کہ ہندوستان پر انگلستان کا قبضہ ناممکن تھا مگر غدار بھائیوں نے اس کو انگریزوں کی آغوش میں ڈال دیا۔ فرانس نے مراکشی اور ٹیونسی لوگوں کی مدد سے الجزائر پر تسلط جمایا اسی طرح عثمانیوں کے خلاف روس کو ایرانیوں نے مدد دی۔ اب ہمارے سامنے چین اور جاپان کا طرز عمل ہے، سب سے بڑا سبب یہی ہے، جس نے مغرب کو مشرق پر مسلط کر دیا۔"

ایک اور مقالہ میں یورپین اقوام کی سیاسی حکمت عملی پر احتساب کرتے ہوئے مصطفیٰ کامل لکھتے ہیں :-

"یورپ کے اصول استعمار نے مشرق کے اخلاق حسنہ کو تباہ کر دیا۔ صفائے قلب، ہمدردی، غمگساری شجاعت، اخلاص، ایثار، ہمت سب چیزیں فنا ہو گئیں اور متاع اخلاق کے ساتھ مشرق کی جمع شدہ دولت بھی لٹ گئی۔ مستعمرین کا نوآبادیوں میں جو طرز عمل ہے، اسے انسانیت و مدنیت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ لوگ مسافر ہیں لیکن اہل دیار سے جدا رہتے ہیں اور ان سے سخت نفرت کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک انگریز اور ہندوستانی، ایک فرانسیسی اور ٹیونسی میں ایک غلام اور آقا سے بھی زیادہ تفاوت ہے۔

پس کیا یوروپ کا دعوے مدنیت وانسانیت ایک بے دلیل دعویٰ نہیں ہے
اس سے زیادہ بدبختی کیا ہوگی کہ اہل مغرب نے بعض مشرقی ممالک کو اپنے اپنے
استعمار کے لئے مخصوص کر لیا ہے۔ کیا کسی قوم کا مستقبل اس سے زیادہ
تاریک بھی ہو سکتا ہے؟"

مصطفےٰ کامل کی جوشیلی تحریروں اور پبلک تقریروں نے مصریوں میں جان سی ڈال دی تھی اور ان میں آئینی طریقے پر انگریزوں سے مقابلے کا جذبہ پیدا ہو گیا، حکومت برطانیہ بھی اس بڑھتے ہوئے جذبہ وطنی سے بے خبر نہیں تھی۔ اس نے قوم پرستوں کو رام کرنے کیلئے، جہاں ملک میں نئی نئی اصلاحات نافذ کیں وہاں عربی پاشا کو بھی سیلون سے مصر واپس آنے کی اجازت دے دی۔ مقصد یہ تھا کہ قوم پرستوں کے مطالبات میں شدت نہ پیدا ہونے پائے اور مصر پر برطانوی قبضہ سے کوئی بین الاقوامی پیچیدگی نہ پیدا ہو جائے۔ چنانچہ برطانیہ کی یہ چال فرانس کو رام کرنے میں تو کامیاب رہی لیکن مصر کے قوم پرستوں کو مطمئن نہ کر سکی۔

فرانس اور برطانیہ کے سیاسی اختلافات میں حالات کی تبدیلی کے باعث کمی ہونے لگی تھی۔ مصر میں اپنی کامیابی سے مایوس ہو کر اب فرانس مراکش میں اپنے قدم جمانا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے لئے بھی اسے برطانیہ کی ہمدردی کی ضرورت تھی اور برطانیہ جس نے ۱۸۸۲ء میں تین برس کے اندر مصر پر سے فوجی قبضہ اٹھا لینے کا وعدہ کیا تھا اب ایک حیلے کی تلاش میں تھا تاکہ اس پر وعدہ خلافی کا الزام بھی نہ آسکے اور مصر پر بدستور اس کا فوجی قبضہ قائم رہے۔
ان دونوں قوموں کی غرض مندیوں نے بالآخر آپس میں سمجھوتے کی

اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا گیا تھا۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں جب مصطفیٰ کامل کی تحریکوں نے زور پکڑا اور مصر میں سلطان ترکی کی حمایت کا جوش پیدا ہوا تو برطانیہ نے حکومت مصر کو سمجھایا کہ "سینا" کا جزیرہ نما سارے کا سارا مصر کی سرحد میں داخل ہے اس لئے مصریوں کو اس کا انتظام کرنا چاہئے۔ چنانچہ مصری حکومت کی منظوری سے اس جزیرہ نما کے انتظام کے لئے ایک برطانوی افسر مقرر کیا گیا جس نے وہاں پہونچکر مصر کی طرف سے انتظام شروع کر دیا۔ حکومت مصر کی یہ حرکت سلطان کو ناگوار گذری سلطان نے ایک طرف تو اپنے ایک افسر کو "تابہ" بھیجا جہاں اس نے فوجی قبضہ کر لیا اور دوسری طرف مصر کے ترکی سفیر مختار پاشا کو ہدایت کی کہ وہ مصر کی اس حرکت کا جواب مانگے۔ مختار پاشا اور خدیو کی کانفرنس ہوئی۔ مختار پاشا نے یہ ثابت کیا کہ جس علاقہ میں برطانوی افسر متعین کیا گیا ہے وہ سلطنت ترکی کی سرحد میں ہے لیکن برطانوی سفیر نے جو اس کانفرنس میں شامل تھا اس کو نہ مانا اس لئے کہ اس کو تسلیم کر لینے سے برطانیہ کے مشرقی تجارتی راستے کی حفاظت خطرہ میں پڑجاتی تھی۔ اور جب بات بڑھی تو حکومت برطانیہ نے ترکی کو الٹی میٹم دیدیا کہ یا تو "تابہ" سے اپنا فوجی قبضہ اٹھائے۔ یا برطانیہ سے جنگ کرے۔ اس برطانوی الٹی میٹم کے بعد ترکی نے تابہ سے اپنا فوجی قبضہ اٹھا لیا اور اکتوبر سنہ ۱۹۰۶ء میں ترکی اور مصری کمیشن میں ایک نیا معاہدہ ہوا۔ جس میں ترکی اور مصر کی سرحدوں کا از سر نو تعین کیا گیا اور یہ قضیہ جو خواہ مخواہ اٹھایا گیا تھا برطانیہ کی فتح پر ختم ہو گیا۔

ترکی اور مصر کے اس قضیہ سے مصر کی قوم پرستانہ تحریکوں میں کچھ سستی

ضرور پیدا ہو گئی۔ لیکن کمزوری نہیں پیدا ہوئی۔ اب قوم پرست ایک سیاسی جماعت میں منظم ہو گئے تھے، اور اُنھوں نے اپنا نصب العین مصر کی آزادی کامل متعین کیا تھا اور اپنی ساری سرگرمیاں اسی ایک نقطے پر مرکوز کر دی تھیں۔

۱۹۰۷ء میں برطانوی وزیرِ خارجہ نے مصر کے برطانوی قونصل جنرل یا ہائی کمشنر لارڈ کرامر کی آخری رپورٹ جو اُنھوں نے اپنے عہدہ سے ہٹنے کے وقت حکومت برطانیہ کو کی تھی دارالعوام میں پڑھ کر سنائی اور اس رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے سر ایڈورڈ گرے نے قوم پرستوں کو ملک کا دشمن قرار دیا اور خدیو کو متنبہ کیا کہ یہ فتنہ خود اس کے اقتدار پر کاری ضرب ثابت ہوگا۔

قوم پرستوں نے سر ایڈورڈ گرے کی اس تقریر کے خلاف سخت احتجاج کیا، مصطفےٰ کامل خود لندن گئے اور وہاں اُنھوں نے سر ایڈورڈ گرے کی مخالفت اور مصر کی حمایت میں زبردست تقریریں کیں۔ اخباروں میں مضامین لکھے۔ ان سرگرمیوں کا اثر یہ ہوا کہ ایڈورڈ گرے کو دارالعوام میں اپنے بیان کی تاویل کرنی پڑی۔ اسی کے ساتھ اُنھوں نے برطانوی وزارت کے دوسرے ہی برس یعنی فروری ۱۹۱۰ء میں سوئز کنال کی برطانوی اور فرانسیسی کمپنی کو مزید مراعات دینے کا ایک مسودہ قانون اسمبلی میں پیش کیا جسے قوم پرستوں کے اثر سے اسمبلی نے نامنظور کر دیا۔ اور اس مسودے کے اسمبلی میں نامنظور ہونے کے دو ہی دن بعد بطروس پاشا کو ایک مسلمان نوجوان نے قتل بھی کر دیا جو بعد میں معلوم ہوا کہ قوم پرست جماعت کا ایک فرد تھا۔

حکومت مصر اور قوم پرستوں کی اس سیاسی کشمکش کے دوران میں سعد زغلول کا بہت کم ذکر آیا ہے۔ اس کی یہ وجہ ہرگز نہیں ہے کہ اس دوران

یں سعد زغلول قومی تحریک سے علیحدہ رہے یا اس میں اُنھوں نے عملی حصہ نہیں لیا بلکہ اس کے برخلاف مصر کی وزارت میں ایک سعد زغلول ہی تھے جو قوم پرستوں کے خیالات کی صحیح نمائندگی کیا کرتے تھے اور اپنے ساتھیوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اسمبلی اور کابینہ کے اجلاسوں میں حزب الوطن کے مقاصد کی حمایت کرتے رہتے تھے درمہل انہی کوششوں کا یہ اثر تھا کہ اسمبلی میں آراء حزب الوطن کے لئے ہموار ہوتی جاتی تھی، اور حکومت کے لئے اس قومی جماعت کے خلاف کوئی کارروائی کرنا مشکل ہوگیا تھا۔ قوم پرستوں کو سعد زغلول کی ذات پر بڑا اعتماد تھا اور وہ سمجھتے تھے جو امداد ان کے مقصد کو حکومت کے حلقوں میں انکی ذات سے مل رہی ہے وہ کسی اور سے ممکن ہی نہیں۔ نہ صرف قوم پرست بلکہ حکومت بھی سعد زغلول کو قوم پرستوں کا نمائندہ اور لیڈر سمجھتی تھی۔ لارڈ کرومر جو مصر میں مدتوں حکومت برطانیہ کے مفاد اور پالیسی کے محافظ رہے اور جو مصر کی قوم پرست تحریک کے نہایت اچھے نقاد سمجھے جاتے تھے۔ اُنھوں نے مصر سے رخصت ہوتے وقت سعد زغلول کے متعلق یہ کہا تھا:۔

"اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو میں کہہ سکتا ہوں کہ موجودہ وزیر تعلیم سعد زغلول پاشا کا مستقبل نہایت شاندار ہے۔ ان کی ذات مصر کے لئے ہر اعتبار سے مفید ثابت ہوگی۔ ان میں وہ سب صفات موجود ہیں جو ملک اور قوم کی خدمت کرنے کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔

وہ سخت ایماندار اور بہت قابل شخص ہیں اور ان میں یہ جرأت ہے کہ اپنے اصول اور یقین پر جمے رہیں۔ اسی کے ساتھ اپنے سے کمتر قابلیت کے ہموطنوں کے لئے وہ رشک و حسد کا مرکز بھی بنے ہوئے ہیں اور یہی وہ اعلیٰ صفات ہیں جنکے بل پر وہ یقیناً بہت اونچے جائیں گے۔"

سعد زغلول پاشا کی سرگرمیوں کا میدان اصل میں دوسرا تھا۔ عوام میں قومی تحریکوں کی تبلیغ کا کام دوسروں پر چھوڑ کر انھوں نے حکومت کے طبقے میں قوم پرست نقطۂ نظر کی حمایت اپنے ذمے لے لی تھی اور اس خوبی سے وہ اپنا یہ فرض ادا کرتے رہے کہ حکومت اور قوم پرست دونوں نے انکی قابلیت کا لوہا مان لیا۔

سنہ ۱۹۱۰ء میں بتروس پاشا کے قتل کے بعد خدیو حلمی نے محمد سعید پاشا کو قلمدانِ وزارت سپرد کیا۔ یہ پاشا اگرچہ قوم پرستوں سے ہمدردی نہیں رکھتا تھا لیکن خدیو کے وفاداروں میں تھا۔ اس نے اپنی کابینہ میں سعد زغلول کو وزیر انصاف بنا دیا۔ سعد زغلول پاشا اب بہت نمایاں ہو چکے تھے، اور خود قوم پرست بھی سعد زغلول کو اپنا لیڈر اور رہنما سمجھنے لگے تھے۔ وہ اگرچہ حکومت کی ملازمت میں تھے۔ لیکن قومی تحریکوں میں علانیہ حصّہ لیا کرتے تھے، اور حکومت کے آگے قوم پرستوں کا نظریہ پیش کرتے ہوئے ذرا نہ جھجکتے تھے۔

سنہ ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے ترکی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ اس واقعہ سے فائدہ اٹھا کر مصر کے قوم پرستوں نے مصر پر انگریزوں کے اقتدار کے خلاف پھر ایجی ٹیشن شروع کر دیا۔ اس وقت مصر کا ریزیڈنٹ لارڈ کچنر تھا اس نے بڑی سختی سے قوم پرستوں کو دبایا، اور سلطان کو نہ صرف مصر کی فوجیں طرابلس نہ بھیجنے دیں بلکہ خود ترکوں کو بھی مصر کے راستے طرابلس میں نہ جانے دیا۔

لارڈ کچنر کی اس حرکت سے قوم پرست بے قابو ہو گئے۔ جگہ جگہ حکومت برطانیہ اور حکومت مصر کے خلاف مظاہرے ہوئے۔ سعد زغلول پاشا اگرچہ مصری حکومت کے وزیر انصاف تھے۔ لیکن اس کمزوری کا سارا الزام انھوں نے علانیہ

خدیو مصر عباس حلمی پر لگایا جس سے حکومت کے حلقوں میں بڑی بے چینی پھیل گئی ۔ اس کے ساتھ لارڈ کچنر، خدیو مصر اور وزیر اعظم کے خلاف ایک سازش بھی پکڑی گئی ۔ شورش کی اس رفتار سے لارڈ کچنر بدحواس ہو گیا۔ اس نے قوم پرستوں کو دبانے کے لئے انتہائی تشدد سے کام لینا شروع کر دیا۔ اور سعد زغلول پاشا کو بھی جو اب قوم پرستوں کے مسلمہ لیڈر تھے استعفےٰ دینے پر مجبور کر دیا۔ سعد زغلول پاشا نے بلا تامل استعفےٰ دیدیا اور علانیہ حزب الوطن کی قیادت کرنے لگے ۔ حزب الوطن کے لیڈر کی حیثیت سے اسی سال یعنی ۱۹۱۲ء میں سعد زغلول اسمبلی میں گئے، اور اسی سال اسمبلی نے سعد زغلول کو ان کے قوم پرستانہ خدمات کے صلے میں اپنی طرف سے اسمبلی کا وائس پریزیڈنٹ منتخب کر لیا۔

مصر کی مرکزی اسمبلی کی قوت صرف ۶۶ ممبروں پر مشتمل تھی جس میں ۱۷ ممبر حکومت مصر کے نامزد شدہ اور باقی منتخب شدہ تھے ان نامزد شدہ ممبروں کے علاوہ اسمبلی حکومت کا ایک پریزیڈنٹ اور وائس پریزیڈنٹ بھی منتخب کیا کرتی تھی، اور دوسرا وائس پریزیڈنٹ منتخب کرنے کا حق اس نے منتخب شدہ ممبران کو دیدیا تھا۔ چنانچہ سعد زغلول پاشا کو انہی منتخب شدہ ممبران اسمبلی نے اپنی طرف سے وائس پریزیڈنٹ چنا تھا۔ اس اسمبلی کی حیثیت اگرچہ ایک مشاورتی مجلس سے زیادہ نہیں تھی اور حکومت کرتی وہی تھی جو اس کا دل چاہتا تھا، لیکن دستوری حیثیت سے اس مجلس کو یہ اختیار تھا کہ وہ جس قانون کو چاہے نامنظور کر دے۔

سعد زغلول پاشا نے اسمبلی میں اپنے اس حق سے بے تکلف کام لیا۔ خاص کر ایسے قوانین کی شدید مخالفت کی جو حکومت برطانیہ کے اشارہ سے

اسمبلی میں پیش ہوئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت برطانیہ اور خدیو مصر دونوں اس اسمبلی سے بیزار ہو گئے۔ لیکن اس سے پیچھا چھڑانے کی بھی کوئی صورت نہیں تھی اس لئے بظاہر مجبور نظر آتے تھے، کچھ دنوں بعد خدیو اور وزیر اعظم سعید پاشا میں اختلاف پیدا ہو گیا اور محمد سعید پاشا کو وزارت سے مستعفی ہونا پڑا۔ ان کی جگہ حسین رشدی پاشا مصر کے وزیر اعظم ہوئے جو جنگ عظیم کے اختتام تک یعنی ۱۹۱۸ء تک وزیر اعظم مصر رہے۔

۱۹۱۴ء میں جب جنگ عظیم شروع ہوئی تو مصر کی پوزیشن بہت نازک ہو گئی۔ مصر اس وقت تک برائے نام ترکی سلطنت میں شامل تھا اور سلطان ترکی کا رجحان جرمنی کی طرف تھا۔ لیکن فوجی قبضہ مصر پر برطانیہ کا تھا۔ اور برطانیہ مصر کو ترکی سے بالکل علٰحدہ کر لینا چاہتا تھا۔ قوم پرستوں نے برطانیہ کی اس پالیسی کی شدید مخالفت کی۔ سعد زغلول نے جگہ جگہ دورہ کر کے اس پالیسی کے خلاف شدید مظاہرے بھی کرائے۔ لیکن کچھ حاصل نہ ہوا۔

لارڈ کچنر جنگ عظیم کے شروع ہونے کے بعد کچھ دنوں کی چھٹی پر لندن چلا گیا، وہاں وہ وزیر جنگ بنا دیا گیا، اور خدیو حلمی پاشا قسطنطنیہ پہونچے تاکہ سلطان ترکی سے جنگ عظیم میں مصر کی صحیح پوزیشن کے متعلق گفتگو کریں۔ یہ عزم برطانوی مفاد کے خلاف تھا اس لئے حکومت برطانیہ نے عباس حلمی کے قسطنطنیہ جاتے ہی اس عذر کی بناء پر کہ خدیو دشمنوں سے مل گیا ہے۔ اس کی معزولی کا اعلان کر دیا۔ اور اس کی جگہ اس کے چچا حسین کامل کو تخت نشین کر دیا۔ اس اعلان کے ساتھ برطانیہ نے مصر کو قابو میں رکھنے کی دو تدبیریں اور کیں۔ ایک یہ کہ مصر کی مرکزی اسمبلی کو غیر معین مدت کے لئے معطل کر دیا۔ دوسرا یہ کہ مصر کا ترکی کے ساتھ برائے نام رشتہ بھی منقطع کر دیا۔ ترکی کا رشتہ توڑتے ہوئے

برطانیہ نے حسب ذیل اعلان کیا تھا:۔

"ترکی کے جنگ میں حصہ لینے کے باعث مصر کو حکومت برطانیہ کی "حفاظت" میں لے لیا گیا ہے اور اس اعلان کے بعد سے مصر حکومت برطانیہ کا محفوظ سمجھا جائیگا۔ اس طرح ترکی کو مصر پر جو حاکمانہ حقوق تھے وہ ختم کر دیئے گئے۔ آئندہ سے حکومت مصر کی مدافعت اور مصریوں کے مفاد کے لئے جو تدبیر مناسب ہوگی وہ کی جائے گی۔"

اس اعلان کے ساتھ ہی "خدیو" کا ترکی خطاب ترک کر دیا گیا، اور حسین کامل پاشا کو سلطان مصر کے خطاب کے ساتھ تخت نشین کیا گیا برطانیہ کی طرف سے سر ہنری میک ماہن ہائی کمشنر مقرر ہوا جو عملاً سارے مصر پر حکمراں تھا۔ برطانیہ کی اس پالیسی کا قوم پرستوں پر بہت برا اثر پڑا خصوصاً اس لئے کہ اسمبلی کو معطل کر دینے کے بعد آئینی طور پر اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کا قوم پرستوں کے لئے کوئی موقع نہیں رہا تھا۔

سعد زغلول پاشا اس زمانہ میں اپنی پارٹی کو مضبوط بنانے کی کوششوں میں مصروف رہے۔ مصر کے عرض وطول میں انھوں نے دورے کئے، اور عوام کے آگے مصر کی صحیح سیاسی صورت حال رکھکر ان میں بیداری پیدا کی۔ سعد زغلول کی آواز پر زیادہ تر مصری نوجوانوں اور طالب علموں نے لبیک کہا اور ایسے مصری ملازمین کی ہمدردیاں بھی قوم پرستوں کو حاصل ہوگئیں جو برطانوی افسروں کے مصری محکموں میں دخیل ہو جانے کے باعث ترقیوں سے محروم ہوگئے تھے بلکہ یہ بے اطمینانی ملازم پیشہ طبقے میں اسقدر بڑھی کہ ان میں سے بعض نے حسین کامل کی جان پر بھی دو مرتبہ حملہ کیا۔

۱۹۱۷ء میں حسین کامل پاشا سخت بیمار ہوئے۔ حکومت برطانیہ کو ان کے جانشین کی فکر ہوئی، پرنس کمال الدین جو حسین کامل کے لڑکے تھے انھوں نے ولیعہدی قبول کرنے سے انکار کردیا، اس لئے حکومت برطانیہ نے حسین کامل کی جگہ پرنس فواد کو جو خدیو اسمعیل کے چھوٹے لڑکے تھے نامزد کیا اور وہی اکتوبر ۱۹۱۷ء میں حسین کامل کے انتقال کے بعد شاہ فواد کے نام سے مصر کے تخت پر متمکن ہوئے۔

۱۹۱۸ء میں جنگ عظیم کا خاتمہ ہوگیا۔ پیرس میں صلح کانفرنس قائم ہوئی جس کے صدر پریزیڈنٹ ولسن تھے۔ پریزیڈنٹ ولسن نے اس کانفرنس میں دائمی امن و صلح کے چودہ نکات پیش کئے تھے، ان میں سے ایک نکتہ یہ تھا کہ:۔

"ہر قوم کو خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی اپنے جغرافیائی حدود کے اندر آزاد رہنے اور اپنی آزاد حکومت قائم کرنیکا حق تسلیم کرلیا جائے"۔

سعد زغلول نے اسی نکتہ کو بنیاد قرار دیکر قوم پرست جماعت کی طرف سے باقاعدہ مصر کی آزادی کا برطانوی ریزیڈنٹ مقیم قاہرہ سے مطالبہ کردیا۔ اور حکومت مصر سے یہ درخواست کی کہ قوم پرستوں کے اس مطالبے کو منوانے کیلئے سعد زغلول اور ان کے چند ساتھیوں کے ایک "وفد" کو لندن جانیکی اجازت دیجائے۔

"آزادی کامل" کے مطالبہ کیلئے سعد زغلول کی دلیل یہ تھی کہ اگر عرب، شام اور عراق کو آزادی مل سکتی ہے تو مصر کو جو آئینی حیثیت سے ان تینوں ممالک سے بہت زیادہ ترقی یافتہ ملک ہے، سب سے پہلے آزادی ملنی چاہیئے اور غیر ملکی مداخلت کے بغیر اسے خود اپنے ملک کا انتظام کرنے کا حق ملنا چاہیئے۔ اس کے جواب میں برطانوی ریزیڈنٹ نے یہ جتایا کہ مصر میں "قبطیوں" کی ایک اقلیت بھی ہے جس کی حفاظت برطانیہ کا فرض ہے۔ اگر قبطی بھی مسلمانوں کے اس مطالبہ سے

متفق ہو گئے تو برطانیہ اس مطالبہ پر غور کر سکتی ہے۔ برطانیہ کی یہ پرانی چال تھی۔ لیکن سعد زغلول نے یہ چال بھی کامیاب نہ ہونے دی۔ انھوں نے حزب الوطن کی طرف سے قبطیوں کے ذمہ دار افراد کو دعوت دی کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ سیاسی اشتراک عمل کے لئے اپنے مطالبات پیش کریں۔ قبطی چونکہ برطانیہ کی شہ پا کر اپنے مطالبات میں بلند آہنگی سے کام لے رہے تھے، اس لئے حکومت برطانیہ کو یہ خیال ہوا کہ قبطیوں اور مصریوں کا آپس میں سمجھوتہ ہو سکے گا۔ لیکن سعد زغلول کے تدبر نے اس خیال کو بھی غلط ثابت کر دکھایا، انھوں نے قبطیوں کو اس سے زیادہ سیاسی مراعات دیدیئے جن کا انھوں نے مطالبہ کیا تھا۔ اور مصریوں نے بالاتفاق سعد زغلول کے فیصلے کو تسلیم کر لیا۔ سعد زغلول کی یہ اس قدر زبردست سیاسی فتح تھی جس کا برطانیہ کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود قوم پرست کمیٹی نے اپنا مطالبہ پیش کرنے کے لئے جب پیرس اور لندن اپنا وفد بھیجنے کی درخواست کی تو حکومت برطانیہ نے اس درخواست کو مسترد کر دیا۔

آزادی مصر کا مطالبہ اب مصر کی ہر جماعت کا متفقہ مطالبہ تھا جیسے ہی برطانیہ نے مصری وفد کو پیرس صلح کانفرنس جانیکی اجازت نہیں دی، اور پیرس میں صلح کانفرنس شروع ہوگئی تو حکومت مصر کے سارے وزیروں نے برطانیہ کے اس غیر معقول رویہ کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے استعفے دیدیئے اور سب سے آخر میں وزیر اعظم مصر حسین رشدی پاشا بھی اپنے عہدے سے مستعفی ہو گئے۔

وزراء مصر کے استعفوں سے صورت حال بہت نازک ہو گئی اور وفدیوں کی سرگرمیاں اسقدر بڑھ گئیں کہ حکومت برطانیہ کو انھیں دبانے کے لئے ملک میں مارشل لا نافذ کرنا پڑا۔ جب اس کا بھی کوئی اثر نہ ہوا تو برطانیہ نے سعد زغلول

اوران کے تین سرگرم ساتھیوں کو جن میں نحاس پاشا بھی تھے ۸۔ مارچ ۱۹۱۹ء
کو بغاوت پھیلانے کا الزام لگا کر گرفتار کر لیا۔ اوران چاروں کو مالٹا لیجا کر
نظر بند کر دیا۔

سعد زغلول اوران کے ساتھیوں کو گرفتار کرنا ہی تھا کہ سارے ملک
میں ایک آگ سی لگ گئی۔ جگہ جگہ برطانیہ کے سول اور فوجی افسروں پر
قاتلانہ حملے ہوئے۔ مکان اور دوکانیں لوٹ لی گئیں۔ ریلوے لائنیں اکھیڑ دی
گئیں تار کاٹ دیئے گئے۔ مصری پولیس اور باقاعدہ فوج نے اکثر جگہ مجمع
پر گولیاں چلانے سے انکار کر دیا۔ سوڈان سے برطانوی فوج بلائی گئی۔
اسکندریہ کے برطانوی کالم شورشی مقامات پر بھیجے گئے اوراس فساد کو دبانے
کی جو امکانی کوشش برطانیہ سے ہوسکتی تھی وہ کی گئی۔ لیکن فساد نہ دبنا تھا نہ
دبا۔ مصریوں کا پہلا مطالبہ یہی تھا کہ سعد زغلول اوران کے ساتھیوں کو
رہا کرو اوراس مطالبہ میں قبطی اور مصری دونوں برابر کے شریک تھے۔

جب برطانیہ نے دیکھا کہ فساد کسی طرح نہیں مٹتا تو مجبوراً اپنی پالیسی میں تبدیلی
کی، لارڈ النبی جو زمانہ جنگ میں برطانیہ کی مشرقی فوجوں کے کمانڈر انچیف تھے
اور مصریوں کو اچھی طرح جانتے تھے مصر کے غیر معمولی ہائی کمشنر بنائے گئے
اور انھیں فوراً مصر بھیجا گیا کہ وہ صورت حال پر قابو حاصل کریں اور ساتھ ہی یہ
اعلان کیا گیا کہ لارڈ ملنر کی صدارت میں حکومت برطانیہ ایک کمیشن مصر بھیجے گی۔
تاکہ وہاں کے حالات کا بغور مطالعہ کرکے یہ سفارش کرے کہ مصر کو ایک محفوظ کی
حیثیت سے زیادہ سے زیادہ کس قسم کی اصلاحات دی جا سکتی ہیں۔

لارڈ النبی جیسے ہی مصر پہونچے انھوں نے قوم پرستوں کی طرف صلح
کا ہاتھ بڑھا دیا۔ اپریل ۱۹۱۹ء میں سعد زغلول اوران کے ساتھیوں کو مالٹا سے

رہا کر دیا اور انھیں اجازت دیدی کہ وہ پیرس جاکر اپنے مطالبات صلح کانفرنس میں پیش کریں ۔ سعد زغلول، نحاس پاشا اور ان کے دونوں ساتھی مالٹا سے فوراً پیرس روانہ ہو گئے اور وہاں انھوں نے صلح کانفرنس میں اپنے مطالبات پیش کئے۔ لیکن کامیابی انھیں نہیں ہوئی۔ مصر میں بے چینی بدستور باقی تھی۔ سعد زغلول کے حمائتیوں نے پھر قوم پرستوں کو ایک مرکز پر جمع کر دیا اور برطانیہ سے یہ مطالبہ کیا کہ اس نے اپنے اعلان میں مصر کا ذکر ایک محفوظہ کے نام سے کیا ہے اسے واپس لے۔ اب کے سعد زغلول اور اسکی پارٹی کو اپنے اس مطالبہ میں ایسی زبردست کامیابی ہوئی کہ وہ لوگ بھی جو اعتدال پسند کہے جاتے تھے، ان کے شریک ہو گئے اور قاہرہ کی مشہور یونیورسٹی الازہر کے صدر نے بھی سعد زغلول پارٹی کے اس مطالبہ کی حمایت کی صورت حال نازک ہونے لگی۔ حکومت برطانیہ نے جلدی سے "ملز کمیشن" مصر بھیجا جو دسمبر ۱۹۱۹ء میں مصر پہونچا۔ لیکن مصریوں نے اس کمیشن کا بائیکاٹ کر دیا۔ اور ایسا مخالفانہ رویہ اختیار کیا کہ حکومت کو اس کمیشن کے ممبروں کی جان کی حفاظت کیلئے خاص انتظامات کرنے پڑے۔ اس کمیشن کے سامنے ہی جگہ جگہ فساد ہوئے۔ اور برطانوی سپاہیوں اور حکومت برطانیہ کے طرفدار وزیروں کی جان پر حملے کئے گئے۔ کمیشن بدحواس ہو گیا۔ لیکن اس نے اپنا دفتری کام مارچ ۱۹۲۰ء کے آخر تک مکمل کر لیا اور رپورٹ کی تیاری کے لئے لندن روانہ ہو گیا۔ جسوقت لارڈ ملز کا کمیشن لندن پہنچا لارڈ البنی اور مصر کے اعتدال پسند عدلی پاشا کی کوششوں سے یہ طے پایا کہ لارڈ ملز اور ان کے ساتھی سعد زغلول سے وفد سے بھی جو مصری اکثریت کی نمائندگی کرتا ہے گفتگو کریں اور مصر کے آئندہ دستور کے لئے ایک بنیاد تجویز کریں۔ چنانچہ سعد زغلول اور ان کے ساتھی جو اسوقت تک پیرس میں تھے

لندن پہونچے، اور سعد زغلول اور لارڈ ملز میں مصر کے آئندہ سیاسی مرتبہ کے متعلق گفتگو شروع ہوگئی۔

دو مہینے کی لگاتار گفت وشنید کے بعد اگست ۱۹۲۰ء میں لارڈ ملز اور سعد زغلول کے درمیان یہ طے پایا کہ مصر کو کامل آزادی دیدی جائے۔ اور اسکے جواب میں مصر برطانیہ سے تعلقات رکھنے کے متعلق چند ذمہ داریاں قبول کرلے اس گفتگو میں سعد زغلول نے سوڈان کے سوال کو بالکل علیحدہ رکھا۔ اس لئے کہ سوڈان اگرچہ مصر ہی کا ایک صوبہ تھا لیکن بالکل دیوالیہ اور حالات بھی وہاں ایسے نہیں تھے کہ مصر اس کا دعویٰ کرکے اپنے اوپر مزید ذمہ داریاں لیتا۔

"زغلول ملز" سمجھوتے سے آئندہ دستور کے متعلق گفت وشنید کی بنیاد طے ہوچکی تھی۔ مصر کے قوم پرستوں کو اس کی اطلاع دی گئی۔ اور مصر نے بھی اس سمجھوتہ کا خیر مقدم کیا۔ سعد زغلول اور ان کے ساتھی بظاہر کامیاب مصر پہونچے اور عوام نے ان کا بڑا پرجوش خیر مقدم کیا۔ لیکن اس کے فوراً ہی بعد حالات پھر بدلے۔ لارڈ ملز کی کمیشن نے اپنی رپورٹ حکومت برطانیہ کے آگے پیش کردی۔ لیکن حکومت برطانیہ جو اس وقت تک مصر کے اعتدال پسندوں سے جس کے لیڈر عدلی پاشا تھے ایک خفیہ سمجھوتا کرچکی تھی، لارڈ ملز کی سفارشات کو تسلیم نہیں کیا۔ جس کے باعث لارڈ ملز کمیشن کی صدارت سے مستعفی ہو گئے۔

ان کے مستعفی ہوتے ہی سعد زغلول اور لارڈ ملز کا سمجھوتہ کالعدم ہوگیا۔ اور حکومت برطانیہ سعد زغلول کو چھوڑکر عدلی پاشا کی وساطت سے مصر پر قابو حاصل کرنیکی کوشش کرنے لگی۔ چنانچہ شروع ۱۹۲۱ء میں حکومت برطانیہ نے سلطان مصر کو لکھا:-

حکومت برطانیہ لارڈ ملز کی رپورٹ پر غور کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچی

کہ مصر کے لئے محفوظہ کا درجہ برطانیہ اور مصر کے آیندہ تعلقات کو برقرار رکھنے
کیلئے موزوں نہیں ہو سکتا۔ لیکن چونکہ حکومت برطانیہ ابھی تک لارڈ ملز
کی سفارشات کے متعلق ایک قطعی رائے قائم نہیں کر سکی ہے۔ اس لئے
یور ہائی نس سے خواہش کی جاتی ہے کہ حکومت برطانیہ سے ان سفارشوں
کے معاملے میں گفت وشنید کرنے کیلئے ایک وفد نامزد کریں تاکہ کوئی ایسا
نتیجہ برآمد ہو سکے جس سے برطانیہ کا اہم ترین مفاد بھی محفوظ رہے۔
اور مصریوں کی سیاسی توقعات بھی پوری ہو سکیں"۔

حکومت برطانیہ کے اس اعلان کے بعد عدلی پاشا نے کابینہ وزارت بنائی
اور اپنے پروگرام میں قوم پرست جماعت سے اشتراک عمل کی بھی گنجائش رکھی لیکن
سعد زغلول عدلی پاشا سے سمجھوتہ کرنے پر تیار نہ ہوئے انھیں اصرار تھا کہ
مصر اور برطانیہ کی گفت وشنید کی بنیاد وہی سمجھوتہ ہو سکتا ہے جو لندن میں
زغلول اور ملز کے درمیان ہوا تھا۔

ملک میں پھر بے چینی پیدا ہوئی، انگریزوں کے خلاف پھر ایجی ٹیشن شروع
ہوا سول اور فوجی افسروں پر قاتلانہ حملے ہونے لگے۔ عدلی پاشا کی حکومت
بے بس نظر آنے لگی۔

عدلی پاشا نے قلمدان وزارت سنبھالتے ہوئے کہا تھا کہ مصر جلد سے جلد
محفوظہ کے درجہ سے نکل آئیگا۔ اور اس کی اپنی ایک سیاسی انفرادیت قائم ہو جائیگی
عدلی پاشا کو برطانیہ پر پورا اعتماد تھا کہ کم سے کم یہ وعدہ پورا کرنے میں حکومت برطانیہ
ان کی مدد ضرور کریگی۔ چنانچہ اس خیال کے ماتحت کہ اگر یہ وعدہ پورا ہو گیا تو
مصر میں قوم پرستوں کی سرگرمیاں ٹھنڈی پڑ جائینگی۔ وہ اپنی وزارت کے
چھ مہینے بعد جولائی سنہ ۱۹۲۱ء میں فوراً لندن پہونچے اور حکومت برطانیہ سے مصر

کے سیاسی مرتبہ کے متعلق گفتگو شروع کر دی۔ لیکن عدلی پاشا کی ساری توقعات پر پانی پھر گیا۔ اس لئے کہ حکومت برطانیہ نے مصر پر فوجی قبضہ کے مسئلے پر ایسا غیر مصالحانہ انداز اختیار کر لیا کہ عدلی پاشا اور ان کے ساتھی اعتدال پسند ہونے کے باوجود اس سے اتفاق نہ کر سکے۔ اور گفتگو کا رشتہ درمیان ہی سے ٹوٹ گیا۔

عدلی پاشا اور ان کے ساتھی برطانیہ سے یہ وعدہ لینا چاہتے تھے کہ "جیسے ہی مصر کے حالات درست ہوئے۔ حکومت برطانیہ اپنی فوجیں سوئز کنال کے علاقہ میں منتقل کر دیگی" لیکن حکومت برطانیہ نے یہ شرط تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ عدلی پاشا نے اس پر یہ تجویز پیش کی کہ اگر برطانیہ کو مستقلاً مصر میں اپنی فوج رکھنے پر اصرار ہے تو کم سے کم ایک علاقہ اس کیلئے مختص کر دے، اور یہ ضمانت کرے کہ حکومت برطانیہ مصر کے اندرونی معاملات میں بالکل مداخلت نہ کرے گی۔ لیکن حکومت برطانیہ نے اس انتہائی کمزور تجویز کو بھی نہ مانا۔ اس کے بعد عدلی پاشا کیلئے کوئی چارہ کار نہ رہا۔ چنانچہ وہ لندن سے ناکام مصر واپس لوٹے اور آتے ہی اپنی خدمت سے مستعفی ہو گئے۔

عدلی پاشا کے استعفٰی کے بعد مصر میں عجیب صورت حال پیدا ہوئی۔ سلطان مصر کو کسی سیاسی جماعت سے کوئی ذمہ دار شخص ہی نہ ملا جو وزیر اعظم کے عہدہ کی ذمہ داری قبول کر سکے، یہ سعد زغلول کے اثرات کا نتیجہ تھا۔ حکومت برطانیہ نے جب یہ حال دیکھا تو سعد زغلول اور ان کے چند سرگرم ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ قاہرہ سے اپنے دیہاتی علاقوں میں چلے جائیں لیکن سعد زغلول نے یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا، اس نوبت پر مصر میں پھر حالات بگڑے، عوام نے پھر تشدد آمیز رویہ اختیار کر لیا اور دو برطانوی سپاہیوں کو گولی کا نشانہ بنا دیا۔
حکومت برطانیہ نے سعد زغلول اور ان کے ساتھیوں کو فوراً گرفتار کر لیا

اور عدن لے جا کر ان سب کو نظر بند کر دیا۔ لیکن ان گرفتاریوں سے بھی مصر کی بے چینی دور نہیں ہوئی بلکہ برابر بڑھتی ہی رہی۔

لارڈ ایلنبی ہائی کمشنر مصر ان بار بار کی شورشوں سے گھبرا گیا اور فروری ۱۹۲۲ء میں چند تجاویز لیکر جن میں مصر کو آزاد سلطنت تسلیم کر لینے کی سفارش تھی لندن گیا۔ اس عزم کے ساتھ کہ اگر حکومت برطانیہ نے اس کی سفارش نہ مانی تو وہ اپنے عہدے سے فوراً مستعفی ہو جائیگا۔ لیکن حکومت برطانیہ نے جو خود بھی قوم پرستوں کی سرگرمیوں سے تنگ آچکی تھی لارڈ ایلنبی کی ساری تجویزیں منظور کر لیں اور مارچ ۱۹۲۲ء میں لارڈ ایلنبی نے مصر واپس آکر اعلان کیا:۔

"حکومت برطانیہ اپنی خواہش دیرینہ کے مطابق حکومت مصر کو ایک آزاد سلطنت تسلیم کرتی ہے۔ لیکن چونکہ مصر سے سیاسی تعلقات قائم رکھنا حکومت برطانیہ کے لئے بہت ضروری ہے اس لئے ذیل کے اصول وضع کئے جاتے ہیں:۔

۱۔ مصر پر سے برطانوی انتداب ختم کیا جاتا ہے اور مصر کو ایک آزاد سلطنت تسلیم کیا جاتا ہے۔

۲۔ سلطان مصر جیسے ہی اپنی رعایا کی اور غیر ملکی جان و مال کی حفاظت کا قانون نافذ کریں گے مارشل لا جو اس وقت مصر میں جاری ہے۔ بند کر دیا جائیگا۔

۳۔ حسب ذیل امور بالکلیہ حکومت برطانیہ کے اختیار تمیزی پر ہونگے

ا۔ مصر میں برطانوی ذرائع رسل و رسائل۔

ب۔ بالواسطہ یا بلاواسطہ غیر ملکی حملوں سے مصر کی مدافعت

ج۔ مصر کے برطانوی ریزیڈنٹ اور مصر کی اقلیتوں کی حفاظت۔

د :- سوڈان

اس اعلان کے بعد سلطان مصر نے شاہ مصر کا لقب اختیار کیا اور ثروت پاشا نے وزارت بنائی ۔ "ڈیموکریٹک" اصولوں پر ملک کے لئے نئے دستور کی تدوین شروع ہوئی ۔ اکتوبر ۱۹۲۲ء میں مصر کے لئے یہ نیا دستور وضع ہوا اس دستور میں شاہ فواد کے لئے "شاہ مصر و سوڈان" کا لقب اختیار کیا گیا تھا۔ برطانیہ کو اس پر اعتراض ہوا، اور اسی کے ساتھ چند اور دفعات پر بھی برطانیہ نے اعتراض کیا ۔ مصری کابینہ اور حکومت برطانیہ میں اختلاف بڑھا اور نومبر ۱۹۲۲ء میں ثروت پاشا وزارت سے مستعفی ہو گئے ۔ ان کی جگہ توفیق پاشا نے دوسری مرتبہ کابینہ بنائی لیکن ملک کو ان پر اعتماد نہ تھا ۔ جگہ جگہ بے چینی پیدا ہوئی ۔ برطانوی رعایا پر حملے ہوئے اور صورت حال پھر بگڑتی ہوئی معلوم ہوئی ۔ مجبوراً توفیق بھی مستعفی ہو گئے ۔ ان کے بعد مارچ ۱۹۲۳ء میں یحییٰ ابراہیم پاشا نے کابینہ بنائی اور ۱۹ اپریل ۱۹۲۳ء کو مصر کے لئے جدید دستور کا اعلان کر دیا گیا ۔

جدید دستور کی رو سے مصر کو آئینی سلطنت فرض کیا گیا اور ملک کے نظم و نسق کی ذمہ داری دو ایوانوں پر ڈالی گئی ایک "سینٹ" دوسرا "ایوان نمائندگان" نمائندگان کی تعداد ۲۲۰ مقرر کی گئی اور پانچ برس کے لئے پرانے طریقہ انتخاب کے ذریعہ ان کا چناؤ قرار دیا گیا ۔ سینٹ کے ممبروں کی مدت دس برس رکھی گئی ۔ سینٹ کے کل ممبروں میں سے ⅖ کی نامزدگی کا اختیار شاہ مصر کو دیا گیا اور ⅗ ممبروں کے انتخاب کا ملک کو، اس نئے دستور کے نفاذ کے بعد مصر میں حالات کچھ بدلے اور وزیر اعظم یحییٰ ابراہیم پاشا رفتہ رفتہ ملک سے دہشت انگیزی کو دور کرنے میں کامیاب ہو گئے ۔

سعد زغلول اور ان کے کچھ ساتھی ۱۹۲۲ء میں عدن لیجا کر نظر بند کئے گئے بعد میں انھیں عدن سے جبل الطارق بھیج دیا گیا تھا۔ جس وقت مصر میں نیا دستور نافذ ہوا تو سعد زغلول پاشا جبل الطارق میں نظر بند تھے۔ نئے دستور کے بعد چونکہ مصر میں امن وامان ہو گیا تھا۔ اس لئے ملک سے مارشل لا اُٹھا لیا گیا اور سعد زغلول پاشا اور ان کے ساتھیوں کو بھی ۴۔ اپریل ۱۹۲۳ء کو جبل الطارق سے مصر جانے کی اجازت دیدی۔

قاہرہ میں سعد زغلول اور ان کے ساتھیوں کا شاہانہ استقبال ہوا۔ اور اس یادگار استقبال میں ہر طبقے کے مصریوں نے حصّہ لیا۔ اس لئے کہ مصر کا نیا دستور دراصل سعد زغلول پاشا ہی کی سرگرمیوں کا نتیجہ تھا۔

جنوری ۱۹۲۴ء میں نئے دستور کے مطابق ایوان نمایندگان کا انتخاب شروع ہوا۔ سعد زغلول پاشا کی پارٹی نے جس نے اپنا نام "وفد پارٹی" رکھ لیا تھا اس انتخاب میں سرگرمی سے حصّہ لیا اور ایوان نمائندگان کی ۲۲۰ نشستوں میں سے ۱۸۸ پر قبضہ کر لیا۔ اسی طرح سینٹ کے انتخاب میں بھی وفد پارٹی کو بڑی اکثریت سے کامیابی حاصل ہوئی۔

ایوان نمایندگان میں وفد پارٹی کی اس زبردست اکثریت کے بعد یحییٰ ابراہیم پاشا مستعفی ہو گئے اور وفد پارٹی کے لیڈر اور قوم پرستوں کے رہنما سعد زغلول پاشا نے وزیر اعظم کی حیثیت سے کابینہ بنائی۔ اسی زمانہ میں انگلستان میں مزدور پارٹی کی حکومت قائم ہوئی۔ اور مسٹر ریمزے میکڈانلڈ برسر اقتدار آئے۔ مصر کے قوم پرستوں کو یہ یقین ہو گیا کہ مزدور پارٹی کی حکومت سے سوڈان کا مسئلہ طے ہو جائے گا۔ لیکن ۲۵۔ جون ۱۹۲۴ء کو دارالامراء میں مصر کے متعلق برطانوی پالیسی کا اظہار کرتے ہوئے جب لارڈ پارمور نے

یہ اعلان کیا کہ :-

"حکومت برطانیہ سوڈان پر سے اپنا قبضہ اُٹھانے کا ارادہ نہیں رکھتی"

تو سعد زغلول پاشا نے اس اعلان پر بڑے زور کا احتجاج کیا اور حکومت برطانیہ کو لکھا کہ سوڈان مصر کا ایک صوبہ ہے۔ حکومت مصر اس سے ہرگز دست بردار ہونے کو تیار نہیں ہے۔ اس کے جواب میں مسٹر ریمزے میکڈانلڈ نے دارالعوام میں ایک مصالحتی تقریر کی جس میں سعد زغلول پاشا کو دعوت دی کہ وہ لندن آکر حکومت برطانیہ سے اس معاملہ میں گفت و شنید کرلیں، لیکن سعد زغلول پاشا نے ایسی گفت و شنید کے لئے سوڈان پر مصر کے حقوق کو تسلیم کرنے کی شرط لگا دی جسے حکومت برطانیہ نے منظور نہیں کیا اس پر سعد زغلول پاشا نے استعفےٰ دیدیا لیکن شاہ فواد نے ان کا استعفےٰ منظور نہیں کیا۔

گرمیوں کا موسم تھا۔ شاہ فواد اور ایوان نمائندگان کے دفاتر قاہرہ سے اسکندریہ آ گئے تھے۔ سعد زغلول بھی قاہرہ سے اسکندریہ روانہ ہونے والے ہی تھے کہ ایک پاگل نوجوان نے جسے کسی سیاسی جماعت سے کوئی تعلق نہ تھا ان پر پستول سے فائر کر دیا، سعد زغلول زخمی ہو گئے اور بحالی صحت کے لئے یورپ روانہ ہو گئے۔

سعد زغلول کے یورپ روانہ ہونے کے بعد سوڈان میں شورش ہو گئی قوم پرستوں نے اس شورش کو خوب ہوا دی۔ کئی جگہ فساد بھی ہوا۔ برطانیہ کو امن قائم کرنے میں بڑی دقت پیش آئی۔ اسی دَوران میں مسٹر ریمزے میکڈانلڈ کے کئی دعوت نامے یورپ میں سعد زغلول پاشا کو ملے کہ وہ لندن آکر مصری برطانوی تعلقات پر حکومت برطانیہ سے گفتگو کریں۔ آخر سعد زغلول

پاشا لندن پہونچے اور ۲۵-ستمبر سے ۳-اکتوبر ۱۹۲۴ء تک مسٹر ریمزے میکڈانلڈ سے گفتگو کرتے رہے. لیکن اس گفتگو کا نتیجہ کچھ نہ نکلا۔

سعد زغلول پاشا دو باتوں کی حکومت برطانیہ سے صفائی چاہتے تھے ایک یہ کہ سوڈان مصر کے حوالے کر دیا جائے اور اس کے لئے ان کی دلیل یہ تھی کہ سوڈان ہمیشہ سے مصر کا ایک صوبہ ہے اور مصر سے علیحدہ تاریخ میں کبھی اس کی کوئی نمایاں حیثیت نہیں رہی، اور حکومت برطانیہ کی دلیل یہ تھی کہ سوڈان پر لاکھوں برطانوی پونڈ اور ہزاروں برطانوی افراد قربان ہو چکے ہیں. اس لئے حکومت برطانیہ اس پر سے اپنا قبضہ نہیں اُٹھا سکتی۔

دوسرا مطالبہ سعد زغلول کا یہ تھا کہ حکومت برطانیہ مصری علاقہ سے اپنا فوجی قبضہ ہٹالے اور نہر سوئز کے علاقہ میں اپنی فوج رکھے، اور مصر کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہ کیا کرے لیکن حکومت برطانیہ کو یہ بھی منظور نہ ہوا۔ ان دو مطالبات کے علاوہ حکومت برطانیہ مصر کے سب مطالبہ ماننے کو تیار تھی، لیکن سعد زغلول ان بنیادی مطالبوں پر اُڑ گئے اور کسی طرح انھیں نظر انداز کرنے پر راضی نہ ہوئے. نتیجہ یہ ہوا کہ گفت و شنید ختم ہو گئی۔ سعد زغلول ناکام مصر لوٹے اور مصر واپس ہوتے ہی اُنھوں نے اسی اختلاف کو وجہ قرار دیکر اپنی خدمت سے استعفیٰ دیدیا. لیکن شاہ فواد کو اس دفعہ بھی سعد زغلول کا استعفےٰ منظور کرنیکی جرأت نہ ہوئی۔

اسی اثنا میں سوڈان میں چند ناگوار واقعات پیش آگئے. ایک سوڈانی فوجی دستے نے بغاوت کر دی، اور برطانیہ کے سوڈانی گورنر جنرل سَر لی اسٹاک کو دن دہاڑے گولی مار دی گئی. اس واقعہ کا حکومت برطانیہ نے بہت بُرا اثر لیا اور قاہرہ کے برطانوی ہائی کمشنر نے حکومت مصر کو الٹی میٹم دیدیا کہ۔

(۱) اس جرم کی غیر مشروط معافی مانگی جائے۔
(۲) شخصیتوں سے قطع نظر کرکے اس حادثہ کی سختی سے تحقیقات کی جائے۔ اور
جس قدر اشخاص مجرم ثابت ہوں انھیں سزا دی جائے۔
(۳) ہر قسم کے سیاسی مظاہروں کو بند کر دیا جائے۔
(۴) پانچ لاکھ پونڈ جرمانہ حکومت برطانیہ کو ادا کیا جائے۔
(۵) ۲۴ گھنٹے کے اندر سوڈان سے سارے مصری افسر اور سپاہی واپس
بلا لئے جائیں۔
(۶) "غزابیہ" کے علاقہ میں سوڈانی حکومت کو جسقدر زمین وہ مانگے دیدی جائے۔
(۷) برطانوی مفاد کے خلاف ساری سرگرمیاں یکلخت بند کر دی جائیں اگر
ان شرائط کی فوراً تکمیل نہ کی گئی تو حکومت برطانیہ مصر اور سوڈان میں اپنے مفاد
کی حفاظت کیلئے جو تدبیر مناسب سمجھے گی وہ اختیار کرےگی۔

سعد زغلول پاشا نے برطانیہ کے ان مطالبات میں سے ابتدائی چار مطالبے
تسلیم کر لئے لیکن باقی تین مطالبوں کو تسلیم کرنے سے قطعاً انکار کر دیا۔ اس پر بات
بڑھ گئی اور حکومت برطانیہ نے سوڈان کے برطانوی افسروں کو یہ ہدایت بھیجدی
کہ سوڈان سے سارے مصری افسر چن چن کر نکال دیئے جائیں۔ غزابیہ کے علاقہ کی
سرحد توڑ دی گئی۔ اور اسکندریہ کے برطانوی چنگی خانے پر برطانیہ نے قبضہ کر لیا۔
سرلی اسٹاک کے قتل کے سلسلے میں بھی برطانیہ نے چند مصریوں کو
گرفتار کر لیا لیکن انھیں فوراً حکومت مصر کے حوالے کر دیا۔ ان پے درپے واقعات
کے بعد جو مصر میں اندرونی انتظام میں صریح مداخلت کے مترادف تھے سعد زغلول
پاشا مستعفی ہو گئے اور ان کی جگہ سینیٹ کے صدر احمد پاشا نے کابینہ بنائی اور
برطانیہ سے گفت و شنید شروع کر دی اور ۱۹۲۴ء کے آخر تک اسکندریہ کا

جنگی خانہ برطانیہ سے واپس لے لیا۔ البتہ سوڈان مستقلاً ہاتھ سے دے بیٹھی۔ لیکن مصری کابینہ کی اس مصالحانہ پالیسی کے باوجود مصری اسمبلی میں مخالف عنصر کی آواز بہت اونچی تھی۔ اور اس سے اعتدال پسندوں کو بڑی دقت اور پریشانی اٹھانی پڑتی تھی۔ اس لئے حکومت برطانیہ کے اشارے پر پہلے تو مصری اسمبلی کو ملتوی کر دیا گیا اور بعد میں بالکل تحلیل کر دیا گیا۔

اسمبلی کے تحلیل کر دیئے جانے کے بعد نئے انتخابات میں حصہ لینے کے لیے شاہ فواد کے اشارے سے ایک نئی سیاسی پارٹی "اتحاد" کے نام سے بنائی گئی اور اس میں حکومت کے وزراء اور محل کے عہدہ دار شریک ہو گئے اس پارٹی کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ "وفد پارٹی" کی طاقت کو توڑا جائے اور آیندہ انتخابات میں سعد زغلول پاشا اور ان کے حمایتیوں کو اسمبلی میں اکثریت نہ حاصل ہونے دی جائے۔

اس دوران میں حکومت مصر سرلی اسٹاک کے قاتلوں کا سراغ لگانے میں بھی مصروف رہی اور شروع ۱۹۲۶ء میں اس نے سات مصریوں کو سرلی اسٹاک کے قتل اور اعانت قتل کے جرم میں سیاسی عدالت کے آگے پیش کر دیا۔ ان میں سے دو افراد وہ تھے جنھیں سعد زغلول کی وزارت میں عہدے دیئے گئے تھے۔ لیکن یہ دونوں مئی ۱۹۲۶ عیسوی میں عدالت سے بری کر دیئے گئے اس پر حکومت برطانیہ کی طرف سے سخت احتجاج کیا گیا اور حکومت مصر سے مطالبہ کیا گیا کہ مصر میں غیر ملکیوں کی جانوں کی حفاظت کی ضمانت کی جائے۔ مئی ۱۹۲۶ء ہی میں مصر کی جدید اسمبلی کا انتخاب شروع ہوا۔ اتحاد پارٹی کو اتنے دنوں میں اپنا پروپیگنڈا کرنے کا کافی موقع مل گیا تھا اور شاہ فواد اور وزراء کی حمایت بھی اس پارٹی کو حاصل تھی۔ لیکن اس کے باوجود جب انتخابات

ختم ہوئے تو اسمبلی کی ۲۲۰ نشستوں میں سے ۱۵۰ وفد پارٹی نے حاصل کیں۔ ۳۰ اعتدال پسندوں کے حصے میں آئیں، ۵ قوم پرستوں کو ملیں ۲۰ پر آزاد ممبروں نے قبضہ کیا اور صرف ۱۰ نشستوں پر اتحاد پارٹی قابض ہو سکی۔

وفد پارٹی کی یہ ایسی زبردست کامیابی تھی جس نے شاہ فواد اور برطانیہ دونوں کو بدحواس کر دیا۔ اور اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ سارا مصر سعد زغلول کے ساتھ ہے اور شاہ فواد کی پالیسی کو پسند نہیں کرتا۔ لیکن اس اکثریت کے باوجود سعد زغلول نے وزارت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ خالص وفد پارٹی کی حکومت کو برطانیہ اور شاہ فواد برداشت نہ کر سکیں گے اور اتحادی حکومت بنانے میں سعد زغلول کو کامیابی نہ ہوگی۔ سعد زغلول پاشا کے انکار کے بعد عدلی پاشا نے وزارت بنائی اور سعد زغلول ایوان نمائندگان کے صدر منتخب ہو گئے۔

نومبر ۱۹۲۶ء کے دوران میں مصری اسمبلی میں بہت سے اصلاحی مسودۂ قانون وفد پارٹی کی طرف سے پیش ہوئے جن میں غیر ملکیوں کی امتیازی عدالتوں کی تنسیخ کا قانون اور دیہات میں پنچایتوں کے قیام کا قانون قابل ذکر ہے۔

۱۹۲۷ء کے وسط تک عدلی پاشا وزیر اعظم رہے۔ انھوں نے کوشش بہت کی کہ ایک طرف وہ وفدیوں کو خوش رکھیں جن کی اسمبلی میں اکثریت تھی اور دوسری طرف برطانیہ اور شاہ فواد کو راضی رکھیں لیکن انکی یہ دورخی پالیسی بہت دنوں نہ چل سکی اور مجبور ہو کر انھیں استعفیٰ دینا پڑا۔ ان کے مستعفی ہونے کے بعد عبدالخالق پاشا ثروت وزیر اعظم بنائے گئے۔ اگرچہ وہ اعتدال پسند تھے لیکن کابینہ میں جو دستور رائج تھا وہ سو فیصدی وفدی تھا اور عبدالخالق پاشا اسے توڑ نہیں سکتے تھے۔ ابھی عبدالخالق پاشا

کو برسر اقتدار آئے ہوئے کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ مصر کے لئے مدافعتی فوج کی قوت بڑھانے کے مسئلہ پر حکومت مصر اور حکومت برطانیہ کا اختلاف ہوا۔ اور وفدیوں کی اکثریت نے اس اختلاف کو خوب ہوا دی لیکن یہ قضیہ زیادہ بڑھنے نہ پایا۔ حکومت برطانیہ نے شاہ فواد اور عبدالخالق پاشا کو لندن آنیکی دعوت دی تاکہ سارے اختلافی مسائل آپس میں گفت و شنید سے طے ہو سکیں۔ چنانچہ جولائی ۱۹۲۷ء میں شاہ فواد اور عبدالخالق پاشا لندن پہونچے اور سر آسٹن چیمبرلین وزیر خارجہ سے مصری مسائل پر گفتگو شروع ہو گئی۔ اب کہ ایسی گفتگو کے لئے فضا ساز گار تھی اس لئے کہ سعد زغلول یا ان کی پارٹی کا کوئی آدمی اس گفتگو میں شریک نہ تھا۔ لیکن یہ واقعہ تھا کہ اس گفتگو کے کامیاب اختتام میں سعد زغلول اور انکی پارٹی کا اثر ضرور کام کر رہا تھا، شاہ فواد اور عبدالخالق ایسی کوئی تجویز منظور نہیں کر سکتے تھے۔ جسے ان کی رائے میں وفدیوں کو تسلیم کرنے میں عذر ہو۔ غرض برطانوی وزیر خارجہ سے گفت و شنید کے بعد ایک معاہدہ کا مسودہ تیار ہو گیا۔ لیکن قبل اس کے کہ یہ معاہدہ مصر پہنچے سعد زغلول پاشا قوم پرستوں کے زبر دست رہنما اور مصری اور برطانوی حکومت کے آئینی حریف ۲۳۔ اگست ۱۹۲۷ء کو ۶۷ برس کی عمر میں اس دار فانی سے کوچ فرما گئے۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ط

مصر میں قومی تحریک کی ابتدا جیسا کہ ہم نے پچھلے اوراق میں بتایا ہے۔ عربی پاشا نے کی تھی اور عربی پاشا کی شکست کے بعد مصطفےٰ کامل پاشا قوم پرستوں کے لیڈر تسلیم کر لئے گئے۔ لیکن ان دونوں کی سیاسی

جد وجہد کا آغاز آئینی کے بجائے انقلابی تھا۔ عربی پاشا نے برطانیہ کا اسلحہ سے مقابلہ کیا اور شکست کھائی اور مصطفیٰ کامل پاشا نے برطانیہ پر فرانس کو ترجیح دیکر ان کی آپس میں رقابت پیدا کرنے کی کوشش کی اور ناکام رہے ان دونوں کے برخلاف سعد زغلول نے مصر کو مصریوں کیلئے مختص رکھا اور انہی ہتیاروں سے برطانیہ کا مقابلہ کیا جن ہتیاروں سے برطانیہ نے رفتہ رفتہ مصر کی آزادی پر قبضہ کیا تھا۔

عربی پاشا اور مصطفیٰ کامل کی سیاست میں عوام مصریوں کا کوئی حصہ نہ تھا لیکن سعد زغلول کی سیاست عوام اور صرف عوام کے مفاد پر رکھی گئی تھی۔ سعد زغلول ہی نے صحیح معنوں میں مصری عوام میں سیاسی بیداری پیدا کی اور انھیں اپنے حقیقی مطالبہ کا ہوش دلایا۔

حکومت برطانیہ کیلئے اسلحہ سے مقابلہ کرنا آسان تھا۔ اس لئے کہ برطانیہ مصر سے زیادہ مسلح قوت ہے۔ فرانس کو راضی کر لینا اس کے لئے مشکل نہ تھا اس لئے کہ برطانیہ کی طرح مراکش پر مدت سے ان کا دانت تھا، لیکن اس آئینی احتجاج کا مقابلہ کرنا بہت مشکل تھا جو اس کی مصری پالیسی کے خلاف مصر کے ہر طبقے کی طرف سے ہوتا رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سعد زغلول پاشا نے اپنے دو پیشرو قوم پرست لیڈروں سے زیادہ مصر کو فائدہ پہونچایا اور مصری سیاست کی ایسی شاہراہ مقرر کر گئے جس پر چل کر بغیر خون بہائے مصر کی مکمل آزادی حاصل کرنا ممکن ہو گیا۔

سعد زغلول پاشا کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے مصر کی آزادی کے مطالبہ میں مصر کی اقلیتوں کو بھی متفق کر لیا "لڑاؤ اور حکومت کرو" برطانیہ کا بہت پرانا اصول ہے۔ یہی اصول اس کے

مصر پر بھی استعمال کیا تھا۔ لیکن سعد زغلول کے تدبّر نے اس اصول کو مصر میں چلنے نہیں دیا۔ قوموں کی نفسیات کا یہ اہم نکتہ ہے کہ کسی ملک کی اقلیتوں کو ملک سے زیادہ اپنی انفرادیت کے تحفظ کی طمانیت سے دلچسپی ہوا کرتی ہے۔ سعد زغلول پاشا اس نکتے کو سمجھتے تھے۔ اُنھوں نے قبل اس کے کہ مصر کی اقلیتیں برطانیہ کی سر پرستی پر اپنے اشتراک کی شرائط کو پیچیدہ کریں ان کے سارے قومی اور سیاسی مطالبے بلا کسی شرط کے جوں کے توں تسلیم کر لئے۔ اس مدبّرانہ طرزِ عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ آزادیٔ مصر کے خلاف کسی طبقے سے بھی آواز نہیں اُٹھی۔ اور یہ مصریوں کا "قومی مطالبہ" بن گیا۔

سعد زغلول کا دوسرا کارنامہ یہ تھا کہ اُنھوں نے مصری عوام میں اس درجہ ذہنی بیداری پیدا کر دی اور اپنی پارٹی کو اپنے سیاسی مسلّمات پر اس قدر مضبوطی سے متحد کر دیا کہ ان کے بعد بھی ان کے مقررہ اُصولوں سے ڈگمگا جانے کا امکان جاتا رہا۔ گویا سعد زغلول پاشا نے مصری سیاست کی ایک ایسی شاہراہ بنا دی جس پر چل کر مصر آسانی سے اپنی منزلِ مقصود پر پہونچ سکتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۲۷ء کا وہ معاہدہ جو حکومت برطانیہ نے شاہ فواد اور عبدالخالق پاشا سے کیا تھا سعد زغلول پاشا کے انتقال کے بعد مصر میں نافذ ہوا تو عوام مصریوں نے اس کی ایسی زبردست مخالفت کی کہ عبدالخالق پاشا کی وزارت کے لئے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ وہ فوراً مستعفی ہو جائے۔ اس معاہدہ کی دفعات یہ تھیں:۔

(۱) اگر مصر پر حملہ ہوگا تو برطانیہ مصر کی مدد کرے گا۔ اگر برطانیہ پر حملہ ہوگا تو مصر مدد کرے گا۔

(۲) مصر کسی قوت سے ایسا معاہدہ نہ کر سکے گا جو مصری برطانوی اتحاد کے خلاف ہو یا جس سے برطانوی مفاد کو نقصان پہونچے۔

(۳) مصری فوج کی تنظیم برطانوی اصول پہ ہو گی اور مصری فوج کا معلم کوئی ایسا شخص نہ ہوگا جو برطانوی رعایا نہ ہو۔

(۴) برطانوی رسل و رسائل کی شاہراہ کی حفاظت کیلئے حکومت برطانیہ مصر میں اپنی فوج رکھے گی اور اس کی تعداد بھی خود ہی مقرر کریگی۔

(۵) حکومت برطانیہ اپنے اثر کو استعمال کر کے مصر کو مجلس اقوام کا ممبر بنا دے گی۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ معاہدہ تھا جو شاہ فواد اور عبدالخالق پاشا حکومت برطانیہ سے لندن میں کر کے آئے تھے۔ جب نومبر ۱۹۲۷ء میں مصر میں اس کا نفاذ ہوا تو وفد پارٹی کے لیڈر سعد زغلول کے دست راست مصطفٰے پاشا نحاس تھے۔ انھوں نے اسمبلی میں اس معاہدے کے پرزے اڑا دیئے اور ساری اسمبلی نحاس پاشا کی ہمنوا ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عبدالخالق پاشا نے استعفٰے دیدیا، اور مصطفٰے نحاس پاشا نے اپنی وزارت بنالی اور اس معاہدہ پہ عمل کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

سعد زغلول پاشا کی تیسری خوبی یہ تھی کہ وہ بالکل بے غرض انسان تھے ان کے پیش نظر کبھی اپنی پارٹی کا اقتدار نہیں ہوا۔ بلکہ وطن کی آزادی ہمیشہ ان کا مطمح نظر رہا، اور اس کی خاطر وہ اکثر اعتدال پسندوں سے بھی اتحاد کر لیا کرتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۲۶ء میں جب مصری اسمبلی کا جدید انتخاب ہوا اور سعد زغلول پارٹی کو انتخاب میں زبردست اکثریت حاصل ہو گئی تو آئینی حیثیت سے سعد زغلول پاشا اپنی وزارت بنا سکتے تھے۔ لیکن انھوں نے خود وزارت بنانے سے اس لئے انکار کر دیا کہ ان کے وزیراعظم ہو جانے سے ملک کو اس قدر فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا جسقدر وہ دوسری وزارت پر نکتہ چینی کر کے مصر کو فائدہ پہنچا سکتے تھے۔ سعد زغلول پاشا کی اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اعتدال پسند

جنھیں سعد زغلول پاشا نے اپنی اکثریت کے باوجود وزارت بنالینے کی اجازت دیدی تھی ہمیشہ کیلئے وفد پارٹی کے حلیف بن گئے اور سعد زغلول کے انتقال کے بعد بھی اعتدال پسند پارٹی نے یہ عہد کیا کہ وہ ہمیشہ وفدیوں کے ساتھ رہیں گے اور انہی لائنوں پر چلیں گے جو ان کے رہنما سعد زغلول پاشا نے مصر کی آزادی کامل کے لئے متعین کردی تھیں۔

سعد زغلول پاشا نہایت حلیم الطبع اور درگذر کرنے والے انسان تھے۔ انھوں نے اپنے زمانہ اقتدار میں کبھی اپنے ذاتی مخالف کو نقصان نہیں پہونچایا اور نہ اپنے سیاسی حریف کو نیچا دکھانے کی کوشش کی۔ ۱۹۲۴ء میں جب وہ وزیراعظم تھے۔ ایک پاگل نوجوان نے ان پر پستول سے فائر کردیا تھا۔ جس سے وہ زخمی ہوگئے تھے۔ اس حملہ کو اگرچہ کوئی سیاسی اہمیت حاصل نہیں تھی۔ لیکن یہ ایسا اہم جرم تھا کہ حملہ آور عبرت انگیز سزا سے بچ نہیں سکتا تھا مگر سعد زغلول نے اسے معاف کردیا اور اسے سخت سزا سے بچالیا۔ سعد زغلول کی دلیل یہ تھی کہ دشمن کو انتقام سے نہیں بلکہ عفو سے زیر کرنا چاہیئے۔ یہ وہ حربہ ہے جو دشمنوں کو بھی دوست بنادیتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی سیاسی زندگی کے کارناموں سے یہ ثابت بھی کر دکھایا کہ ان کا اصول سچا تھا۔

غرض سعد زغلول پاشا کی یہی وہ خوبیاں تھیں جنھوں نے انھیں مصر کا سب سے بڑا قومی لیڈر بنادیا اور حقیقت یہ ہے کہ وہ تھے بھی۔ انھوں نے اپنی رہنمائی میں مصر کو اس نقطے تک پہونچادیا جہاں سے رجعت کا اندیشہ جاتا رہتا ہے اور یہ وہ احسان ہے جسے مصری کبھی نہیں بھلا سکتے۔
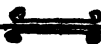
غازی محمد بن عبدالکریم الخطابی

ریف کا وہ منچلا مجاہد جو آزادی کے نشے میں اپنے مٹھی بھر اور نسبتاً غیر مسلح قبائل کے ساتھ اسپین جیسی جنگ جو قوت سے ٹکرا گیا اس کو مسلسل شکستیں دیں اور سرزمین مراکش میں جو مدت سے یورپی طاقتوں سے پامال ہوتی رہی ہے۔ زندگی کی ایک نئی ترنگ پیدا کر دی۔

اسپین کی ان پے در پے ذلتوں میں، مراکش میں اسپین کے "شریک جرم"، لیکن رقیب مقاصد فرانس کے لئے عبرت و بصیرت کا کافی سامان تھا اس لئے فرانس کی عافیت اسی میں تھی کہ وہ بھی اسپین کے ساتھ اس مرد مجاہد کے مقابل صف آرا ہو جائے۔

ان دو زبردست جنگی قوتوں کے اتحاد نے نتیجہ سے قطع نظر اس مرد مجاہد کی قدر و منزلت میں بلاشبہ چار چاند لگا دیئے ——————

اسپین اور فرانس کی متحدہ طاقتوں کیلئے یہ حقیقت یقیناً باعث صد افتخار ہے کہ ان دونوں نے مل کر بالآخر غازی ریف کو مفتوح کر لیا، لیکن اس کی رُوح کو پھر بھی یہ دونوں قوتیں نہ توڑ سکیں اور نہ اس کی زندگی کو مٹا سکیں

جو اس غازیٔ اعظم نے ریف میں پیدا کر دی تھی۔

محمد بن عبدالکریم ریف کے مشہور قبیلے "بنی اور یاغل" کے سردار ہیں ان کے والد "ملیلہ" کے بڑے تاجروں میں شمار ہوتے تھے۔ محمد بن عبدالکریم ملیلہ ہی میں پیدا ہوئے سنہ ولادت کی تحقیق نہ ہو سکی۔ قرینہ یہ ہے کہ ۱۸۸۲ء میں ان کی ولادت ہوئی۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے ملیلہ ہی میں پائی اعلیٰ تعلیم کی تکمیل انھوں نے اسپین کے پایۂ تخت میڈرڈ میں کی۔ ان کے والد ملیلہ کے اونچے طبقے سے تعلق رکھتے تھے اس لئے اسپینیوں سے ان کے تعلقات نہایت گہرے اور دوستانہ تھے۔ محمد بن عبدالکریم جب میڈرڈ سے مغربی علوم کی سند لیکر ملیلہ واپس آئے تو اپنی تعلقات کی بنا پر جو ان کے خاندان اور حکومت اسپین میں قائم ہو گئے تھے انھیں ملیلہ کے ایک مقامی دفتر میں ایک اچھی جگہ مل گئی۔ اور رفتہ رفتہ وہ جنرل سلوسٹر کے سکریٹری بن گئے۔ یہ زمانہ جنگ عظیم کا تھا۔

اسپین نے اگرچہ جنگ عظیم میں شرکت نہیں کی تھی لیکن اس کے اقتصادی اثرات سے اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکا تھا۔ اسی کے ساتھ اندرون ریف میں غیر ملکی قبضہ کے خلاف بے چینی بھی پیدا ہو گئی تھی، اور قبائل کی چھوٹی چھوٹی پارٹیوں نے اسپینی جنگی چوکیوں کو دق کرنا شروع کر دیا تھا۔ اسپین نے جبر و تشدد سے اس فضا کو دور کرنا چاہا تھا لیکن ریف میں بے چینی کم نہ ہوئی۔ محمد بن عبدالکریم کے واسطے سے حکومت اسپین ریفیوں کو دبانا چاہتی تھی اور محمد بن عبدالکریم یہ چاہتے تھے کہ اہل ریف اور اسپین میں باعزت سمجھوتہ ہو جائے اور اہل اسپین ریف اور مراکش والوں سے شریفانہ سلوک کریں، کیونکہ محمد بن عبدالکریم کی رائے میں اسپینیوں کا

غیر شریفانہ سلوک ہی سب سے زیادہ ریف میں بے چینی پیدا کرنے کا موجب ہو رہا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ محمد بن عبدالکریم ملیلہ کی شاہراہ سے گذر رہے تھے۔ اُنھوں نے دیکھا کہ راستے میں ایک اسپینی سارجنٹ ایک غریب ریفی کو بُری طرح پیٹ رہا ہے۔ محمد بن عبدالکریم نے جب اس سارجنٹ سے اس بیہودگی کی وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ اس ریفی کا گدھا چلنے میں اس سارجنٹ کو چھو گیا تھا۔ اس معمولی سی بات کو وجہ قرار دے کر اس اسپینی سارجنٹ نے ریفی کے ساتھ جو سلوک کیا تھا اسے عبدالکریم برداشت نہ کر سکے۔ اور اسپینی فوج کے کمانڈر انچیف جنرل سلورٹر سے اسکی شکایت کی اور جنرل کو سمجھانا چاہا کہ ایسا ہی وحشیانہ سلوک دراصل ریف میں بے چینی کا باعث ہو رہا ہے۔ لیکن جنرل نے اس شکایت پہ سنجیدگی سے غور کرنے کے بجائے محمد بن عبدالکریم کو یہ جواب دیا کہ:-

"اسپین کا ہر فرد اس جگہ حکمراں ہے۔ اس کی تعظیم اہل ریف اور مراکش پہ فرض ہے"

یہ متکبرانہ جواب سُن کر محمد بن عبدالکریم سنّاٹے میں آگئے اور اسی وقت اُنھوں نے اپنی خدمت سے استعفیٰ دیدیا۔ جب مستعفی ہو کر چلنے لگے تو ایک مرتبہ پھر جنرل سلورٹر سے ملے اور نہایت صاف لفظوں میں اسے متنبہ کیا:-

"جنرل! تمہارے اس جواب اور اسپینی سارجنٹ کے وحشیانہ سلوک کا تاوان حکومت اسپین کو ادا کرنا پڑے گا"

محمد بن عبدالکریم اپنی خدمت سے مستعفی ہو کر سیدھے اپنے قبیلے "بنی اوریاغل" میں پہونچے اور وہاں اُنھوں نے اسپین سے ایک فیصلہ کُن مقابلہ کی تیّاری شروع کر دی۔ یہ زمانہ ۱۹۲۱ء کا ہے۔

قبل اس کے کہ ہم اسپین کے خلاف محمد بن عبدالکریم کی جنگی سرگرمیوں کا ذکر کریں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ مراکش پر فرانس اور اسپین کی سیاست کا حال بھی اختصار کے ساتھ بیان کر دیں۔

مراکش کو اپنی جائے وقوعہ کے اعتبار سے کافی اہمیت حاصل ہے۔ سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں اسکے بعض بندرگاہوں پر پرتگال، اور اسپین کا قبضہ تھا۔ انیسویں صدی میں فرانس اور برطانیہ نے اس کو نشانہ بنایا۔ ۱۸۳۰ء میں فرانس نے "الجیریا" فتح کر لیا اور ۱۸۹۵ء تک اندرونِ مراکش میں بھی فرانس نے اپنا اثر پیدا کر لیا۔ ۱۸۸۰ء میں برطانیہ دخیل ہوا اور اسپین اور فرانس کے مقابلے میں اس کا اثر بڑھنے لگا۔ آخر ۱۹۰۰ء تک مراکش سے مصر تک کا علاقہ ان دونوں قوموں یعنی فرانس اور برطانیہ کے زیر اثر آ گیا۔ اس نوبت پر فرانس اور برطانیہ میں اس سارے مالِ غنیمت کی تقسیم ہوئی۔ مصر برطانیہ کے حصے میں آیا اور مراکش فرانس نے ہتیا لیا۔ یہ معاہدہ برطانیہ اور فرانس کے درمیان ۱۹۰۴ء میں ہوا۔ لیکن ۱۹۰۵ء میں مراکش پر جرمنی نے اپنے حق کا دعویٰ کر دیا۔ قیصر جرمنی مراکش کی سیاحت کو آیا اور سلطان مراکش کو فرانس اور اسپین سے بدظن کر گیا۔ یورپ میں مراکش پر جرمنی کے دعوے سے ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ برطانیہ فرانس کی مہربانی سے مصر ہضم کر چکا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ اس معاملہ میں فرانس کا ساتھ دے۔ اٹلی بھی جو اس مالِ غنیمت کی تقسیم میں بحر روم کی ایک طاقت ہونے کے باعث فرانس کو دبا کر طرابلس ہتیا چکا تھا۔ اس معاملہ میں جرمنی کی مداخلت کو ناپسند کرتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دول یورپ کی کانفرنس جب مراکش کے مسئلے کو حل کرنے بیٹھی تو جرمنی کو شکست ہوئی اور فرانس اور برطانیہ اور اٹلی کو اپنے اپنے مقبوضات میں مداخلتِ غیر کا

کا کھٹکا نہ رہا۔ لیکن فرانس کے ساتھ مراکش میں ایک سلطنت اور مساویانہ حصے کی دعویدار تھی اور وہ سلطنت اسپین تھی، برطانیہ اور فرانس کے حصے بخرے سے یہ سلطنت خوش تو نہیں تھی، لیکن جرمنوں کو چونکہ وہ مراکش میں قدم جمانے نہ دینا چاہتی تھی، اسلئے جب تک جرمن ہنگامہ فرو نہیں ہو گیا۔ یہ چپکی بیٹھی رہی اس کے بعد اس نے بھی فرانس سے اپنے حق کا مطالبہ کیا۔ اس دوران میں اسپین کئی مرتبہ ریف پر جنگی پیشقدمی بھی کر چکا تھا۔ لیکن ہر مرتبہ اس کو اندرون ریف میں شکست ہوئی اور صرف چند بندرگاہوں پہ قناعت کرنی پڑی۔

دول یوروپ کی کانفرنس رمارچ ۱۹۲۱ء میں جب یہ طے ہو گیا کہ طنجہ بین الاقوامی سیادت میں رہے گا اور سارا مراکش فرانس کی سیادت میں آجائے گا تو اسپین نے اس کو ماننے سے انکار کر دیا اور اندیشہ پیدا ہو گیا کہ کہیں اسپین اور فرانس میں نہ ٹھن جائے اس لئے برطانیہ نے بیچ بچاؤ کر کے ۳۰۔ نومبر ۱۹۱۲ء کو فرانس اور اسپین کے درمیان یہ معاہدہ کرا دیا کہ:۔

"طنجہ" کا پورا علاقہ بین الاقوامی رہے۔
طنجہ سے "ملیلہ" تک جس میں ریف بھی شامل ہے اسپین کے زیر اقتدار رہے
اور باقی مراکش پر فرانسیسی سیادت قائم رہے۔"

اس معاہدہ کے بعد ۱۹۱۳ء سے اسپین نے یہ کوشش شروع کر دی کہ ریف میں اسپین کی نوآبادی قائم کر دی جائے۔ لیکن اس کی یہ کوششیں کامیاب نہیں ہوئیں۔ شہر ملیلہ پر تو اس کا قبضہ ہو گیا اور بندرگاہوں پر بھی اس کا قبضہ رہا لیکن اس سے آگے کبھی اسپین کا اثر نہ بڑھ سکا۔

اسپین نے جب دیکھا کہ ریف کے اندرونی علاقہ پر اسکی سیادت

قائم نہ ہو سکی تو اس نے "لڑاؤ اور حکومت کرو" والا قدیم مغربی اصول اختیار کیا۔ ریف میں ایک اور رئیس قبیلہ امیر رسولی تھا جو قبیلہ اوریاغل کا حریف سمجھا جاتا تھا۔ اسپین نے اسے ابھارا اور اسے یقین دلا کر اس کی ریاست تسلیم کر لی جائے گی ریف کی متحدہ مخالفت میں ایک رخنہ ڈال دیا۔ لیکن ابھی حکومت اسپین ان تدبیروں ہی میں مصروف تھی کہ جنگ عظیم چھڑ گئی۔ اسپین کی توجہ ریف سے ہٹ کر خود اپنی سرحدوں کی طرف منعطف ہو گئی اور جنگ عظیم کے بعد جو اقتصادی بے چینی یوروپ میں پیدا ہوئی اس کا شکار باوجود جنگ عظیم میں شرکت نہ کرنے کے اسپین بھی ہو گیا۔ اور خود اسپین میں الفانسو کی حکومت کے خلاف سازش کا زبردست جال بچھ گیا۔

الفانسو کی حکومت نے اقتصادی بے چینی کو دور کرنے کی جہاں اور تدبیریں کی تھیں وہاں اس نے اپنے مقبوضات میں نئے نئے ٹیکس بھی عائد کر دیئے۔ ان ٹیکسوں سے ریفی بہت چراغ پا ہوئے، اس لئے کہ آج تک انھوں نے کسی حکومت کو کوئی ٹیکس نہیں دیا تھا۔ اس نئے بار کے خلاف انھوں نے احتجاج کیا لیکن جب اس احتجاج کا کوئی نتیجہ نہ نکلا بلکہ اسپین کی حکومت نے ریفیوں پر اور سختیاں شروع کر دیں اور ان کے ساتھ وحشیوں جیسا سلوک شروع کر دیا تو ان میں سخت اشتعال پیدا ہوا اور انھوں نے اسپینیوں کے خلاف ہتیار اٹھا لیئے۔

جنگ عظیم کے زمانہ میں ریفیوں کو ہتیار اکٹھے کرنے کا بڑا اچھا موقع مل گیا تھا، چنانچہ اس زمانہ میں جو ہتیار انھیں برطانیہ اور فرانس کی وساطت سے ملے انھیں اب اسپین کے خلاف استعمال کرنا شروع کر دیا۔ یہ زمانہ ۱۹۲۱ء کا ہے جب محمد بن عبد الکریم جنرل سلوسٹر سے بگڑ کر اور اپنی خدمت سے

مستعفی ہو کر اندرون ریف میں آگئے تھے۔ جس وقت محمد بن عبدالکریم قبیلہ اور یاغل کے علاقے میں پہونچے تو اُنھوں نے دیکھا کہ ریفیوں میں اسپینیوں کے خلاف سخت اشتعال پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن ریفیوں میں تنظیم نہیں ہے۔ ان کی مختلف ٹولیاں مختلف سرداروں کی ماتحتی میں اسپین سے نبرد آزما ہیں۔ یہ حال دیکھ کر محمد بن عبدالکریم نے سارے ریفی قبائل کو پہلے ایک مرکز پر جمع کرنے کی کوشش کی اور سارے ریف کے علاقہ میں پھر کر اپنی حمایت میں ریفیوں کی اکثریت کو ہموار کر لیا۔ اس کے بعد محمد بن عبدالکریم نے چھوٹی چھوٹی جماعتوں کے ساتھ اسپین کی فوجی چوکیوں پر تاخت شروع کر دی۔ مقصد یہ تھا کہ اسپین سے بڑے مقابلہ کے لئے ذخائر جنگ کافی تعداد میں اکٹھا کر لیا جائے۔ ان چھوٹی چھوٹی لڑائیوں کی اطلاع جب حکومت اسپین کو ملی تو شاہ الفانسو نے ریفیوں کے استیصال کے لئے جنرل سلوٹر کو حکم بھیجا۔ اس وقت جنرل سلوٹر کی ماتحتی میں ۱۹ ہزار اسپینی فوج تھی۔ جنرل سلوٹر نے اپنی فوج کے ساتھ ملیلہ سے آگے بڑھ کر "انوال" پر اپنا جنگی مورچہ قائم کر دیا۔ دوسری طرف محمد بن عبدالکریم جو اس دوران میں اطراف وجوانب سے ریفی قبائل کو اپنے جھنڈے کے نیچے جمع کر کے کافی طاقتور ہو چکے تھے جنرل سلوٹر کے مقابل ہوئے۔ مقابلہ سخت تھا، جنرل سلوٹر ایک ہی حملہ میں ہمیشہ کیلئے ریفیوں کا قلع قمع کر دینا چاہتا تھا اور ریفی اسی حملہ پر اپنی آئندہ کامیابی کا انحصار سمجھتے تھے۔ ریفی معمولی بندوقوں سے مسلح تھے اور ذاتی شجاعت کے علاوہ اور کوئی مصنوعی خصوصیت کے مالک نہ تھے۔ لیکن اسپین کی ۱۹ ہزار فوج ہر قسم کے آلاتِ جدید سے مسلح ان کے مقابل تھی۔ محمد بن عبدالکریم نے اس معرکے کو کامیاب بنانے

میں اپنا سارا ذاتی اثر اور قابلیت صرف کر دی، اس لئے بھی کہ ان کا مقابلہ اس شخص سے تھا جس کو ملیلہ میں متنبہ کر آئے تھے کہ اس کے سلوک کا تاوان حکومت اسپین کو ادا کرنا پڑے گا۔ اور اس لئے بھی کہ اسی معرکے کی کامیابی پر ریف اور اسپین کے آئندہ تعلقات کا مدار تھا۔ چنانچہ انوال پر محمد بن عبدالکریم اور جنرل سلورٹر کا مقابلہ ہوا۔ گھمسان کا رَن پڑا۔ اسپینیوں نے اپنے اسلحہ کی اور ریفیوں نے اپنی ذاتی شجاعت کی نہایت سختی سے نمائش کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جدید اسلحہ سے مسلح ہونے کے باوجود اسپینیوں کو شکست فاش ہوئی۔ جنرل سلورٹر یا تو اس لڑائی میں مارا گیا یا اس نے شرما کر خودکشی کر لی۔ ریفیوں نے ۱۹ ہزار اسپینیوں میں ۱۶ ہزار اسپینی کاٹ کر پھینک دیئے۔ اور جو اسپینی باقی رہے وہ بدحواس ہو کر بندرگاہوں کی طرف بھاگے۔ اس فتح سے بہت سا ذخیرہ غازی عبدالکریم کے ہاتھ آیا اور ملیلہ تک ان کا راستہ روکنے والا کوئی نہ رہا۔

لیکن غازی عبدالکریم نے ملیلہ پر مصلحتاً حملہ نہیں کیا بلکہ مال غنیمت لے کر ریف کے اندرونی علاقے میں پلٹ آئے، اور "اجدا" کے مقام پر انھوں نے اپنی پوزیشن کو مضبوط کرنا شروع کر دیا۔

غازی عبدالکریم نے اجدا کو ریف کا پایۂ تخت قرار دے کر ریف کے نظم و نسق کو بھی اپنی نگرانی میں لے لیا۔ اور جمہوری اصولوں پر ایک عارضی حکومت اپنی ماتحتی میں قائم کر دی جسے سرداران اور شیوخ قبائل کی مجلس نے تسلیم کر لیا، غازی عبدالکریم ریف کے امیر منتخب ہو گئے۔

شیوخ اور سرداران قبائل کی مجلس کے سپرد امیر عبدالکریم نے

ملک کے نظم و نسق کی نگرانی کے علاوہ قبائل کے اندر تبلیغ اتحاد کا کام کر دیا۔ سارے قبائل ریف کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک کو اُنھوں نے ملک کی حفاظت کا ذمہ دار قرار دیا اور دوسرے کو اُنھوں نے ملک کی اندرونی فلاح اور بہبود پر لگا دیا۔

مصارف جنگ کیلئے قدیم اسلامی ٹیکس عشر رائج کیا۔ یعنی کل پیداوار کا دسواں حصہ اور امدادی رقوم کے لئے بھی ملک سے اپیل کی گئی۔ روپیہ جمع ہونے لگا۔ جس سے امیر عبدالکریم کو ملک کے انتظام میں بڑی سہولت ہوگئی۔

امیر عبدالکریم کو کامل ایک برس کا زمانہ امن و سکون کا ملا اور اس زمانہ میں اُنھوں نے اپنے ملک کے انتظام کو بالکل درست کر لیا۔

سنہ ۱۹۲۳ء میں امیر عبدالکریم نے ریفیوں کا ایک وفد حکومت برطانیہ کی خدمت میں انگلستان روانہ کیا۔ اس وقت انگلستان کے وزیر اعظم مسٹر ریمزے میکڈانلڈ تھے اس وفد نے حکومت برطانیہ سے یہ خواہش کی کہ وہ بیچ میں پڑ کر ریف اور ہسپانیہ کی صلح کرا دے۔ حکومت برطانیہ نے اس درخواست سے دلچسپی کا اظہار کیا اور یہ چاہا کہ خود بیچ میں پڑ کر اسپین اور ریف کی صلح کرا دے۔ لیکن انگلستان کی یہ کوششیں بار آور نہ ہوئیں۔ اسلئے کہ انوال کی شکست فاش کے بعد اسپین میں شاہ الفانسو کی حکومت کے خلاف بہت سخت غم و غصے کا اظہار کیا جا رہا تھا اور اسپین میں ایک فوجی انقلاب کی فضا پیدا ہوگئی تھی۔ چنانچہ سنہ ۱۹۲۳ء کے آخر میں انقلاب ہوگیا۔ شاہ الفانسو کو اہل اسپین نے حدود اسپین سے نکال باہر کیا۔ اس کے بجائے ملک میں فوجی ڈکٹیٹر شپ قائم ہوگئی۔ اور جنرل پریمو ڈی ریورا اسپین کا ڈکٹیٹر بن بیٹھا جنرل ریورا نے برسر اقتدار آتے ہی یہ اعلان کیا کہ انوال پر اسپین کو جو ذلت

ریفیوں کے مقابل اُٹھانی پڑی ہے۔ اس کا پُورا پُورا بدلہ لیا جائیگا نئی حکومت کی اس پالیسی کے اعلان کے بعد اسپین اور ریف کی مصالحت کا امکان جاتا رہا اور ریف میں امیر عبدالکریم نے بھی از سر نو اسپینیوں سے مقابلے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

جنرل پریموڈیریورا نے بہت سی تازہ دم فوج ریف کے ساحلوں پر اُتار دی اور ہر طرف سے ریفیوں کی ناکہ بندی کر دی۔ اسپینیوں کا خیال تھا کہ اس ناکہ بندی سے ریفیوں کو اطاعت پر مجبور کیا جا سکے گا۔ لیکن یہ خیال غلط نکلا اور ریفی بدستور اپنی ہٹ پر قائم رہے۔ ۱۹۲۳ء کا پورا سال طرفین کی تیاریوں میں گذرا۔ اس دوران میں اسپین اور ریف کی چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں لڑائی بھی ہوتی رہی۔ لیکن جما ہوا مقابلہ ۱۹۲۴ء سے پہلے نہیں ہوا۔ شروع ۱۹۲۴ء میں جبکہ اسپین کی فوجیں ریف پر ایک زبردست حملہ کی تیاریاں کر رہی تھیں امیر عبدالکریم نے اچانک ان پر حملہ کر دیا۔ اور ابھی وہ اچھی طرح سنبھلنے بھی نہ پائے تھے ان کی آدھی سے زیادہ تعداد کو کاٹ کر رکھدیا۔ اسپینیوں کو اس مرتبہ بہت نقصان پہونچا۔ بہت سا سامانِ جنگ ریفیوں کے قبضے میں آگیا اور ملیلہ کے قریب کے اکثر مقامات پر ریفیوں کا قبضہ ہو گیا۔

اس جنگ میں اسپین کی شکست سے اسپین میں شورش ہو گئی اور جنرل ریورا کی حکومت نے پبلک احتساب سے بچنے کے لئے یہ اعلان کیا کہ اب حکومت اسپین ریف سے اپنی ساری شکستوں کا بدلہ لے لے گی اور عنقریب امیر عبدالکریم کو گرفتار کر کے ریف کے اس فتنے کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیگی۔ چنانچہ جنرل ریورا کی حکومت نے اب کے پھر ایک زبردست فوج ریف بھیجی اور اس فوج کی امداد کو ڈیڑھ سو ہوائی جہازوں کا ایک دستہ بھی

روانہ کیا تاکہ اہل ریف کی سرکشی کو بمباری سے کچلا جا سکے۔

اس تیاری کے ساتھ حکومت اسپین ایک مرتبہ پھر امیر عبدالحکیم کے مقابل ہوئی۔ جنگ باقاعدہ ابھی شروع نہیں ہوئی تھی، لیکن اسپین کے ہوائی جہاز نہتے ریفیوں پر گولہ باری کی مشق کرنے لگے۔ کثرت سے عورتیں اور بچے اس ہوائی بمباری کی نذر ہو گئے۔ اور ریفیوں کی بستیوں کی بستیاں تباہ و برباد ہو گئیں۔ لیکن ان کے حوصلوں میں کوئی فرق نہیں آیا وہ بدستور اسپین کے مقابلے کی تیاریوں میں مصروف رہے۔ اب کے مورچہ ریفیوں نے "سیدی مسعود" پہ قائم کیا تھا اور اسپینیوں کی پذیرائی کے لئے پوری طرح تیار تھے۔ اسپین نے اس مورچے پر بم برسانے شروع کئے لیکن یہاں اسپین کی اینٹ کا جواب پتھر سے ملا۔

آخر مئی ۱۹۲۴ء کو اسپین نے ریف کے مورچے پہ عام حملہ کر دیا۔ ابتداءً انھوں نے اس حملہ کی مدافعت کی لیکن بعد میں جارحانہ حملہ کر کے اسپینی فوج کے قلب کو توڑ دیا اور انھیں گھیر کر اپنی تلواروں پہ رکھ لیا۔ اسپین کو پھر شکست ہوئی۔ اسپینی میدان جنگ چھوڑ کر بھاگے۔ ۲۰۰ مشین گنیں، ۶۰۰۰ بندوقیں اور چار سو خچر ریفیوں کے ہاتھ آئے، اور ساڑھے چار سو اسپینی قید ہوئے۔

اس شکست کا اثر اسپین پہ یہ پڑا کہ جنرل ریورا کی حکومت متزلزل ہو گئی اور ریف میں یہ ہوا کہ امیر عبدالکریم کا اقتدار سارے ملک میں بڑھ گیا۔ امیر عبدالکریم کا رقیب امیر رسولی جو پچھلے دنوں اسپین سے مل کر قوم پرست ریفیوں کے لئے تکلیف دہ ہو گیا تھا امیر عبدالکریم نے اسے گرفتار کر کے اس فتنہ کو بھی ختم کر دیا اور اب وہ ریف کے واحد امیر بن گئے۔

ریفیوں کا طریقہ جنگ جس سے وہ ہمیشہ اسپینیوں پر فتح پاتے تھے یہ تھا کہ وہ اسپین کی کسی چوکی کے پاس چھُپ کر بیٹھ جایا کرتے تھے، اور جب کوئی اسپینی دستہ یا رسد پہونچانے والی جماعت قریب پہونچ جاتی تو وہ اسے گولیوں کا نشانہ بنایا کرتے تھے۔ بندوقیں ان کے پاس نئی وضع کی تھیں۔ اس لئے یہ بڑی آسانی سے دُور ہی سے دشمنوں کو ختم کرنا شروع کر دیتے تھے اس طرح کہ خود بڑھتے ہوئے دشمنوں کو نظر نہ آتے تھے۔ قلعوں پر اُنھوں نے بہت کم حملہ کیا ہے۔ کھُلے میدان میں بھی یہ لڑتے تھے۔ لیکن کھُلے میدان میں دُور سے گولہ باری کے یہ قائل نہ تھے دست بدست لڑائی لڑا کرتے تھے اور دست بدست لڑائی میں ہمیشہ اسپینیوں کو نیچا دکھاتے تھے۔

مئی ۱۹۲۴ء کی شکست کے بعد اگست ۱۹۲۴ء تک کوئی جما ہوا مقابلہ اسپین اور اہل ریف کے درمیان نہیں ہوا۔ اکتوبر ۱۹۲۴ء میں اسپین نے اپنا سامانِ رسد ایک فوجی چوکی پر روانہ کیا۔ اور سامان رسد کی حفاظت کیلئے اسپینیوں کا ایک زبردست فوجی دستہ بھی ساتھ تھا۔ اہل ریف نے اس دستہ پر حملہ کر دیا۔ دو دن تک سخت لڑائی ہوتی رہی۔ بالآخر اہل ریف نے اس فوجی دستہ کو مار بھگایا اور سامان رسد پر قبضہ کر لیا۔ جس کی مالیت کا اندازہ ۴۰ ہزار پونڈ تھا۔

اس کے کچھ دنوں بعد اسپینیوں نے پھر سامان رسد بھیجا، اُنھوں نے پھر چھین لیا۔ تیسری مرتبہ پھر سامانِ رسد بھیجا گیا۔ حشر اس کا بھی تو یہی ہوا جو اس سے پہلے کی کوششوں کا ہو چکا تھا۔

اگست ۱۹۲۴ء میں نہر لاؤ پر ریفیوں اور اسپینیوں کا مقابلہ ہوا مگر اسپینیوں کو قوی امید تھی کہ اس جنگ میں وہ ریفیوں کو بُری طرح شکست دیں گے۔ لیکن مشیت کو کچھ اور منظور تھا۔ یہاں بھی اسپینیوں نے ریفیوں سے

شکست کھائی۔ اس شکست کا اثر اسپین میں بُری طرح محسوس ہوا اور جنرل ریورا کو اپنا اقتدار قائم رکھنا مشکل ہو گیا۔ اس شکست کے بعد اس نے امیر عبدالکریم کو دعوت دی کہ اپنا قضیہ دوستانہ انداز میں طے کرلیں۔

امیر عبدالکریم کی حکومت نے اس دعوت نامہ کا نہایت تفصیلی جواب حکومت اسپین کو دیا جس میں لڑائی روکنے کی پہلی شرط یہ پیش کی کہ اسپینی بغیر کسی شرط کے ریف خالی کر دیں۔ اسی شرط کو پیش کرتے ہوئے امیر عبدالکریم نے یہ لکھا تھا:۔

"اسپین کی خواہش نو آبادیات نے ہماری عزت خاک میں ملا دی، ہمارے حقوق غصب کر لئے، ہمارے گھر میں ہم پر حملے کئے گئے۔ ہمیں غلام بنانے کی تدبیریں کی گئیں اب ہم سے صلح چاہی جاتی ہے۔ ہم صلح کریں گے لیکن اس طرح کہ ہم بالکل آزاد رہیں۔ ہم نے اپنے خدا اور اس کے تمام بندوں کو شاہد بنالیا ہے کہ ہم خود اپنے اوپر حکومت کریں گے، اپنے جائز حقوق کی حفاظت کرینگے۔ اور اپنے وطن کی پوری پوری مدافعت کرینگے۔"

امیر عبدالکریم کے اس جواب کے بعد گفت و شنید کا دروازہ بند تو نہیں ہوا لیکن کامیاب اختتام کی توقع اُٹھ گئی۔ میڈرڈ میں ایک جماعت ایسی پیدا ہو گئی جس نے ریف پر سے قبضہ اُٹھا لینے کی حمایت میں پروپیگنڈا شروع کر دیا اور جنرل ریورا کی حکومت بھی اس پر نیم راضی سی معلوم ہونے لگی کہ صرف ملیلہ پر قبضہ رکھ کر سارے ریف سے اپنا قبضہ اُٹھا لے۔

امیر عبدالکریم کی ان سرگرمیوں نے سارے عالم اسلام کو بھی ریف کی طرف متوجہ کر دیا تھا اور ہر طرف سے یہ مطالبہ ہونے لگا تھا کہ اسپین ریف سے اپنا قبضہ اُٹھا لے۔ اسی کے ساتھ اتحاد

بین المسلمین کی تحریک بھی مصر اور طرابلس سے شروع ہو گئی۔ اس موقع پر شیخ سنوسی اعظم نے مسلمانوں کے نام جو اپیل شائع کی تھی اس کا اقتباس یہ ہے:۔

"اے قوم اسلام یہ بات ذہن نشین کر لو کہ اللہ کی وحدانیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کے اعتراف نے تمھارے سارے عناصر کو ایک جھنڈے کے ماتحت کر دیا ہے اور وہ جھنڈا اسلام کا ہے۔ تم میں بجز عنصر اور زبان کے آپس میں کوئی اختلاف نہیں۔ لیکن عنصر اور زبان کو بھی کلمۂ توحید نے محمدی جھنڈے کے نیچے ایک کر دیا ہے۔

اب یہ فرض تمہارا ہے کہ تم اپنی متفرق قوتوں کو سمیٹ لو اور آپس میں ایک ہو جاؤ۔

بہت تھوڑے عرصے میں آزادیوں کا دور شروع ہوگا۔ ایک کے بعد ایک اسلامی ملک آزاد ہوگا۔

امیر عبدالکریم نے صرف پانچسو آدمیوں کے ساتھ جہاد شروع کیا تھا مگر آج ان کے پاس پانچ لاکھ کا لشکر ہے۔ مصر اور سوڈان کے مسلمانوں سے بھی انھیں امداد ملتی ہے۔ اناطولیہ میں بھی اسی طرح بہت کم آدمیوں سے جہاد شروع ہوا تھا لیکن پندرہ دن میں انھوں نے یونانیوں کو سمندر میں دھکیل دیا۔ انشاء اللہ امیر عبدالکریم بھی اپنی کوششوں میں کامیاب ہوں گے۔ پس یاد رکھو مسلمانوں کی کامیابی اتحاد اور عزم کی استواری میں ہے۔ استوار عزم اور متحد ہو کر آزادی کی جدوجہد کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کریگا"

جنرل ریویرا کی حکومت ریف اور امیر عبدالکریم کے پروپیگنڈے سے متاثر ضرور تھی اور وہ امیر عبدالکریم سے گفتگو سے مصالحت کرنے پر بھی تیار تھی لیکن

اس طرح کی گفت گو کامیابی کے ساتھ اس لئے نہ ہو سکی کہ مسلسل کامیابیوں کے باعث امیر عبدالکریم کے مطالبات میں اعتدال قائم نہ رہا تھا اور اسپین کی کوئی سیاسی پارٹی ان مطالبات کو منظور کرنے پر تیار نہ تھی۔ جو اس موقع پر امیر عبدالکریم کی طرف سے پیش ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مصالحت کی کوششیں جو اس دوران میں متعدد مرتبہ ہو چکی تھیں ہر مرتبہ ناکام رہی اور ریف اور اسپین میں حالت جنگ قائم رہی۔

ستمبر ۱۹۲۶ء میں امیر عبدالکریم اور اسپین کے درمیان طیطوان پر لڑائی ہوئی اس لڑائی کا اسپین میں بڑا چرچا کیا گیا اور یہ خیال کر لیا گیا کہ اس لڑائی میں اہل ریف کو ایسی شکست ہوگی کہ پھر اسپینیوں کے مقابل ان کے قدم نہ جم سکیں گے۔ لیکن مشیت کو کچھ اور منظور تھا۔ پندرہ دن کے شدید مقابلے کے بعد اسپین کی فوجیں اہل ریف کے دباؤ کی تاب نہ لاسکیں اور طیطوان کو خالی کر دینے پر مجبور ہو گئیں۔

اس نوبت پر حکومت اسپین نے پھر امیر عبدالکریم سے گفتگوئے مصالحت شروع کر دی۔ وہ اس پر آمادہ تھی کہ ریف کا بہت سا علاقہ خالی کر دے اور اسپینی خطوط کے باہر جو علاقہ ہے وہاں امیر عبدالکریم کی حکومت تسلیم کرے۔ اس کے بدلے میں امیر عبدالکریم سلطان مراکش کا اقتدار تسلیم کرلیں۔ اس کے جواب میں امیر عبدالکریم نے حکومت اسپین کے آگے یہ مطالبہ پیش کیا کہ اسپین ریف پر سے کامل طور پر اپنا اقتدار اٹھا لے۔ صرف تین شہر سیوطہ، ملیلہ اور الحمیص پر قابض رہے۔ بقیہ علاقہ میں ایک آئینی سلطنت قائم کی جائیگی جسے اسپین باضابطہ تسلیم کرے۔ امیر ریسولی اور ان قبائل کو جنھوں نے اسپین کے ساتھ مل کر ریف کے قوم پرستوں کو نقصان پہنچایا ہے قرار واقعی سزا دی جائیگی۔

اور جسقدر اسپین کے اسیران جنگ اس وقت امیر عبدالکریم کے قبضے میں ہیں ان کا زر فدیہ لیا جائیگا۔ اس جواب کے بعد گفت گوئے مصالحت پھر رک گئی۔ لیکن جنرل ریورا نے ریف کے پہاڑی مقامات سے اسپین کی فوجیں آہستہ آہستہ پیچھے ہٹانی شروع کردیں۔ اس کارروائی سے امیر عبدالکریم کا ذاتی اثر و وقار بہت بڑھ گیا۔

اسپینی فوجوں کو امیر عبدالکریم کے مقابلے میں جو پے در پے شکستیں اٹھانی پڑیں اس کی وجہ دراصل یہ تھی کہ جن علاقوں میں اسپینی فوجیں پہنچادی گئی تھیں۔ وہ سخت پہاڑی تھے۔ آلاتِ جدید وہاں کام نہ دے سکتے تھے اور نہ مزید کمک وہاں پہنچ سکتی تھی۔ جنرل ریورا نے اسپینی فوجوں کی اسی غلطی کو درست کرنے کے لئے یہ حکم دیا تھا کہ خطرناک مقامات سے اسپین کی فوجیں ہٹ آئیں اور بندرگاہوں کے علاقہ میں جمع ہو جائیں تاکہ ان کی رسد اور کمک پر اہل ریف چھاپے نہ مارنے پائیں۔ اس حکمت عملی کی وجہ سے بھی اسپین کو نقصان اُٹھانا پڑا۔ اس لئے کہ اسپین کی فوجیں جب پہاڑی علاقے سے ہٹنے لگیں تو امیر عبدالکریم کی فوجوں نے ان پر حملہ کردیا۔ اور ہر جگہ انھیں نقصان پہونچایا۔ چنانچہ اگست ۱۹۲۴ء کے بعد سے امیر عبدالکریم اور اسپین کی فوجوں میں جسقدر لڑائیاں ہوئی ہیں وہ اسی انداز پر ہوئی ہیں کہ اسپینی فوجیں جب اپنے مرکز سے ہٹنے لگتی تھیں تو امیر عبدالکریم کے بے قاعدہ دستے ان پر جا پڑتے تھے اور انھیں کاٹ کر رکھ دیتے تھے۔

امیر عبدالکریم کا اثر و اقتدار بڑھ جانے سے ریف کے وہ قبائل بھی ان کے جھنڈے کے نیچے جمع ہونے لگے جو اب تک ان کے رقیب امیر رسو لی کے ماتحت اسپین کے وفاداروں میں سمجھے جاتے تھے۔ اس لئے کہ خود

امیر ریسونی کو امیر عبدالکریم کے مقابلے میں شکست ہو چکی تھی اور امیر ریسونی کو امیر عبدالکریم نے قید کر لیا تھا۔ اسکے باوجود ریف کے جنوب اور فرانسیسی سرحد سے متصل کچھ قبائل ایسے بھی تھے جنھوں نے امیر عبدالکریم کی اطاعت قبول نہیں کی تھی، اور امیر عبدالکریم موقع کی تلاش میں تھے کہ اگر موقع ملے تو ان قبائل پہ فوج کشی کر کے انہیں زیر کریں۔ انھیں قبائل میں ایک قبیلہ انجیرہ بھی تھا۔ اس قبیلے کے شیخ کو امیر عبدالکریم نے دعوت نامہ بھیجا۔ ابتداً تو اس قبیلے نے امیر کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا لیکن جب طیطوان پہ اسپینیوں کو شکست ہو گئی تو انجیرہ قبیلے کے شیخ زلال بھی امیر عبدالکریم کے جھنڈے کے نیچے آ گئے۔ اس قبیلہ کی حمایت کے بعد امیر عبدالکریم کے لئے ریف پہ ایک حکومت قائم کر لینے کا موقع پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن اسپینی فوجیں چونکہ اس وقت تک ریف کے علاقہ سے پوری طرح پسپا نہیں ہو چکی تھیں۔ اس لئے امیر عبدالکریم کی ساری سرگرمیاں اہل اسپین کو اپنے علاقہ سے مار بھگانے پر مرکوز رہیں۔

قبائل انجیرہ کے اعلان جہاد کے بعد اسپینیوں کو ایک نیا خط جنگ درست کرنا پڑا۔ اس لئے کہ اب ان پر شمال اور جنوب دونوں طرف سے دباؤ پڑنے لگا تھا۔ اب کہ جو خط جنگ اسپینیوں نے بنایا اس میں یہ اہتمام رکھا کہ ہر سو گز کے فاصلے پہ ایک اسپینی چوکی بنائی اور سارا خط پانچ میل لمبا قائم کیا۔ اس خطہ کی حفاظت کا پورا پورا انتظام کر کے اسپینی کسی قدر مطمئن نظر آنے لگے۔ اس خطہ پر جو اسپینی فوجیں متعین تھیں انھیں سامان رسد بندرگاہوں کے ذریعہ پہونچایا جا سکتا تھا اور مزید کمک کا بھی انتظام ہو سکتا تھا، اور اس کمک کو روک دینا اہل ریف کے بس کا کام نہ تھا۔

اسپینی فوجوں نے جدید خط جنگ کو مضبوط کر کے انجیرہ کے علاقہ میں پیشقدمی شروع کر دی، اب کہ اسپینی فوجوں کی پیش قدمی نہایت محتاط انداز میں

ہو رہی تھی جتنا علاقہ وہ فتح کرتے جاتے تھے اسے محفوظ کرتے جاتے تھے۔ اسپینی ہوائی جہاز اسپینی فوجوں کی پیشقدمی میں برابر کا حصّہ لے رہے تھے۔ فوجوں کی پیشقدمی سے پہلے یہ بستیوں کی بستیاں تباہ و برباد کر ڈالتے، اور مجاہدین کے دستے کے دستے بھون ڈالتے۔ اسپینی فوجوں کی اس تازہ پیش قدمی کے دوران میں صرف "رفاعیہ" پر ایک جگہ مجاہدین نے اسپینیوں کا جم کر مقابلہ کیا۔ لیکن انھیں کامیابی نہ ہو سکی اور اسپینی مورچہ مضبوطی کے ساتھ قائم رہا۔

اسپینی فوجوں کی پیشقدمی کے دوران میں امیر عبدالکریم اطراف و جوانب کے قبائل کو اپنی حمایت پر آمادہ کرنے میں مصروف رہے۔ چنانچہ چند قبائل کے ساتھ امیر رسولی کے بھی کچھ قبیلے امیر عبدالکریم کے جھنڈے کے نیچے آ گئے۔ اور خود امیر رسولی بھی امیر عبدالکریم کے ساتھ مل گیا۔ اس واقعہ سے اسپین میں کافی تشویش پیدا ہوئی اس لئے کہ امیر رسولی مدت سے اسپین کا ہوا خواہ تھا اور اسی کی مدد سے اسپین کو ریف میں قدم جمانے کا موقع ملا تھا۔ چنانچہ امیر عبدالکریم اور امیر رسولی کے اتحاد کا اسپین پر یہ اثر پڑا کہ جنرل ریورا کی حکومت نے ایک مرتبہ پھر صلح کی سلسلہ جنبانی کی۔ اب کے جنرل ریورا نے امیر عبدالکریم سے یہ درخواست کی کہ وہ اور ان کے بھائی کسی بین الاقوامی علاقے میں جنرل ریورا سے شرائط صلح طے کر لیں۔ اس پیغام کے ساتھ جنرل ریورا نے یہ شرط بھی رکھی تھی کہ سلطان مراکش کی سیادت ریف پر تسلیم کر لی جائے، اور اسپین چونکہ سلطان مراقش کی فرمانروائی کا ضامن ہے۔ اس لئے امیر عبدالکریم اسپین کے اس مرتبہ کو بھی تسلیم کرے اسی کے ساتھ جنرل ریورا نے امیر کو یہ بھی یقین دلایا تھا کہ شرائط صلح اس قدر فیاضانہ ہونگی کہ نہ اس سے پہلے ایسی پیش ہوئیں اور نہ اس کے بعد ایسی شرائط کی توقع کی جا سکتی ہے۔ اس پیغام کا جواب امیر عبدالکریم نے یہ دیا:-

۱۔ ریف سے اسپینی اقتدار اُٹھا لیا جائے۔ ریف کی آزادی کامل کا اعلان کر دیا جائے۔

۲۔ مراکش کے کسی حصے پر اسپینی اقتدار براہ راست نہ ہونا چاہیئے۔

۳۔ ریف سلطان یوسف (مراکش) کے اقتدار کو تسلیم نہیں کریگا۔ اس لئے کہ سلطان اسپین کے ہاتھ میں قیدی ہیں اور انھیں آزادی عمل حاصل نہیں۔

۴۔ سلطان یوسف کو فرانسیسیوں نے تخت نشین کیا ہے۔ لیکن جو مراکش کے تخت کے حقیقی وارث تھے انہیں محروم کر دیا گیا ہے۔ اس لئے سلطان یوسف کی قیادت تسلیم نہیں کی جا سکتی۔

اس جواب کے بعد صلح کی گفت و شنید پھر رک گئی۔ اصل میں اسپین کی حکومت امیر عبدالکریم سے مصالحت تو کرنی چاہتی تھی لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی چاہتی تھی کہ مراکش پر اس کا اثر بھی قائم رہے۔ اور امیر عبدالکریم سلطان مراکش کے ماتحت جو فرانس اور اسپین کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے، امیر ریف کی حیثیت اختیار کر لیں۔ لیکن امیر عبدالکریم اپنی مسلسل کامیابیوں کے باعث اس کے لئے بالکل تیار نہیں تھے کہ اسپین سے دب کر صلح کریں۔

سلطان مراکش کی سیادت بھی اُنھوں نے ریف پر تسلیم کرنے سے اسلئے انکار کر دیا تھا کہ سلطان کی پوزیشن ان کے نزدیک آزاد نہیں تھی علاوہ اسکے سلطان کی سیادت کو تسلیم کر لینے کے معنی یہ تھے کہ امیر عبدالکریم بالواسطہ فرانس اور اسپین کا اقتدار تسلیم کر لینے پر آمادہ ہیں۔

بہرحال اسپین اور امیر عبدالکریم کے درمیان اس مرتبہ بھی صلح کی بات چیت نہ ہو سکی اور ریف اور اسپین کے درمیان بدستور حالت جنگ قائم رہی اس دوران میں جبکہ اسپین سے صلح کی بات چیت ہو رہی تھی امیر عبدالکریم نے ایک اعلان

شائع کیا جس میں انھوں نے اسپین سے لڑائی کے اسباب و وجوہ پر نہایت تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس اعلان میں امیر عبدالکریم کہتے ہیں:۔

۱۔ اس جنگ کا ایک اور صرف ایک مقصد ہے اور وہ یہ کہ علاقہ جات ریف اور جبالہ کو حملہ آوروں کی فوجوں سے نجات دلائی جائے اور اپنے وطن کے لئے کامل آزادی اور خود مختاری حاصل کی جائے۔ الحمد للہ کہ ہماری شجاع افواج نے وطن کے بہت بڑے حصے کو دشمن کے ناپاک وجود سے پاک کر دیا۔

۲۔ جنگ ختم ہونے کے بعد ہمارا ارادہ ہے کہ ہم اپنے وطن کے نظم و نسق کی اصلاح کریں اور تجارت کو جو اس دوران میں گر رہی ہے دوبارہ سرسبز ہونے کا موقع دیں۔ اسی کے ساتھ مغربی اقوام سے اہل ریف کے دلوں میں جو نفرت پیدا ہو گئی ہے اسے دور کر کے از سر نو اخلاص اور دوستی کے تعلقات آپس میں قائم کریں۔

۳۔ ہم اپنے ملک کا انتظام خود کر سکتے ہیں اور اپنی اس انتظامی صلاحیت کا ثبوت ہم دنیا کے آگے اس طرح پیش کر چکے ہیں کہ پچھلے اٹھارہ مہینے میں ہم اپنے علاقہ میں مکمل طور پر آزادی کے ساتھ اپنا انتظام خود کرتے رہے ہیں اسی کے ساتھ ہمارا آپس میں اتحاد عمل اور حب وطن دنیا پر اچھی طرح ثابت ہو چکا ہے جس میں چھوٹا بڑا اور امیر و غریب سب شامل ہیں۔

۴۔ اس وقت تک ہماری حکمت عملی یہ تھی کہ سیوطہ اور ملیلہ کو اسپینیوں کے ہاتھوں میں رہنے دیا جائے۔ لیکن چونکہ اسپین ہمارے پیش کردہ شرائط قبول کرنے سے قاصر رہا ہے۔ اس لئے ممکن ہے کہ ہم آئندہ یہ مقامات بھی اس سے خالی کرانے پر مجبور ہو جائیں۔

۵- یہ خیال نہ ہونا چاہیئے کہ ہمارے وسائل جنگ جواب دے چکے ہیں اور ہم صلح کر لینے کیلئے مجبور ہو رہے ہیں۔ ہم دراصل جس چیز کے سب سے زیادہ خواہاں ہیں وہ اپنی عزت و ناموس اور اپنے وطن کی آزادی اور خود مختاری ہے۔

۶- ہماری افواج میں کوئی غیر ملکی افسر نہیں ہے اور نہ ہمارے علاقے میں کوئی بالشویک ایجنٹ ہے۔ ہمیں بالشویزم سے کوئی لگاؤ نہیں ہے، اس لئے کہ بالشویزم کی تعلیم اسلام کے خلاف ہے اور اس کی تصدیق وہ لوگ کر سکتے ہیں جن کی اسلامی تعلیمات پر نظر ہے۔

۷- ہم چاہتے ہیں کہ فرانس اور فرانسیسی مقبوضات مراکش سے عمدہ تعلقات رکھیں۔ ہم کو امید ہے کہ فرانس کے آزاد خیال مدبرین۔ ہماری خواہشات کو کسی طرح اپنے ملکی مفاد کے خلاف نہ سمجھیں گے۔ اگر دولت فرانس ہم سے اچھا برتاؤ کرے اور ہمارے جنوبی قبائل کو لالچ دیکر ہم پر حملہ کرانا چھوڑ دے تو حکومت ریف بھی اپنے علاقہ میں فرانس کے خلاف ہر قسم کے پروپیگنڈے کو بند کر دے گی۔

۸- ہم "طنجہ" پر حملہ کرنیکا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ اس سلسلے میں جو کچھ مشہور ہو رہا ہے وہ محض پروپیگنڈہ ہے۔

۹- یورپی قومیں اگر ہماری آزادی تسلیم کرلیں تو ہمیں ان سے کوئی پرخاش نہیں رہتی۔

میں محمد بن عبدالکریم اور میرے وزیر ریف میں ایک خود مختار حکومت قائم کرنی چاہتے ہیں جو قرآنی احکام کی پابند رہے گی۔ اس کے ساتھ ہم مغرب کے بہترین اصول بھی اپنی حکومت میں قبول کرلیں گے۔

ہمسایہ ممالک سے ہمیشہ صلح رکھنے کی کوشش کریں گے۔ اور ایک حقیقی مجلس اقوام کے خیال کو ترقی دینے میں سعی کریں گے۔"

امیر عبدالکریم کا یہ اعلان لندن، فرانس اور اسپین کے اخباروں میں شائع ہوا اور اس پر فرانس اور اسپین میں بحث و گفتگو بھی رہی لیکن امیر کے اعلان کی شرطیں ایسی نہیں تھیں جن کو یہ قومیں فی الفور تسلیم بھی کر لیتیں۔ بلکہ اب امیر عبدالکریم کی پیشقدمی اور فتوحات سے خود فرانس کو اپنے مقبوضہ مراکشی علاقہ کی فکر ہو گئی تھی، اسے یہ اندیشہ تھا کہ امیر عبدالکریم اسپینی علاقہ میں بڑھتے بڑھتے فرانسیسی علاقہ میں نہ در آئیں دوسرے ریف کے قبائل میں اسپین کے خلاف جو جوش و خروش پایا جاتا تھا اس نے اپنے ہمسایۂ فرانسیسی علاقے کو بھی متاثر کر رکھا تھا، اور فرانس کے زیر اقتدار سرحدی قبائل میں بھی بے چینی پیدا ہو گئی تھی۔ اسی بے چینی کو وجہ قرار دیکر فرانس اسپین کے مقبوضہ علاقے پر فوجی کارروائی کرنی چاہتا تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ اس کی اس کارروائی کو انگلستان، اٹلی اور خود اسپین برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن یہ موقع فرانس کو جلد ہاتھ آ گیا۔ ۱۹۲۵ء میں سوڈان کے گورنر جنرل سرلی اسٹاک کو چند مصریوں نے دن دھاڑے قتل کر دیا۔ برطانیہ نے اس قتل سے متاثر ہو کر مصری حکومت کو الٹی میٹم دیدیا کہ سوڈان سے مصری سپاہی اور افسر واپس بلالے۔ ہر قسم کے سیاسی مظاہرے بند کر دے سپاہ لاکھ پونڈ جرمانہ حکومت برطانیہ کو ادا کرے "غرابیہ" کے علاقے کی زمین سوڈان کے حوالے کر دے وغیرہ وغیرہ

سعد زغلول پاشا اس وقت مصر کے وزیر اعظم تھے انھوں نے یہ تو مان لیا کہ سرلی اسٹاک کے قاتلوں کا سراغ لگایا جائے گا اور انھیں قرار واقعی سزا دی جائے گی لیکن برطانیہ کی اور کوئی شرط تسلیم نہیں کی۔ اس

پر برطانیہ نے سوڈان کے فوجی افسروں کو یہ ہدایت بھیجی کہ سوڈان سے سارے مصری
چُن چُن کر نکال دیں۔ عزابیہ کے علاقہ پر قبضہ کرلیں، اور مصری جنگی خانہ کو اپنی
نگرانی میں لے لیں۔ برطانیہ کے اس تشدد کے جواب میں سعد زغلول پاشا
نے وزارت سے استعفےٰ دیدیا اور فرانس نے مصر پر برطانیہ کی اس زیادتی کا
خوب خوب پروپیگنڈا کیا۔ حکومت برطانیہ نے فرانس کے اس پروپیگنڈے
کو بند کرنے کے لئے مجبوراً وہی کیا جو فرانس چاہتا تھا۔ یعنی یہ کہ مراکش
میں اسے فوجی کارروائی کی آزادی دیدی جائے۔ چاہے یہ کارروائی ریف ہی
کے علاقے میں کیوں نہ کی جائے۔ برطانیہ سے فارغ ہوکر فرانس اسپین
کی طرف متوجہ ہوا اور آپس میں بڑی لمبی گفت وشنید کے بعد یہ طے ہو گیا
کہ فرانس اور اسپین مل کر ریف کے "باغی" کو زیر کریں اور بعد میں اپنے علاقے
تقسیم کرلیں۔ اس فیصلے کی اطلاع جب ریف پہونچی تو امیر عبدالکریم کو بہت دُکھ
ہوا۔ اس لئے کہ فرانس سے انھیں کوئی شکایت نہیں تھی۔ اور وہ فرانس سے
لڑنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ اُنھوں نے ہمیشہ فرانسیسی علاقہ کا لڑائیوں
کے زمانہ میں بھی احترام کیا تھا اور ایک سے زیادہ مرتبہ حکومت فرانس
سے یہ درخواست کی تھی کہ وہ ان کی اور اسپین کی لڑائی میں ثالث بن جائے
اب فرانس نے جو امیر عبدالکریم سے لڑنے کا فیصلہ کیا تو امیر کو یہ یقین ہو گیا کہ غیر
ملکی حکومت چاہے اسپین کی ہو یا فرانس کی اہل ریف کا ساتھ نہ دے گی۔ اس
یقین کے بعد ہی امیر عبدالکریم کی سرگرمیوں میں شدت پیدا ہو گئی اور اُنھوں
نے فرانس کے سرحدی علاقوں میں پوری تیزی سے اپنا پروپیگنڈا شروع
کردیا۔ اور ان قبائل کو جو امیر کی حمایت میں آتے جاتے تھے فوجی کارروائی
کے لئے آمادہ کرتے گئے۔ امیر کی اس کارروائی سے فرانس کو فوراً اہل ریف

کے خلاف فوجی کارروائی کرنیکا موقع مل گیا۔ چنانچہ اس موقع پر فرانسیسی جنرل مارشل لالیوتی نے فرانس کی فوجی کارروائی کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے ایک طویل بیان شائع کیا جس میں انھوں نے اہل ریف سے لڑائی کی ساری ذمہ داری امیر عبدالکریم کی جنگی سرگرمیوں پر ڈالی اپنے اس بیان میں جنرل لالیوتی نے کہا:۔

"اسپین میں اس وقت ایک قسم کی تاریکی پیدا ہو گئی ہے اور مرکزی حکومت بہت کمزور ہو گئی ہے۔ جس کے باعث وہ اپنے مراکشی مقبوضہ کا خاطر خواہ انتظام نہیں کر سکتی۔ لیکن اسپین کے اس مقبوضہ سے ملا ہوا فرانسیسی علاقہ ہے۔ اس علاقے کی سرحد پر امیر عبدالکریم نے اہل قبائل میں جنگی سرگرمی پیدا کر دی ہے اور ان قبائل کو ہمارے خلاف اُکسا دیا ہے۔ امیر کی اس حرکت سے فرانس اور سلطان مراکش دونوں کو مراکش میں خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ اسی خطرے کو دور کرنے کے لئے حکومت فرانس نے یہ اجازت دیدی ہے کہ جس انداز سے فوجی کارروائی مناسب ہو اختیار کی جائے، دوسری طرف میں سلطان مراکش نے یہ ہدایت کی ہے کہ اس خطرے سے مراکش کو آزاد کیا جائے اور ہم نے چونکہ سلطان سے یہ معاہدہ کیا ہے کہ ہم ہر اندرونی اور بیرونی خطرے سے مراکش کو بچائیں گے۔ اس لئے یہ ہمارا اخلاقی فرض ہو جاتا ہے کہ ہم اس موقع پر سلطان کی مدد کریں۔ اور ان کے باغیوں کو قرار واقعی سزا دیں۔

اسی کے ساتھ اس وقت ریف میں جو حالات رونما ہیں وہ نہ صرف

شمالی افریقہ کے لئے بلکہ سارے مشرقی علاقوں کیلئے خطرے کا موجب ہیں۔ اس وقت تمام دُنیائے اسلام کی نظریں امیر عبدالکریم پر لگی ہوئی ہیں جن کے تعلقات ترکی کے مصطفیٰ کمال سے قائم ہیں۔ ریف سے اسپینیوں کی پسپائی کو مشرق میں یوروپ کی تربیت یافتہ فوجوں کی شکست سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ دور دراز علاقوں میں اس کی تشہیر کر کے اندرونی ملکوں میں شورش پیدا کی جا رہی ہے۔ یہ حالت جو اس وقت اسپینی مراکش میں پیدا ہو گئی ہے چونکہ ان تمام یوروپین دول کیلئے جن کا مفاد اسلامی ممالک سے وابستہ ہے خطرے کا موجب ہے خصوصاً فرانس اور برطانیہ کیلئے جن کا اقتدار اس وقت ایشیار اور افریقہ کے بڑے حصے پر پایا جاتا ہے۔ امیر عبدالکریم کی مثال باعث تشویش ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ اسپین کے مقبوضہ علاقے میں اس وقت جو بے چینی پیدا ہو گئی ہے اسے دُور کرنا دول اسپین کا فرض ہے اور اگر اسپین اپنے اندرونی جھگڑوں کے باعث ادھر رُخ نہیں کر سکتا تو یہ فرض اسپین کی ہمسایہ حکومت پر عائد ہو جاتا ہے۔ حکومت برطانیہ بھی حکومت فرانس کی اس پالیسی کی مؤید ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ فرانس کو اہل مراکش کے ساتھ ہمدردی نہیں ہے۔ فرانس نے ہمیشہ سے ہمدردی کی اور برابر کرتا رہے گا۔ سلطان مراکش فرانس کا دوست ہے۔ اور فرانس نے اس کے اقتدار کے تحفظ کی ذمہ داری لی ہے۔ جس کو وہ بہرحال پورا کرے گا۔ اصل میں مشرق و مغرب کے آئندہ تعلقات کا مسئلہ اس وقت ہمارے سامنے ہے اور یہ مسئلہ ایسے طریق حل ہوگا کہ

برطانیہ اور فرانس وفاداری کے ساتھ ایک دوسرے کی مدد کریں۔

مارشل لایوتی کے اس اعلان کے بعد فرانس کی پالیسی بالکل بے نقاب ہو جاتی ہے اور یہ یقین ہو جاتا ہے کہ امیر عبدالکریم اگر اسپین کو اپنے علاقہ سے نکال باہر بھی کریں تب بھی اہل ریف کو آزادی حاصل نہ ہو سکیگی اسپین کے بجائے ان کو فرانس سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔ اور محض اسلئے مقابلہ کرنا پڑے گا کہ اہل ریف کی آزادی سارے مشرق کے لئے بڑی نظیر ہو جائے گی۔ اور اہل مغرب کا اثر مشرق پر سے جاتا رہے گا۔

چنانچہ فرانس کی اس پالیسی کے اظہار کے بعد امیر عبدالکریم کیلئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اسپین کے ساتھ ساتھ فرانس سے بھی مقابلہ کی طرح ڈالیں۔ حالانکہ یہ مقابلہ نابرابر کا تھا اور اس میں امیر عبدالکریم کو اول دن سے شکست نظر آرہی تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنا قدم میدان جنگ سے واپس لینے کو تیار نہ ہوئے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ میں اپنے وطن کی آزادی کیلئے جنگ کر رہا ہوں اپنی حکومت قائم نہیں کرنی چاہتا۔ اس لئے آزادی وطن سے کم کی کوئی شرط مجھے میدان جنگ سے واپس نہیں لاسکتی۔

فرانس کے اس اعلان کے بعد امیر عبدالکریم نے اپنی جنگی سرگرمیاں اور زیادہ تیز کردیں۔ حلیف قبائل کو فوراً تیاری کا حکم دیدیا اور فرانسیسی علاقے پر تاخت کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہوگئے۔

اپریل ۱۹۲۵ء میں امیر عبدالکریم کی تیاریاں مکمل ہوگئیں۔ اور انھوں نے تقریباً ایک لاکھ اہل قبائل کے لشکر کے ساتھ فرانس کے سرحدی قبائل پر حملہ کردیا یہ قبائل وہ تھے جو فرانس اور اسپین کے مدت سے وفادار تھے

اور اہل ریف کے لئے مصیبت بنے ہوئے تھے۔ امیر عبدالکریم نے پہلے انہی کا قلع قمع کرنے کی ٹھانی تاکہ پیشقدمی میں ان قبائل کے عقبی حملہ کا خطرہ نہ رہے۔ ان قبائل پر امیر کا یہ حملہ بہت سخت تھا۔ گاؤں کے گاؤں اس حملے سے تباہ ہو گئے اور امیر عبدالکریم کی فوجیں "وازان" اور "تازہ" کی طرف مظفر و منصور بڑھنے لگیں۔ یہاں فرانسیسی چھاؤنی تھی۔ مارشل لایوتی یہاں کی فوجوں کا کمانڈر تھا اس کے مشیروں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ چھاؤنی خالی کر کے پیچھے ہٹ جائے تاکہ اہل ریف کے حملہ کا زور ٹوٹ جائے لیکن مارشل لایوتی نے اسے منظور نہیں کیا اور امیر عبدالکریم کے حملے کو اسی جگہ روکنے کی تیاریاں کرنے لگا۔ اہل ریف کا حملہ بہت سخت تھا، ہزاروں فرانسیسی کام آ گئے، لیکن مارشل لا لایوتی کے استقلال میں کوئی فرق نہ آیا۔ جولائی تک مارشل لایوتی نے امیر عبدالکریم کے حملوں کو روکا۔ جولائی میں فرانس سے مزید کمک پہنچ گئی۔ مارشل پیتاں اور جنرل تولن کو بھی حکومت فرانس نے مراکش بھیج دیا۔ "تازہ" کی محصور فرانسیسی فوجوں کی جان میں جان آ گئی۔ اسی پر فرانس نے بس نہیں کیا بلکہ اگست میں فرانس نے اسپین کی حکومت کو دعوت دی کہ دونوں حکومتیں مل کر اہل ریف کی باغیانہ سرگرمیوں کو کچلنے کی تدبیریں سوچیں۔ اسپین اور فرانس کے فوجی جنرلوں کی ایک کانفرنس "میدرڈ" میں ہوئی اور اس کانفرنس میں یہ طے پایا کہ فرانس اور اسپین کی متحدہ فوجیں امیر عبدالکریم کی فوجوں کو محصور کر لیں۔ اس تصفیہ کے بعد اسپین اور فرانس نے مشرق اور مغرب سے امیر عبدالکریم کے لشکر کو دبانا شروع کر دیا۔

۸ ستمبر ۱۹۲۵ء کو اسپین کی فوجیں "سیاح" کے مقام پر ایک دوسرے سے مل گئیں۔ اسی دوران میں سردیوں کا موسم شروع ہو چکا تھا اسلئے

اسپین اور فرانس کی متحدہ فوجیں پڑاؤ ڈالے پڑی رہیں اور پیشقدمی موسم کی تبدیلی تک روک دی۔ دوسری طرف امیر عبدالکریم اگرچہ فرانس اور سپین کی متحدہ طاقت کے مقابلے کی تیاریاں کر رہے تھے لیکن اب ان کے لشکر میں پھوٹ کے آثار پیدا ہو گئے تھے یہ آثار فرانس کے اعلان جنگ کے باعث پیدا ہوئے تھے، اور کچھ قبائل ایسے تھے جو فرانس کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر یہ سمجھنے لگے تھے کہ امیر عبدالکریم خود سلطان مراکش کے خلاف صف آرا ہیں اور بجائے فرانس اور اسپین سے لڑنے کے وہ سلطان کے اقتدار کو توڑنے کیلئے لڑ رہے ہیں۔ یہ پروپیگنڈا امیر عبدالکریم کی صفوں میں ابتری ڈالنے کے لئے فرانس نے کیا تھا۔ اور وہ اس حد تک کامیاب بھی ہو گیا کہ بہت سے ریفی قبائل جن پر مذہب کا رنگ غالب تھا امیر عبدالکریم سے ٹوٹ کر اپنے اپنے علاقوں میں واپس چلے گئے۔ اور امیر رسولی بھی جو اسپین سے مقابلہ میں امیر عبدالکریم کے ساتھ ہو گیا تھا اس موقع پر امیر عبدالکریم سے علیحدہ ہو گیا۔ امیر عبدالکریم کے لئے یہ وقت بڑی مصیبت کا تھا۔ لیکن اس کا ان کے پاس کوئی علاج نہ تھا۔ وہ اپنے متعدد اعلانوں میں یہ بتا چکے تھے کہ وہ سلطان مراکش کی اطاعت قبول نہ کرینگے اور یہ بھی ظاہر کر چکے تھے کہ اس وقت تک وہ صلح نہ کرینگے جب تک کہ مراکش سے غیر ملکی اثر ختم نہ ہو جائے۔ اب قبائل کو یہ مطمئن کرنا مشکل تھا کہ سلطان مراکش محض شاہ شطرنج ہے۔ اس کا ذاتی اقتدار کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کے پردے میں اسپین اور فرانس مراکش پر حکومت کر رہے ہیں اس لئے کہ حقیقت چاہے کچھ بھی کیوں نہ ہو، اسپین اور فرانس نے سلطان مراکش اور ان کے تخت کو باقی رکھا تھا اور خود سلطان بھی اپنی نام کی سلطانی پر قانع معلوم ہوتا تھا

بلکہ امیر عبدالکریم کی جنگی سرگرمیوں کے وہ بھی خلاف تھا، اس لئے کہ اسے یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ فرانسیسی انہی سرگرمیوں کو وجہ بنا کر اس کا تخت بھی اس سے نہ چھین لیں۔ چنانچہ سلطان مراکش اپنے حاشیہ نشینوں کے ذریعے امیر عبدالکریم کی مخالفت میں وہ سب کچھ کر رہا تھا جو سلطان وحیدالدین نے مصطفےٰ کمال کے خلاف کیا تھا۔ البتہ فرق اسقدر تھا کہ امیر عبدالکریم کو ذاتی حیثیت سے اہل ریف پر وہ اثر حاصل نہ تھا جو مصطفےٰ کمال کو اناطولیہ میں حاصل ہو گیا تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ فرانس اور سلطان کی پروپیگنڈا بازی کا امیر عبدالکریم کوئی موثر جواب نہ دے سکے۔ اہل قبائل رفتہ رفتہ اس پروپیگنڈے کا شکار ہوتے گئے اور سردیوں کا موسم ختم ہونے تک جب کہ جنگی سرگرمیاں دونوں طرف بند تھیں امیر عبدالکریم کی صفوں میں اس قدر ابتری پھیل گئی کہ اب ان کے لئے فرانس اور اسپین کی متحدہ طاقتوں کے مقابل ہونا ناممکن ہو گیا لیکن امیر عبدالکریم اب بھی میدان جنگ سے نہ ہٹے اور اپنے مٹھی بھر ہمراہیوں کے ساتھ اسی طرح جہاد پر جمے رہے۔

امیر عبدالکریم کا یہ عزم عملی نقطۂ نظر سے چاہے کتنا ہی مہلک سمجھا جائے لیکن اس میں کلام نہیں کہ یہ ایسا عزم تھا جو جس سے جس قوم کو بھی ایک مرتبہ اہل ریف کی ہمدردی پر مائل کر سکتا ہے۔ چنانچہ سارے عالم اسلام کی ہمدردیاں امیر عبدالکریم کے ساتھ تھیں۔ لیکن یہ اخلاقی ہمدردیاں تھیں اور اس وقت امیر عبدالکریم کو اس کی ضرورت تھی کہ کوئی ان کے ساتھ عملاً ہمدردی کا اظہار کرے۔

فروری ۱۹۲۶ء میں پھر فرانس اور اہل ریف کے درمیان معرکے شروع ہوئے۔ امیر عبدالکریم اپنے مٹھی بھر ساتھیوں کے ساتھ برابر

ایک جبار فوج کا مقابلہ کرتے رہے۔ اور فرانسیسیوں کو اپنی زبردست قوت کے باوجود یہ ہمت نہ ہوئی کہ امیر عبدالکریم کی طاقت کو توڑ دیتے۔ لیکن اب امیر عبدالکریم کی حالت ایک محصور امیر کی تھی۔ سب طرف سے یہ اسپین اور فرانس کی فوجوں سے گھرے ہوئے تھے اور خود ان کی فوج میں سے ہر روز کچھ نہ کچھ قبائل ٹوٹ کر علیحدہ ہوتے جاتے تھے۔ مئی ۱۹۲۶ء میں چالیس ہزار اہل قبائل کی فوج اور فرانس سے مل گئی اور فرانس کی طاقت امیر عبدالکریم کے مقابلہ میں دس گنا زیادہ ہو گئی یہ صورت ایسی تھی کہ امیر عبدالکریم فرانس سے مقابلہ جاری نہ رکھ سکے۔ اور خود امیر عبدالکریم کے مشیروں نے انھیں ہتھیار ڈال دینے کا مشورہ دیا اس لئے کہ اب مقابلہ کرنا خودکشی کرنے کے برابر تھا اور امیر عبدالکریم کے مشیر یہ نہیں چاہتے تھے کہ امیر عبدالکریم جوش جہاد میں اپنی جان بھی گنوا بیٹھیں۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ استخلاص وطن کی یہ ایک کوشش تھی جو ناکام رہی۔ لیکن آزادی کا بیج اہل ریف کے دل میں ڈالا جا چکا ہے۔ اس وقت اگر ہم اپنی شکست کو تسلیم کرلیں تب بھی کوئی حرج واقع نہیں ہوتا جب ہمارا موقع ہوگا اس وقت استخلاص وطن کی دوسری کوشش سے ہمیں کوئی روک نہیں سکتا۔ جو چیز اس وقت ضروری ہے وہ یہ کہ امیر عبدالکریم کی جان کسی طرح بچالی جائے۔ سو اس کے لئے امیر عبدالکریم کے مشیروں نے حکومت فرانس سے مراسلت کی اور جب حکومت فرانس نے یہ مان لیا کہ امیر عبدالکریم کی جان محفوظ رہے گی اور ان قبائل کو جنھوں نے امیر عبدالکریم کا ساتھ دیا ہے کوئی سزا نہیں دی جائے گی تو ۲۳۔ مئی ۱۹۲۶ء کو امیر عبدالکریم کی فوج نے ہتھیار ڈالدیے

امیر عبدالکریم نے "تازہ" میں اپنے آپ کو جنرل بوچیت کے حوالہ کر دیا جس نے امیر کا پورا پورا احترام ملحوظ رکھا۔ کچھ دنوں تازہ میں نظر بندی کے بعد حکومت فرانس نے امیر عبدالکریم کو جزیرہ مدغاسکر میں جلاوطن کر دیا۔ اور اس طرح اس فدائے حریت کی عملی سرگرمیوں کو یورپ کی دو زبردست سلطنتوں نے اپنی متحدہ طاقت سے ختم کر دیا۔ لیکن اُس روح کو یہ یورپین طاقتیں فنا نہ کرسکیں جو امیر عبدالکریم نے مراکش میں پیدا کردی تھی۔ چنانچہ آج بھی جبکہ امیر عبدالکریم جلاوطن ہیں۔ مراکش میں وہی رُوح کارفرما ہے، اور نہ صرف مراکش میں بلکہ الجزائر اور ٹیونس میں بھی رہ رہ کر آزادی کی لہریں اُٹھ رہی ہیں۔ جن سے فرانس کی کشتی ڈگمگا رہی ہے۔

مراکش ساتویں صدی عیسوی سے مسلمانوں کے زیر نگیں ہے اور یہاں کے قدیم باشندے بھی جنھیں یوروپین "بربر[1]" کہتے ہیں صدیوں سے مسلمان چلے آتے ہیں۔ اُنیسویں صدی عیسوی میں جب دول یوروپ نے اپنی قوت کے بل پر اپنے سیاسی اور اقتصادی مفاد کے پیش نظر شمالی افریقہ کو ایک سرے سے دوسرے تک آپس میں تقسیم کر لیا[2] تو مراکش اسپین اور فرانس کے حصے

---

[1] بعض محققین کی رائے ہے کہ بربر "بربیرین" کا مخفف ہے جسکے معنی "وحشی" کے ہیں۔ یہ نام اہل مراکش کو رومیوں نے دیا تھا اسوقت سے یہ لوگ بربر ہی مشہور ہو گئے۔

[2] جبل الطارق سے نہر سوئز تک کا شمالی افریقہ کا علاقہ فرانس، اسپین، اطالیہ اور برطانیہ کے درمیان تقسیم ہے۔ ریف اور مراکش کے چند اضلاع اسپین کے زیر اقتدار ہیں مراکش الجزائر اور ٹیونس فرانس کے زیر اثر ہیں۔ طرابلس اور لیبیا پر اٹلی کا تسلط ہے اور مصر پر برطانیہ قابض ہے

میں آیا۔ اسپین کا حصّہ بھی برائے نام ہے۔ اصلی قبضہ مراکش میں فرانس کا ہے اگرچہ اس وقت بھی مراکش میں ایک سلطان حکمراں ہے اور اس کا مذہبی اور سیاسی رُتبہ بھی بظاہر برقرار ہے۔ لیکن یہ سب دکھاوے کے لیئے ہے مراکش پر اصلی حکومت ریزیڈنٹ جنرل کی ہے جو فرانسیسی حکومت کی طرف سے وہاں متعین ہے اور والی مراکش سلطان محمد کا مشیر سمجھا جاتا ہے۔

مراکش کے قدیم بدوی قبائل (ریفی اور بربر) جو صدیوں سے دشوار گذار پہاڑوں میں آباد چلے آتے ہیں۔ بالطبع سرکش اور بغاوت پسند واقع ہوئے ہیں۔ اپنی یا پرائی کسی حکومت کا اقتدار وہ آسانی سے تسلیم نہیں کرتے اور جب موقع ملتا ہے اس کی اطاعت کا جُوا اپنے کندھوں سے اُتار پھینکتے ہیں۔ ساتویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کو اِن علاقوں کے فتح کرنے میں برسوں لڑنا پڑا لیکن پھر بھی اسلامی دَور کے ایکہزار سال میں یہ سرزمین ہمیشہ بغاوت گاہ بنی رہی۔

مراکش کے سلطان خاندان بنو ہاشم اور آنحضرت صلعم کی اولاد میں ہیں۔ اہل مراکش انھیں اپنا مذہبی پیشوا بھی مانتے ہیں اور ان کا احترام بھی بہت کرتے ہیں لیکن جب موقع ملتا ہے بغاوت ان کے خلاف بھی کرنے سے نہیں چوکتے اور ان کی بغاوت کا انداز بھی انوکھا ہوتا ہے۔ یہ سلطانی اقتدار کو اپنے علاقوں میں بے تکلف چیلنج بھی کرتے ہیں۔ سلطانی فوجوں سے ڈٹ کر مقابلہ بھی کرتے ہیں۔ لیکن نماز سے پہلے خطبہ میں سلطان کی درازئ عمر و اقبال کی دُعائیں بھی مانگتے ہیں۔ یہ سیرت ہے ان لوگوں کی جن پر فرانس اور اسپین اپنا اقتدار قائم رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں "کوشش" کا لفظ میں نے اس لئے استعمال کیا ہے کہ انتہائی جدوجہد کے باوجود سوائے ساحلی علاقوں کے فرانس

اور اسپین کو اب تک اندرونِ مراکش پر اقتدار حاصل نہیں ہو سکا۔ اور جن مقامات پر فرانس اور اسپین نے اپنی فوجی قوت کی نمائش سے اقتدار حاصل کر بھی لیا ہے وہاں بھی آئے دن انھیں شورشوں اور بغاوتوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ خصوصاً آج کل فرانس کے زیر اقتدار سارے علاقوں میں ٹیونس، الجیریا اور مراکش میں سخت بے چینی پیدا ہو گئی ہے۔ جو حکومت فرانس کے کمزور ہوتے ہی علانیہ بغاوت کی صورت اختیار کر لے تو تعجب نہیں۔

اس عام بے چینی کی ذمہ دار در اصل فرانس کی "مراکشی پالیسی" ہے۔ اقتدار مراکش میں اسپین بھی برقرار رکھنا چاہتا ہے اور اس کے لئے اسے برسوں ریف کے قبائل سے طویل لڑائیاں بھی لڑنی پڑیں۔ لیکن اس نے اپنی پالیسی میں شدت نہ پیدا ہونے دی، جس کے باعث اہل ریف کو اس کے اقتدار سے تو اختلاف ہے لیکن اہل اسپین سے انھیں نفرت نہیں بر خلاف اس کے فرانسیسیوں کے خلاف اہل مراکش میں سخت نفرت پیدا ہو گئی ہے۔ اور محض اس وجہ سے کہ فرانس نے مراکش میں انتہائی سخت اور دہشت انگیز رویہ اختیار کر رکھا ہے ایسا جسے کوئی خود دار قوم برداشت نہیں کر سکتی۔ اسی کے ساتھ انھوں نے مراکش کے عرب اور بربر قبائل کو بھی ایک دوسرے سے علیحدہ علیحدہ کر دیا ہے۔ اور کوشش یہ کر رہے ہیں کہ بربر قبائل اسلام کے اثر سے الگ ہو کر عیسائیت کے آغوش میں آ جائیں۔ چنانچہ اس وقت مراکش کے عرب اور بربر میں زیادہ تر فرانس کی اسی ناپاک حرکت کے باعث بے چینی پیدا ہو گئی ہے اور قوم پرست نوجوان اب علانیہ فرانسیسی حکومت کی مخالفت پر اتر آئے ہیں۔

مراکش پر اپنا اقتدار قائم رکھنے کی جو تدابیر حکومت فرانس نے اختیار

لیکن ان سب سے موثر تدبیر یہ تھی کہ رفتہ رفتہ حکومت فرانس اور سلطان کو ذاتی طور پر اس قدر روپیہ قرض دیدیا کہ وہ اس کا ہر سال سُود بھی ادا نہ کرسکیں اور پھر اسی کو بہانہ بناکر فرانس نے مراکش کے سارے نظم و نسق پر قبضہ کرلیا۔ اور نظم و نسق پر قبضہ کرنے کے بعد بجٹ کی تقسیم اس طرح کی کہ کل آمدنی کا تقریباً نصف مراکش کی فرانسیسی فوجوں کے اخراجات کیلئے وقف کردیا۔ بیس فی صدی کا خرچ تعلیم کے لئے تجویز کیا اور اس بیس فی صدی میں سے سولہ فی صدی یوروپین اسکولوں اور فرانسیسی زبان کی نشرواشاعت کیلئے علیحدہ کردیا اور صرف چار فیصدی خرچ عربی مدارس کا منظور کیا۔ باقی تیس فیصدی مراکش کے پورے نظم و نسق کے خرچ کیلئے چھوڑدیئے۔

دوسری تدبیر حکومت فرانس نے اہل مراکش کو اپنے اثر میں رکھنے کیلئے یہ اختیار کی کہ مراکش کے عربوں اور قدیم باشندوں میں پھوٹ ڈالدی اہل مراکش خواہ وہ عرب ہوں یا بربر صدیوں سے مسلمان چلے آتے ہیں اور اسلامی روایات کے پابند بھی ہیں۔ لیکن دُور دراز کے پہاڑوں میں چند بربر قبائل ایسے بھی ہیں جو مسلمان ہونے کے باوجود اپنی قدیم بربر رسوم کی بھی آزادی سے نمائش کرتے رہتے ہیں ان کی اسی نمائش کو بہانہ بناکر حکومت فرانس نے عرب اور غیر عرب، مسلمان اور غیر مسلمان کی حکماً تقسیم کردی اور بربروں کو اسلامی قانون کی پابندی سے آزاد کرکے اپنے قدیم بربر رسوم کا پابند بنادیا۔ اور جو بربر اپنے قدیم رسوم کو اختیار نہ کرنا چاہتے تھے ان میں زور شور سے عیسائیت کی تبلیغ شروع کردی اور انھیں عیسائی طرز معاشرت اختیار کرنے پر مجبور کردیا۔ اسلامی مبلغین کو بربر علاقوں میں جانے تک کی ممانعت کردی۔ معمولی مسافروں کے لئے بھی پاسپورٹ کی قید لگادی۔ بربر کے علاقے

میں مسجدوں کی تعمیر عملاً بند کردی۔ عربی مدارس توڑ دیئے۔ عربی زبان بربروں کیلئے ممنوع قرار دیدی۔ فرانسیسی زبان سیکھنا لازمی قرار دیا۔ مراکش کے قاضی اور قائدوں کی عدالتوں کے دروازے بربروں پر بند کردیئے۔ ان کے بجائے فرانسیسی عدالتیں ان کے لئے مقرر کی گئیں۔ یہ ساری کارروائی اس نام سے کی گئی کہ فرانسیسی مراکش کے قدیم باشندوں کو "عربوں کے استبداد" سے آزاد کررہے ہیں۔ اور ان کی اپنی انفرادیت کو نمایاں ہونے کا موقع دے رہے ہیں اور یہ ثابت کرنے کے لئے کہ ان کی اس حکمت عملی کو خود بربر بھی پسند کرتے ہیں فرانسیسی حکام نے بربر علاقے سے ایک وفد اپنے حضور میں طلب کیا اور اس وفد کو ہدایت کی کہ وہ فرانس کی اس پالیسی کا شکریہ ادا کرے اور حکومت فرانس سے اپنی عقیدت کا اعلان کرے لیکن جب اس وفد نے ان دونوں باتوں کے ماننے سے انکار کردیا اور اس کے برخلاف حکومت فرانس سے یہ مطالبہ کیا کہ انھیں مسلمان سمجھا جائے ان پر فقہ اسلامی کی رُو سے حکومت کی جائے تو فرانسیسی حکام اس قدر برافروختہ ہوئے کہ وفد کے سارے ممبروں کو قید کرکے جیل میں ڈال دیا۔[1]

بربروں کے متعلق فرانس کی اصلی پالیسی پر مارشل لایوتی کے اُس سرکاری گشتی حکم سے بخوبی روشنی پڑتی ہے۔ جو اس نے مراکش کے سارے فرانسیسی حکام کے نام جاری کیا تھا اور جس پر اس وقت تک برابر عمل کیا جارہا ہے۔ اس گشتی حکم میں مارشل لایوتی لکھتا ہے:۔

"ہمارے سیاسی اور اقتصادی مفاد کے لئے یہ بہت ضروری

---

[1] جرنل آف سنٹرل ایشین سوسائٹی۔

ہے کہ ہم بربروں کو اسلامی "حدود" سے باہر رکھیں اور اپنے قوانین
اور طرز معاشرت کا عادی بنائیں"

اسی سلسلہ میں ایک اور فرانسیسی افسر ایم سیکرڈ کی رائے بھی پڑھنے
کے قابل ہے جو اس نے اپنی کتاب "The Muslim world in French Possession" میں لکھی ہے یہ افسر مدت تک سلطانِ
مراکش کے اسٹاف میں حکومت فرانس کی طرف سے بطور مشیر رہ چکا ہے.
اپنی کتاب میں مراکش میں فرانسیسی پالیسی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتا ہے:-

"اسلام کی بنیادی تعلیمات چونکہ ہمارے اغراض و مقاصد
کے خلاف ایک زبردست طاقت ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ
جس طرح ممکن ہو سکتا ہے ہم اپنی رعایا میں اس کی تبلیغ و اشاعت
کو رد کرتے ہیں"

اسی پالیسی کو بنیاد قرار دیکر فرانس نے بربروں کی تعلیم کو اپنے
ذمے لے لیا۔ اس لئے کہ بربروں میں سے اسلامی روایات کو بھلانے
کا تعلیم سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا تھا۔ ایم لاگلے مراکش کا فرانسیسی
مشیر تعلیم بربر بچوں کیلئے نئے اسکول تجویز کرتا ہوا لکھتا ہے:-

"ان مدرسوں میں عربی زبان نہ پڑھائی جائے۔ اور نہ مذہبی
تعلیم دی جائے بلکہ بربر زبان کو رومن رسم الخط میں سکھایا جائے.
بہرحال بربروں کو جو چاہو پڑھاؤ لیکن عربی زبان نہ سکھاؤ۔
اور نہ اسلام کے اصولوں سے واقف ہونے کا موقع دو"

چنانچہ "آزرو" میں بربر مدرسوں کے لئے فرانس نے جو ٹریننگ
اسکول قائم کیا تھا اس میں اس پالیسی پر پورا پورا عمل کیا۔

- - - - - - - - - - - اس اسکول سے جو بربر مدرس
تعلیم کے بعد باہر آتا تھا وہ اسلام اور اسلامی روایات سے زیادہ عیسائیت
اور فرانسیسی روایات سے واقف ہوا کرتا تھا۔

بربروں کو عربوں سے [illegible]ڑ لینے کی کوشش میں فرانس کو اس حد تک
ضرور کامیابی ہوگئی تھی کہ بربر مدرسوں اور بربروں کے علاقوں سے اسلامی
تعلیمات کے اثر کو زائل کر [illegible] گیا تھا لیکن سنہ ۱۹۳۰ء تک وہ بربروں کو اسلامی
حدود سے خارج نہ کر سکے اس کی وجہ یہ تھی کہ مولائے یوسف سلطان مراکش
اگرچہ کافی کمزور حاکم تھے لیکن اس پر وہ کسی طرح راضی نہ ہوئے کہ بربروں کو
اسلامی حدود سے خارج کر دیں۔ ۱۶ مئی سنہ ۱۹۳۰ء کو مولائے یوسف کا
انتقال ہوگیا اور ان کی جگہ ان کا لڑکا سدّی محمد مراکش کے تخت پر آیا۔
اس وقت فرانس کی دیرینہ آرزو بر آئی۔ سدّی محمد نے تخت نشین ہوتے ہی
حکومت فرانس کی خواہش کے مطابق ایک فرمان دیا کہ مراکش کے قدیم باشندے
جو بربر رسوم کے پابند ہیں وہ اسلامی حدود سے خارج کئے جاتے ہیں۔ اس
کا صادر ہونا تھا کہ سارے بربر علاقے میں بے چینی پیدا ہوگئی۔ اس لئے کہ
بربر بہر حال مسلمان تھے۔ اور مسلمانوں کے لئے شریعت اسلام کی پابندی
ضروری تھی لیکن اس فرمان کے بعد صورت یہ ہوگئی کہ ایک عرب اور ایک بربر
کی دیوانی مقدمہ بازی میں بجائے قانون شریعت کے فرانسیسی قانون نافذ
ہونے لگا، اس لئے کہ بربر پر شریعت اسلام کی اور عرب پر بربر رسم و رواج کی پابندی
ضروری نہیں تھی۔ پھر سوائے فرانسیسی قانون کے ایسا قانون اور کونسا ہو سکتا
تھا جو دونوں قوموں پر منطبق ہو سکے۔ اس فرمان کے بعد گویا فرانس کو مراکش کی
اسلامی انفرادیت کو پاش پاش کرنے کا موقع مل گیا اور اس سے انھوں نے

پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

"گادفرے ڈیمن بائن" ایک اور فرانسیسی افسر جو مراکش کی رزیڈنسی میں مقیم تھا اس پالیسی کے متعلق لکھتا ہے:۔

"اس پالیسی کا مفہوم یہ ہے کہ بربروں کو مصر [illegible] پر عربوں سے جدا کر دیا جائے۔ اور اس کے بعد انھیں آہستہ آہستہ عیسائیت کے ماحول کا عادی بنا دیا جائے"۔

چنانچہ بربروں کو عیسائیت سے مانوس کرنے کا کام بھی اس فرمان کے بعد ہی پورے جوش و خروش سے جاری ہو گیا۔ اسلامی مبلغین پر بربر علاقے کے دروازے بند ہو گئے اور عیسائی مبلغین جوق جوق اس علاقے میں پہونچنے لگے اور انھوں نے عیسائی مذہب کی تبلیغ شروع کر دی۔ بربر رئیسوں کو اپنے خرچ سے مسجد و نئی تعمیر سے روک دیا گیا اور اس کے برخلاف ان پر عیسائی تبلیغ کا ٹیکس لگا دیا گیا۔ "لاسیلے" ایک فرانسیسی سولین فرانس کی مراکشی پالیسی پر روشنی ڈالتا ہوا لکھتا ہے:۔

"عیسائی مبلغین کو بربر علاقے میں تبلیغ کی مکمل آزادی ہوگی جو عربوں اور اسلام کی طاقت کو شمالی افریقہ میں کمزور کر دے گی، اور ہماری قوم اور ہماری تہذیب کو عام کرنے میں مدد دے گی"۔

سلطان مراکش کے اس فرمان کے خلاف سارے ملک میں احتجاجی مظاہرے ہوئے اور ان مظاہروں میں بربر اور عرب برابر کے شریک تھے۔ ان مظاہروں کو روکنے کیلئے فیض، رباط سیلے میں فرانسیسیوں کو متعدد مظاہرین پر گولیاں چلانی پڑیں۔ کئی وفد سلطان مراکش کی حضور میں باریابی کی تمنا رکھتے تھے۔

لیکن فرانسیسی حکام نے ان کو سلطان کی خدمت میں باریاب نہ ہونے دیا۔ البتہ ایک وفد سلطان کے حضور میں پہونچ سکا جسکی قیادت سدی عبدالرحمٰن القریش سابق وزیر انصاف مراکش نے کی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ جسوقت سدی عبدالرحمٰن نے اپنے وفد کے خیالات کی ترجمانی کی تو سدی محمد سلطان مراکش کے آنسو جاری ہو گئے۔ لیکن غریب سلطان اسقدر بے بس تھا کہ اس قدر متاثر ہونے کے باوجود وفد کی درخواست منظور نہ کر سکا۔ وفد بے نیل و مرام واپس گیا بلکہ فرانسیسیوں نے اس وفد کے چند نمائندوں کو جو اوروں سے زیادہ جذباتی تھے خواہ مخواہ کا الزام رکھکر گرفتار کر لیا۔

لیکن فرانس کے اس تشدد کے باوجود پبلک مظاہروں میں کوئی کمی نہیں ہوئی اور بربروں میں برابر بے چینی بڑھتی ہی گئی۔ لاتعداد عرب اور بربر فرانسیسی جیلوں میں بھر دیئے گئے۔ سیکڑوں فرانسیسیوں کی گولیوں سے شہید ہو گئے اور بیسیوں عرب اور بربر لیڈر جلا وطن کر دیئے گئے۔ لیکن مظاہروں میں کوئی کمی نہ ہونی تھی نہ ہوئی۔ آخر مجبور ہو کر فرانس کے رزیڈنٹ کو یہ اعلان کرنا پڑا کہ :-

"جو بربر قبائل اسلامی شریعت کی پابندی کرنی چاہتے ہیں وہ کر سکتے ہیں ان کے لئے "قاضی" کا فیصلہ جائز ہوگا۔"

لیکن یہ اعلان برائے نام تھا۔ فرانسیسی حکام اس کے بعد بھی کوشش یہی کرتے رہے کہ بربر قبائل اسلامی حدود میں نہ جانے پائیں۔

فرانس کی تعلیمی پالیسی کا ایک رخ پچھلے اوراق میں دکھایا جا چکا ہے۔ دوسرا رخ یہ ہے کہ مراکش میں تعلیم کا معیار صرف یہ ہونا چاہیئے کہ حکومت فرانس کو اپنی نوآبادی کے لئے اچھے مقامی کلرک اور بابو مل سکیں۔ چنانچہ سارے

مراکش میں صرف دو ثانوی اسکول ہیں ایک فیض میں دوسرا رباط میں اور صرف تین ابتدائی مدارس ہیں جن میں فرانسیسی زبان ذریعہ تعلیم ہے اور عربی کیلئے برائے نام ہفتے میں دو گھنٹے مقرر کئے گئے ہیں۔

مشرقی علوم کی تعلیم کیلئے قدیم سے فیض میں ایک یونیورسٹی قائم چلی آتی ہے۔ فرانسیسیوں نے اس کو باقی رہنے دیا ہے۔ البتہ یہ احتیاط برتی ہے کہ اس یونیورسٹی میں کوئی بہت ذہین اور انقلابی اصول کا پروفیسر نہ رکھا جائے۔ اس طرح کے جو دو چار پروفیسر تھے بھی وہ بھی رزیڈنٹ کے اشارے سے سیاسی وجوہ کی بنا پر علحدہ کئے جا چکے ہیں۔ یہ یونیورسٹی ابتک اس لئے قائم چلی آتی ہے کہ اس کے اخراجات کے لئے صدیوں سے ایک وقف بھی موجود ہے۔ جس کی آمدنی کا ایک حصّہ حکومت وصول کر لیتی ہے اور باقی یونیورسٹی کیلئے چھوڑ دیتی ہے۔

مراکش کے نوجوانوں کو یوروپ جاکر اعلیٰ تعلیم کی تکمیل سے باز رکھنے کی پوری پوری کوشش کی جاتی ہے۔ یوروپین تعلیم کے مضرات کا خوب خوب پروپگنڈا کیا جاتا ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے خواہش مند لڑکوں کے والدین پر زور ڈالا جاتا ہے کہ وہ اپنے لڑکوں کو یوروپ نہ بھیجیں اور جب اس پر بھی کوئی نہیں مانتا تو خواہ مخواہ پاسپورٹ دینے میں دیر لگائی جاتی ہے اور عموماً یہ دیر اتنی ہوتی ہے کہ یوروپ کی یونیورسٹیوں کے داخلے کا زمانہ گذر جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ ان طالبعلموں کا ایک سال مفت میں ضائع ہو جاتا ہے لیکن اس کے برخلاف مراکش کے یوروپین طالب علموں کو ہر سال اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کے لئے مراکش کے بجٹ سے وظائف منظور کئے جاتے ہیں۔ اور یوروپ جانے میں ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچائی جاتی ہیں۔

خانگی مدارس جن میں چھوٹے بچوں کیلئے قرآن شریف اور دینیات کی ابتدائی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں مراکش میں بکثرت پائے جاتے تھے۔ لیکن فرانسیسیوں کے انتداب کے بعد ان کی تعداد حیرت انگیز طور پر کم ہونی شروع ہو گئی۔ اسلئے کہ ایسے مدرسوں کے متعدد مولوی صاحبان "سیاسی وجوہ" سے ملک بدر کر دیئے گئے اور مدرسوں میں تالے ڈال دیئے گئے۔

اسی کے ساتھ حکم یہ ہے کہ اس طرح کا اگر کوئی مدرسہ بند ہو جائے تو اس کی جگہ دوسرا نہیں کھولا جا سکتا۔ ظاہر ہے کہ جب قرآنی مدرسوں کے مولوی صاحبان "سیاسی وجوہ" کی بنا پر نکالے جاتے رہیں گے تو مدرسے خواہ مخواہ بند ہوتے چلے جائیں گے۔ اور جب ان کی جگہ کوئی دوسرا مدرسہ قائم نہ ہو سکے گا تو مدرسوں کی تعداد اپنے آپ کم ہو جائے گی۔ صرف شہر فیض میں ۱۹۱۲ء میں دو سو سے اوپر قرآنی مدرسے تھے۔ لیکن آج ان کی تعداد پوری ایک سو بھی نہیں ہے۔ فرانس کی اس تعلیمی پالیسی کے باعث مراکش، ٹیونس اور الجزائر میں پڑھے لکھے اور جوشیلے نوجوانوں کی ایسی سوسائیٹیاں قائم ہو گئی ہیں جو عواقب و نتائج سے بے پرواہ ہو کر فرانس کے خلاف ایجی ٹیشن کر رہی ہیں اور اس ایجی ٹیشن کو عوام کی ہمدردیوں سے بہت زیادہ تقویت حاصل ہوتی جا رہی ہے۔

فرانس کی دوسری قابل اعتراض حرکتوں میں سے ایک حرکت یہ بھی ہے کہ مراکش میں وہ فرانسیسیوں کی نو آبادی بسانے کی کوشش کر رہا ہے اور چھانٹ چھانٹ کر اچھی اور زرخیز زمینیں فرانسیسیوں کو برائے نام قیمت پر بانٹ رہی ہے۔

جو زمینیں حکومت مراکش کی ملک ہیں وہ تو ایک فرمان کے ذریعے فرانس

نوآباد کاروں کیلئے وقف کی جاچکی ہیں ۔ لیکن نجی زمینیں بھی عربوں اور بربروں کے پاس محفوظ نہیں ہیں جو زرخیز زمین کسی مالدار فرانسیسی کی نظر چڑھ جاتی ہے وہ مالک کی رضامندی یا بغیر رضامندی بہرحال اس کا سودا کرلیتا ہے ۔ اور زمین کے اصلی مالک کو اس کے سوا چارہ نہیں ہوتا کہ فرانسیسی آباد کار زمین کے جو دام اس کے حوالے کرے وہ چُپ چاپ قبول کرلے ۔

اس طرح کی خرید و فروخت عموماً فرانسیسی عدالتوں میں ہوا کرتی ہے ۔ اگر کوئی عرب یا بربر اس قدر خوش قسمت نہیں ہے کہ کسی یورو پین وکیل کو اپنی طرف سے عدالت میں پیش کرے تو اس کی زمین جو تقریباً دس ہزار فرانک کی مالیت کی ہوگی ایک ہزار یا حد سے حد ڈیڑھ ہزار فرانک میں فرانسیسی نوآباد کار کے نام رجسٹر ہو جائے گی ۔ لیکن اگر اس موقع پر معقول فیس دیکر اس نے کوئی یورو پین وکیل کر لیا تو اس کو مالیت کے لگ بھگ دام مل جاتے ہیں ۔ لیکن وکیل صاحب کی فیس اتنی ہوتی ہے کہ اسے ادا کرنے کے بعد اس سے زیادہ اس غریب کے پلے نہیں پڑتا جو بغیر وکیل کے اپنی زمین کے فروخت کر دینے کی صورت میں اسے مل سکتا تھا ۔

زمین حاصل کرنے کی یہ تو بہرحال قانونی صورت تھی اس کے علاوہ ایک صورت اور ہے جو فرانسیسی نوآباد کار عموماً اختیار کر جاتے ہیں ۔ اور ان سے کوئی سرکاری باز پُرس نہیں ہوتی وہ یہ کہ شہروں سے دور کسی علاقہ میں اگر کوئی زمین کسی فرانسیسی کے پسند آگئی اور جس قبیلے کی وہ زمین ہے اس نے فرانسیسی کے ہاتھ اسے بیچنے سے انکار کر دیا یا دام اتنے بتلائے کہ فرانسیسی نہ دے سکا تو اس صورت میں وہ فرانسیسی عموماً یہ [illegible] کہ رات کو [illegible] ڈنکا [illegible] لگا کر

اُڑا دیتا ہے اور اس طرح جب زمین کی شکل بدل جاتی ہے تو اسے فرانسیسی عدالت میں چپکے سے اپنے نام رجسٹر کرا لیتا ہے اور غریب بربر جو اس زمین کا اصلی وارث ہوتا ہے اکثر صورتوں میں سرپیٹ کر بیٹھ جاتا ہے۔ اس لئے کہ اپنے دعوے میں جو کاغذات وہ پیش کرتا ہے ان سے زمین کی موجودہ حالت مطابق نہیں ہوتی اور یہ وہ ثابت نہیں کرسکتا کہ یہ حلیہ زمین کا بگڑا ہوا ہے یا بگاڑا گیا ہے۔ بعض اوقات بربروں کو یہ ثابت کرنے میں کامیابی ہوجاتی ہے کہ زمین فی الحقیقت انہی کی ہے اس صورت میں عموماً مقدمہ آپس کی صلح صفائی پر ختم ہوجاتا ہے۔ فرانس کی اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہے کہ مراکش کے چھوٹے چھوٹے زمیندار اور کسان تباہ ہوتے جارہے ہیں جو زمیندار بڑے ہیں انھیں بھاری بھاری ٹیکسوں نے مار رکھا ہے، مراکش کی اس حالت کو دیکھکر بعض یوروپین محققین کی یہ رائے ہے کہ اگر فرانس نے اپنی پالیسی نہ بدلی تو مراکش میں اشتراکی اصول جڑ پکڑ جائے گی اور آیندہ جو ایجی ٹیشن ہونگے وہ اشتراکی اصول پر ہوں گے۔

مراکش میں فرانسیسی ٹیکسوں کی یہ حالت ہے کہ کھانے پینے تک کی کوئی جنس مقامی ٹیکسوں سے بچی ہوئی نہیں ہے۔ روزانہ فرانسیسی عدالتوں میں سیکڑوں مراکشی اس جرم میں پیش ہوتے ہیں کہ انھوں نے ٹیکس ادا نہیں کیا اور یہ مراکشی عموماً وہی ہوتے ہیں جو ٹیکس ادا کرنیکی مقدرت نہیں رکھتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عدالتیں انھیں سزائیں دے دیکر دوسروں کیلئے "عبرت" کا سامان پیدا کردیتی ہیں۔ اکثر قبائل جو ٹیکس ادا نہیں کرسکتے انھیں فرانسیسی

یہ سزا دیتے ہیں کہ جب تک وہ ٹیکس ادا نہ کریں اس قبیلے کے نوجوان شادی نہ کرنے پائیں۔

مراکش میں غربت و افلاس کا یہ حال ہے کہ چائے جو اور ممالک میں بطور تفریح پی جاتی ہے۔ مراکش میں بطور غذا استعمال ہوتی ہے۔ مراکش کی چائے سبز ہوتی ہے اور اس چائے کے ساتھ مراکشی کچھ اور جڑی بوٹیوں کو بھی شامل کر کے جوش دیتے ہیں اور روٹی کے ٹکڑے کے ساتھ اس جوشاندے کی ایک پیالی پی کر اپنے پیٹ بھر لیا کرتے ہیں۔ آج مراکش میں سیکڑوں گھرانے ایسے ہیں جنکی برسوں سے یہی غذا ہے، اور جو غریب روٹی سالن کو ترس گئے ہیں۔

ان سب پر مستزاد یہ کہ مراکشیوں کو تحریر اور تقریر کی مطلق آزادی حاصل نہیں۔ مراکش میں نہ کوئی ڈھنگ کا عربی اخبار ہے اور نہ فرانسیسی۔ مدت سے ایک نیم سرکاری اخبار "سعادۃ" نکل رہا ہے اسی کو مراکش کا قومی اخبار سمجھ لیجئے۔

کچھ دنوں پہلے ایک آزاد فرانسیسی اخبار "کیرے بوئے" نامی ایک حق گو فرانسیسی کی زیر ادارت نکلا کرتا تھا لیکن فرانسیسی حکومت نے اس کو بھی برداشت نہیں کیا۔ کیرے بوے کو پہلے تو حق گوئی کے جرم میں مراکش سے جلاوطن کر دیا۔ اس کے بعد ہمیشہ کیلئے اس کا اخبار بند کر دیا اس وقت سے کسی فرانسیسی کو بھی کوئی اخبار نکالنے کی اجازت نہیں ملتی۔ نہ صرف اخبار کی اجازت نہیں دی جاتی بلکہ باہر کے جو مسافر مراکش میں آتے ہیں ان پر بھی فرانسیسی حکومت کی طرف سے سخت نگرانی رکھی جاتی ہے۔ اسی کے ساتھ فرانس کا جب کوئی بڑا حاکم مراکش کے دورے پر آتا ہے تو مراکش کے ان لوگوں کو جن کے متعلق فرانسیسی افسروں کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ یہ اس حاکم تک اپنی شکایتیں پہونچا دینگے، جیل کے سے نظر بند کر کے دور دراز علاقوں میں بھیج دیا جاتا ہے۔ خط اور تار بھی اگر مراکشی یوروپ کے کسی ملک میں بھیجتے ہیں تو سنسر ہوئے بغیر نہیں جا سکتے اور بعض اوقات

یہ ہوتا ہے کہ کسی خط یا تار میں اگر فرانسیسی حکام کی شکایت ہوتی ہے تو وہ اپنی منزلِ مقصود پر پہونچتے ہی نہیں۔

موسیو لوسئین سنت مراکشی ریزیڈنٹ جنرل کی طرف سے کچھ دنوں پہلے ایک حکم یا آرڈی ننس نافذ ہوا تھا جس کی ایک دلچسپ دفعہ یہ تھی:۔

"جو شخص فرانسیسی نظم ونسق کے خلاف پبلک میں یا پرائیویٹ صحبت میں تقریراً یا تحریراً یا اپنے انداز اور عمل سے نفرت پیدا کرنے کی کوشش کریگا اسے دو مہینے سے تین برس تک کی سزائے قید اور ایکسو فرینک سے تین ہزار فرینک تک کی سزائے جرمانہ دیجائیگی۔"

کسی حکومت کے خلاف علانیہ بغاوت پھیلانے کو جرم قرار دینا تو بیشک سمجھ میں آسکتا ہے، لیکن پرائیویٹ صحبتوں میں حکومت کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرنے پر کسی شخص کو قابل تعزیر قرار دینا حکومت فرانس کی ایسی جسارت ہے جسکی نظیر یقیناً کسی مہذب ملک میں نہیں مل سکتی۔ اسی پر بس نہیں اس آرڈی ننس کے کچھ دنوں بعد ایک اور آرڈی ننس شائع ہوتا ہے اور اس آرڈی ننس میں وہ کسر بھی پوری کر دی جاتی ہے جو اس میں باقی رہ گئی تھی، حکم ہوتا ہے:۔

"جو شخص حکومت فرانس کی پالیسی پر نکتہ چینی کریگا مجرم ثابت ہوگا اسے دو برس کیلئے نظر بندی یا جلاوطنی کی سزا دی جائے گی۔"

پہلے حکم میں "نفرت پیدا کرنیکی کوشش" کا پردہ بھی تھا لیکن دوسرے حکم میں یہ پردہ بھی اُٹھا دیا گیا اور حکومت کے خلاف ہر قسم کی نکتہ چینی کو جرم قرار دیدیا گیا۔ اس اعلان کے بعد ظاہر ہے کہ کوئی سیاسی جماعت مراکش میں نہیں بن سکتی۔ اور نہ مراکشیوں کو یہ آزادی مل سکتی ہے کہ فرانسیسی حکومت کے خلاف اپنی آواز آئینی طور پر بھی اُٹھا سکیں۔ ان اعلانوں کے ساتھ ساتھ مراکشیوں کی آزاد خیالی

کو کچلنے کی ایک اور ترکیب بھی فرانس کے پاس ہے۔ عام پولیس کے علاوہ ایک اور قسم کی پولیس بھی مراکش میں پائی جاتی ہے جسے "سیاسی پولیس" کا نام دیا گیا ہے اس پولیس کا کام یہ ہے کہ وہ مراکش کے پڑھے لکھے افراد کی نگرانی کرے اور انکی سرگرمیوں سے فرانس کے محکمہ سی۔ آئی۔ ڈی کو مطلع رکھے۔ اس پولیس نے ۱۹۳۲ء میں فیض کی مشرقی یونیورسٹی کے تین طالبعلموں کے سیاسی خیالات کے متعلق رپورٹ کی۔ یہ یونیورسٹی اگرچہ فرانسیسی نظم و نسق کے ماتحت نہیں ہے تاہم حکومت فرانس نے اس رپورٹ پر فوراً عملی قدم اٹھایا اور اس یونیورسٹی کی کونسل کو یہ ہدایت کی کہ جب تک یہ طالب علم اپنے سیاسی خیالات کے متعلق تحریری معافی نامہ نہ پیش کریں انھیں تکمیل تعلیم کی سند نہ دی جائے۔ چنانچہ ۱۵۔ دسمبر ۱۹۳۲ء کو کونسل کا اجلاس ہوا جس کے آگے یہ تینوں طالب علم پیش ہوئے۔ کونسل نے ان کے آگے ایک اقرار نامہ رکھا اور انھیں یہ حکم دیا کہ اگر وہ سند لینی چاہتے ہوں تو اس اقرار نامے پر دستخط کر دیں۔ اس اقرار نامہ کا مضمون یہ تھا:۔

"بربروں کے متعلق سرکاری فرمان پر میں نے جس انداز سے احتجاج کیا تھا اس کا مجھے سخت افسوس ہے یہ بات حقیقتاً مجھے زیب نہیں دیتی تھی میں اپنے اس طرز عمل کی معافی چاہتا ہوں اور اقرار کرتا ہوں کہ میں آئندہ پھر ایسی کوئی حرکت نہ کرونگا اور حکومت کے سارے احکام کی بلا عذر تعمیل کرونگا۔"

یہ طالب علم جن کے آگے یہ اقرار نامہ پیش کیا تھا ان کے نام یہ تھے۔ محمد علی الفاسی براہیم القطنی اور عبدالعزیز۔ ان تینوں نے اس انسانیت سوز اقرار نامہ پر دستخط کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں یونیورسٹی کی سندیں نہ مل سکیں۔ اور آج یہ تینوں طالبعلم عوام کے لیڈر اور خطرناک ایجی ٹیٹر سمجھے جاتے ہیں، جن پر رات دن فرانسیسی سی۔ آئی۔ ڈی مسلط ہے۔

مراکش میں فرانسیسی انداز حکومت کا یہ بہت سرسری سا خاکہ ہے اور اس لئے پیش کیا گیا ہے کہ مراکشیوں کے ان ایجی ٹیشنوں، شورشوں اور بغاوتوں کے اسباب کو سمجھنے کا موقع ملے جو آئے دن وہاں ہوتی رہتی ہیں۔

مراکش کا جو علاقہ اسپین کے پاس ہے اس پر سلطان مراکش کا ایک خلیفہ مقرر ہے جو حکومت اسپین کی ہدایت کے مطابق وہاں حکومت کرتا ہے۔ پالیسی حکومتِ اسپین کی بھی یہی ہے کہ مراکش پر اقتدار قائم رکھا جائے۔ لیکن فرانسیسی اور اسپینی علاقے میں فرق صرف اس قدر ہے کہ وہاں آزادیٔ رائے پر ایسی زبردست پابندیاں عائد نہیں ہیں اور نہ حکومت پر نکتہ چینی کے جواب میں وہاں کسی کو جیل میں ٹھونس دیا جاتا ہے۔ تعلیمی پالیسی میں بھی اختلاف ہے اور نوآبادکاروں کی پالیسی بھی اسپین کی ایسی نہیں جیسی فرانس کی ہے۔ اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ اسپین ابتک مراکش کے علاقے میں اپنی نوآبادی قائم نہ کر سکا۔ البتہ مراکشیوں میں اسپین فرانس سے بہتر تسلیم کیا جاتا ہے۔ بلکہ حال میں اسپین میں جو خانہ جنگی ہوئی تھی اس میں مراکش کے عرب جنرل فرنیکو کے جھنڈے کے نیچے لڑے تھے۔ اس وعدے کے ساتھ کہ جنرل فرنیکو کو فتح ہو گی تو مراکش کے اسپینی علاقے کو خود اختیاری حکومت دیدی جائے گی۔ اور اب جبکہ فرنیکو اسپین میں حکومت قائم کر چکا ہے مراکش کی خود اختیاری حکومت کا مسئلہ زیر غور ہے، اور امیر عبدالکریم کی رہائی کا بھی امکان پیدا ہو گیا ہے۔

بہر حال مراکش کے اسپینی اور فرانسیسی علاقوں میں اب آزادی کی فضا پیدا ہو گئی ہے۔ اسپین خانہ جنگی سے تھک چکا ہے اور فرانس اس وقت جرمنی سے الجھا ہوا ہے۔ ایسی صورت میں مراکش کو اب زیادہ دنوں اپنے قبضے میں رکھنا نہ اسپین سے ہو سکتا ہے اور نہ فرانس کے بس کا ہے۔ آثار

یہ ہیں کہ یہ علاقہ بہر حال آزاد ہو گا۔ اگر ہنسی خوشی اس علاقے کو آزاد نہیں کیا گیا تو ظاہر ہے کہ خون خرابے ہوں گے، اور اس معاملے میں بھی مراکش کے عرب اور بربر یقیناً پیچھے نہیں ہیں ✦
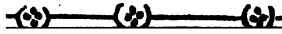
ہماری کتابیں

کنول (اعظم کریوی) چمنستان اردو کا وہ باغیچہ ہے جسمیں بیلا، چنبیلی اور موتیا جیسے پھول کھلے ہوئے ہیں ان پھولوں کی نفاست، سادگی اور بیرنگی ہی ہزاروں رنگینیوں کی جان ہے قیمت (عہ) ۱۲

سادہ اور رنگین افسانے محض چند معیاری افسانوں کا مجموعہ نہیں بلکہ ادب اردو کے جمود اور رجعت پسندی کے خلاف ایک کوشش بلیغ ہے اسکے مصنف ظفر قریشی ہیں جنکے جدت پسند دماغ کا یہ نتیجہ ہے عہ

خانقاہ! ایم اسلم کے بہترین جدید افسانوں کا مجموعہ جو ہر حیثیت سے قابل دید ہے۔ عہ ۱۲

لیلیٰ کے خطوط (مصنفہ قاضی عبدالغفار) چمنستان ادب کا وہ پھول جس کے رنگ و بو کو زوال نہیں۔ ایک حسن فروش فلسفی طوائف کے ان خطوط کا مجموعہ جن پر صحیفۂ اخلاق ناز کر سکتا ہے مصور اور جدید اضافہ کے ساتھ (عہ) ۱۲

لہو ترنگ۔ سکندر علی وجدی بی اے (عثمانیہ) ایچ سی ایس کا مجموعہ کلام آپکی فکر و نظر کے لئے ایک دعوت ہے۔ وجد لفظی شاعری کا قائل نہیں اسکے نغمات کے شعلوں میں خواب زندگی کی حقیقی تعبیریں ہیں۔ قیمت اول ۲ دوم عہ

مرمر اور خون۔ عزیز احمد صاحب کا مشہور نفسیاتی ناول جس میں بتایا گیا ہے کہ جذبات پرست امیرزادوں کے لئے مفلسی ایک کھلونا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عہ ۸

کارخانہ۔ ظریف فطرت فضل الرحمن صاحب کا مزاحیہ ڈرامہ سرمایہ داری، مزدور اور مزدوروں کی لیڈری پر عجیب انداز سے روشنی ڈالی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۲

پارلیمانی طرز حکومت (از منظور احسن ہاشمی) پارلیمانی طرز حکومت کا پورا نقشہ ۱۲

مشرق بعید۔ مشرقی ممالک کی سیاست۔ وہاں کے سیاسی تعلقات اور معاہدات
(از شاہد حسین رزاقی) ۱۲ر
مشاہیر کی بیویاں (مترجم) مغرب کے مشاہیر کی بیویوں کی زندگی ۱۲ر
دکن کی سیاسی تاریخ (از مولانا ابوالاعلیٰ مودودی) مولانا سیاسی تاریخ دکن پر ایسا عبور رکھتے ہیں کہ کسی دوسرے شخص کو سالہا سال کے مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے یہ کتاب مولانا کے وسیع مطالعہ کا حاصل ہے اول ہے۔ دوم ۱۲ر
تقاریر جناح۔ قائداعظم کی حالیہ تقاریر کا اردو ترجمہ ۸ر
ایک شاعر کا انجام ہندوستان کے نامور ادیب نیاز فتحپوری کا پہلا افسانہ جو عقل و دل کی سچی تصویر، حکمت و جنوں کا بہترین مرقع پیش کرتی ہے۔ یہ جو نچکاں ٹریجیڈی آب زر سے لکھنی چاہیے ۱۲ر
مکتوبات نیاز۔ دوسرا حصہ (از نیاز فتحپوری) ۸ر
کلیات حسرت۔ حسرت کے ساز دل سے نکلے ہوئے وہ دلفریب نغمات جنہیں سنکر حسن و عشق دونوں جھوم جاتے ہیں۔ ۸ر
تسنیم۔ ہندوستانی نوجوانوں کا معیاری کردار کیا ہو سکتا ہے اسے قیسی رامپوری کے اس تازہ ترین ناول میں ملاحظہ فرمائیے . . . . . . للعہ
دولت آصفیہ و حکومت برطانیہ دو صد سالہ تعلقات پر گہری نظر جس کا مطالعہ ملکی کے لئے ضروری ہے (از ابوالاعلیٰ مودودی) ۸ر
اسلام اور اشتراکیت اسلام اور اشتراکیت پر عالمانہ موازنہ . . . ۸ر
جنگ سنہ ۱۹۳۹ء اکیسویں صدی۔ موجودہ ہولناک جنگ کا پس منظر ۸ر
تاریخ اتحاد المسلمین۔ مسلمانان دکن کی بارہ سالہ جدوجہد کا مرقع ۸ر

لسان الامت۔ مختصر سوانح نواب بہادر یار جنگ بہادر
پاکستان اور ہندوستان۔ سب سے بڑی تحریک پر سب سے بڑی کتاب عبدالقدوس ہاشمی ایم اے
زیر طبع کتابیں
رقعات اردو اول و دوم مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اردو
انتقادیات اول و دوم جناب نیاز صاحب فتحپوری
حیات نامۂ اسلامیہ قائد ملت نواب بہادر یار جنگ بہادر
کلیات فانی۔ فانی بدایونی کا مکمل مجموعہ اضافہ
مضامین فرحت۔ اول، دوم، ہفتم
نئے افسانے۔ عزیز احمد صاحب کے بہترین افسانوں کا مجموعہ
ہمارے کارخانے۔ معاشیات کے بنیادی اصول
قرآنی مملکت۔ شاہد حسین صاحب رزاقی ایم اے
مشاہیر کی بیویاں (رفعت) مبارز الدین ایم اے
پرانے خدا۔ کرشن چندر
مسکراتے آنسو۔ بھارت چند کھنہ
لینن گراڈ تا سمرقند۔ عشرت صدیقی
مقالات عبدالحق مولوی عبدالحق صاحب
نئے پرانے از سہیل عظیم آبادی
عہد حاضر کے بڑے لوگ۔ از محمد مرزا دہلوی
افسانچے۔ از برج موہن دتاتریہ کیفی
نوک جھونک۔ از کوثر چاندپوری
سیاسی نظمیں۔ از نظر حیدرآبادی
نقش امروز۔ از علی اختر ایڈیٹر تنظیم
مشاہیر چین۔ میر عابد علی حقانی بی اے
ملنے کا پتہ
کتاب خانہ انجمن ترقی اردو (ہند)
عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن

ماہنامہ ہماری کتابیں رسالہ

یہ اردو میں اپنے طرز کا واحد علمی تحقیقی اور تنقیدی رسالہ ہے جو علی شبر صاحب حاتمی بی۔ یس۔ سی (عثمانیہ) کے زیر ادارت شائع ہو رہا ہے۔ اس رسالہ میں ہر ماہ عنوانات ذیل کے تحت بہترین مضامین شائع ہوتے ہیں۔

مقالات۔ مشاہیر مفکرین اردو اور بلند پایہ محققین ادب کے افکار جمیل اور تحقیقات انیق کے بیش بہا جواہر پارے

تذکرہ۔ محسنین اردو اور مشاہیر ادب کے ذاتی حالات زندگی اور علمی و ادبی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی روشنی میں مبسوط جائزہ

علمی استفسارات۔ قارئین کے تحقیق طلب استفسارات کے معلومات افزا اور بصیرت افروز جوابات نہایت دلکش رنگین اور پسندیدہ طرز بیان میں

تبصرہ۔ فن تنقید کے جدید اصولوں کے ساتھ زبان اردو کی بہترین تصانیف پر ماہرانہ انتقاد۔

تعارف۔ جدید ترین مطبوعات اردو کی فن وار تقسیم اور عنوان موضوع کا سرسری خاکہ

قابل مطالعہ کتاب۔ کتاب کا مختصر اور جامع خلاصہ

اچھے مضامین۔ مشہور رسائل کے منتخبہ مضامین کا تعارف اپنی افادیت کے لحاظ سے

علم کتب خانہ کتب خانوں کے اعداد المطالعوں سے متعلق ٹھوس اور فنی مضامین ملک کا ایک سو سے زائد مطبوعات کے نام مع مصنف ناشر قیمت سنہ اشاعت و فن وار تقسیم

سررشتہ تعلیمات نے اسکو مدارس کے لئے منظور کیا ہے

چندہ سالانہ دو روپے ۔ مہتمم عبد الماجد عثمانیہ منزل اردو گلی حیدرآباد دکن